حیاتِ فاطمۂ زہراء سلام اللہ علیہا

حیاتِ فاطمۂ زہراء سلام اللہ علیہا

تالیف:

ڈاکٹر سید جعفر شہیدی

ترجمہ:

سید حسنین عباس گردیزی

ناشر: الرضا (ع) پبلیکیشنز ۔ اسلام آباد

۳۰۱ ڈوسل آرکیڈ ۔ بلیو ایریا ۔ اسلام آباد

پوسٹ بکس نمبر: ۱۲۷۴۔ اسلام آباد ۔ پاکستان

۱

کتاب : حیات فاطمۂ زہراء سلام اللہ علیہا

تالیف: ڈاکٹر سید جعفر شہیدی

ترجمہ: سید حسنین عباس گردیزی

تاریخ اشاعت : ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ / جولائی ۲۰۰۱ء

تعداد: ایک ہزار

مطبع: ایلیا پرنٹنگ پریس ۔ صدر ۔ راولپنڈی ۔ پاکستان

ناشر: الرضا پبلیکیشنز ۔ اسلام آباد

پیشگفتار

ناشر گرامی این کتاب شریف از نگارنده درخواست تا در معرّفی نویسندهٔ کتاب، استاد دکتر سید جعفر شهیدی برای خوانندگان اردو زبان مطلبی بنویسم. اگرچه "معرِّف باید از معرَّف اجْلیٰ باشد"، امّا به سابقهٔ سالها تلمذّم در محضر استاد و نیز سالها افتخار همکاریم با استاد در مؤسّسه لغت نامهٔ دهخدا و نیز همسفریم با استاد به خارج از کشور در جمع بعضی همکاران دانشگاهی و همچنین ادای وظیفهٔ شاگردی و اخلاص وارادتم، این مهّم را پذیرفتم. امید که استاد لغزشها وکاستیهایم را بر من ببخشایند و البته دریغ می‌بود اگر به یاد "حق صحبت سالها"، "حالی از آن خوش حالها" گفته نمی‌آمد و پیش از آنکه فقط به ذکر آثار علمی استاد بپردازم، اشارتی به بعضی ویژگیهای کم مانند استاد نداشته باشم.

استاد مدرّسی است محقّق باکلاسهایی پُربار که "قسم اکبر و حظّ اوفر" نصیب دانش پژوهانش می‌گردد. کلاس استاد به رفع دشواریهای اصلی و کلیدی متون درسی اختصاص دارد و تقریرات میان درسی استاد که به‌مناسبتْ بیان می‌گردد، بسیار سودمند می‌افتد.

حد کمّی درس نیز در هر جلسه معین بود و این دیگر وظیفه طالبان علم بود که در فاصلهٔ معمولاً یک هفته سهمیهٔ تعین شده از هر متن را با دقتَ بخوانند و آنچه برایشان مبهم می‌نماید در جلسهٔ بعدی درس بپرسند که این خود از بسیاری وقت‌گذرانیهای بی‌حاصل بعضی کلاسها می‌کاهد. از ویژگیهای درخور توّجه استاد که همهٔ مدرّسان کلاسهای سطوح و مقاطع تحصیلی بالا بی‌شک به آن مقرّند، مطالعهٔ پیشاپیش مدُرِّس قبل از شروع درس است. حتی اگر سالها آن را تدریس کرده باشد. به یاد دارم در یکی از روزهای درس که جمع دانشجویان برای حضور در کلاس درس

استاد که آن روزها در ساختمانی در شمال میدان بهارستان و جنب سازمان برنامهٔ آن روز تشکیل می‌گردید، حاضر شده بودند و استاد هم حسب معمول زودتر از دانشجویان به مَدرَس آمده بود، اعلان فرمودند امروز کلاس درس تشکیل نمی‌گردد و سپس با صدای رسافرمودند:"بنده دیشب درسم را مطالعه نکرده‌ام".

تأثیر این بیان استاد که البته همهٔ دانشجویان آن را حمل بر تواضع خاصّ و خفض جناح استاد کردند ، چنان تأثیری در دانشجویان گذاشت که مطمئنّم آنان که تقریباً همه خود مدرّس نیز بودند، دیگر بدون مطالعهٔ قبلی به کلاس نرفتند.

توفیق بیشتری نصیب نگارنده گردید تا از سال ۱۳۶۰ شمسی به بعد در حاشیهٔ تدریس و کارهای دانشگاهی افتخار همکاری با گروه مؤلفان لغت نامهٔ فارسی را در مؤسسه لغت نامهٔ دهخدا یافتم و روزهایی را که طبق سنّت سَنیّهٔ مؤسسهٔ لغت نامه جلسهٔ "مقابله" در جمع یاران لغوی تشکیل می‌گردید، به صورتی دیگر امکان استفاده از محضر استاد و اظهار نظرهای اجتهادی‌اش بهرهٔ مُخلص نیز می‌گردید که اجتهاد و شمّ زبانی استاد در هر دو زبان فارسی و عربی برای منْ بنده بسیار مغتنم بود و داوریهای عالمانه‌اش مشکل گشای راه مؤلفان لغت نامه فارسی و البتّه پژوهشی که با آن ظرافت و دقتِ نظر مؤلفان ارجمند مؤسسهٔ لغت نامهٔ دهخدا در تألیف لغت نامهٔ فارسی انجام می‌گرفت، نیازمند ارشاد پیران طریقتی همچون دکتر شهیدی نیز بود.

آنچه بر روی هم از حدود بیست سال انس و الفت با استاد در ذهنم نقش بسته تجسمّی است از صفات عالی انسانی از شخصیتی کم‌نظیر و متعالی و محقّقی گرانمایه و ژرف اندیش با روشی عالمانه در تحقیق و پایگاهی کم‌بدیل در تدریس و مجتهدی مسلّم در علوم اسلامی و تاریخ اسلام همراه با خُلقی کریمانه در رفتارْ و منْ بنده که این روزها دیگر

توفیق مصاحبت استاد را ندارم، در این مورد از راهی دور با مولانا هم آواز می‌گردم که:

لا تکلّفنی فَاِنّی فِی‌الفَناء   کَلَّت اَفهامی فلااُحصی‌ثَناء
کُلُّ شَیء قالَهُ غیرُالمُفیق   اِنْ تَکَلَّف اَوتَصَلَّف، لایَلیق

اشارتی به زندگینامهٔ استاد:

استاد در سال ۱۳۰۰ شمسی در شهر بروجرد تولد یافت، آموزشهای مقدماتی و ادبیات عربی و علوم دینی و فقه و اصول را همانجا آموخت، در سال ۱۳۲۰ عازم نجف اشرف شد و از محضر عالمان بزرگ آن زمان آقایان: حاج سید یحی یزدی، حاج میرزا حسن یزدی، حاج میرزا هاشم آملی و سپس آیةالله خوئی توشه‌ها اندوخت و پس از هفت سال اقامت در نجف اشرف، بزرگترین دانشگاه علوم اسلامی آن زمان در سال ۱۳۲۷ به تهران بازگشت. استاد در سال ۱۳۲۸ کار خود را با شادروان استاد دهخدا در لغت نامهٔ آغاز کرد و به سال ۱۳۳۰ همزمان، به تدریس در دبیرستانها نیز اشتغال ورزید. در سال ۱۳۳۲ از دانشکدهٔ معقول و منقول و در سال ۱۳۳۵ از دانشکدهٔ ادبیات دانشگاه تهران در زبان و ادب فارسی درجهٔ لیسانس گرفت در سال ۱۳۴۰ دورهٔ دکتری زبان و ادبیات آن دانشگاه را به پایان برد و از سال ۱۳۴۲ معاونت مؤسسه لغت نامهٔ و از سال ۱۳۴۶ ریاست آنجا به او واگذار گردید. و از همین سال همکاری با شادروان دکتر معین را نیز برای تهیه فرهنگ فارسی معین آغاز کرد. استاد به دعوت دانشگاههای جهان برای شرکت در کنفرانسها و مجامع علمی به کشورهای مختلف و از جمله: اردن هاشمی، مصر، الجزایر، عراق، چین، امریکا سفر کرده و از دانشگاه پکن عنوان استادی افتخاری را دریافت کرده‌است.

بعضی تألیفات استاد دکتر شهیدی عبارت است از:

* جنایات تاریخ (۳ مجلد) کتاب فروشی حافظ، تهران، ۱۳۲۷ و ۱۳۲۹

* چراغ روشن در دنیای تاریک ، انتشارات علمی، تهران ۱۳۳۵

* در راه خانهٔ خدا، دانش نو، تهران ۱۳۵٦

* پس از پنجاه سال ، امیرکبیر ۱۳۵۸ ، چاپ شانزدهم، دفتر نشرفرهنگ اسلامی ۱۳۷۲

* شرح لغات و مشکلات دیوان انوری، چاپ اوّل ، انجمن آثار ملّی۱۳۵۸ چاپ دوّم انتشارات علمی و فرهنگی ۱۳٦۲

* تاریخ تحلیلی اسلام، تا پایان امویان، مرکز نشر دانشگاهی، تهران۱۳٦۲

* زندگانی حضرت فاطمه (ع) چاپ اوّل ، دفتر نشر فرهنگ اسلامی، ۱۳٦۰چاپ‌هجدهم، دفتر نشرفرهنگ‌اسلامی ۱۳۷۳

* عرشیان، نشر مشعر، قم، ۱۳۷۱

* شرح مثنوی شریف، جلد چهارم (دنبالهٔ کار مرحوم استاد فروزانفر)،انتشارات علمی و فرهنگی، تهران ۱۳۷۳

* علی از زبان علی، دفتر نشر، تهران ، ۱۳۷٦

* تصحیح کتاب درّه نادره که از جملهٔ متون مصنوع و دشوار ادب فارسی بشمار می‌رود، نمودار نهایت دقت و ظرافت و اجتهاد استاد در زبان و ادب فارسی و عربی است.

برای استاد دکتر شهیدی تندرستی و طول عمر و بازهم توفیق بیش از پیش آرزو می‌کند.

دکتر رضا مصطفوی سبزواری

(استاد دانشگاه و رایزن فرهنگی ج.ا.ا ـ اسلام‌آباد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ (کہف: ۱۳)
ہم ان کا قصہ صحیح طور پر تمہارے لیے بیان کرتے ہیں

اس کتاب کا موضوع دختر رسولؐ یعنی اسلام کی عظیم ترین خاتون فاطمہ یا فاطمة الزهراء(س) کی زندگی کا جائزہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے قاری کو یہ اندازہ ہوگا کہ جو کچھ ان چند اوراق میں سمو دیا گیا ہے وہ صرف ایک شخصی زندگی کی روداد نہیں ہے بلکہ اس میں کئی سبق آموز اور عبرت آمیز پہلو موجود ہیں۔ اگرچہ تاریخی اہمیت کی حامل شخصیات کے حالات زندگی خود سبق آموز ہوتے ہیں۔ جو کچھ آپ ان صفحات میں پڑھیں گے وہ ان عجیب واقعات کا تجزیہ و تحلیل ہے، جو ہمارے زمانے سے صدیوں پہلے رونما ہوئے اگر ہم ان واقعات کے کرداروں کو ان واقعات سے علیحدہ کر دیں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ واقعات تاریخ کے ادوار میں بلکہ ہمارے زمانے میں بھی دنیا کے کسی گوشہ میں وقوع پذیر ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ جن حوادث و واقعات کی ہم بات کریں گے، اگرچہ زمان و مکان کے لحاظ سے ہم سے بہت دور ہیں لیکن ان کے باقی ماندہ اثرات نہ صرف پرانے نہیں ہوئے بلکہ اپنی تازگی کو اسی طرح برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کتاب پڑھنے کے بعد دیکھیں گے کہ جو ہم کہہ رہے ہیں وہ مبالغہ اور فضول گوئی نہیں ہے۔

پیغمبرؐ اسلام کی رحلت کے بعد مدینہ (دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے مرکز) میں دو مخالف تحریکیں وجود میں آئیں۔

☆ ایک تحریک، جس کی یہ کوشش تھی کہ اسلامی معاشرے کو چلانے کے لئے سیرت پیغمبرؐ پر عمل کیا جائے بالفاظ دیگر یہ سنت رسولؐ کی نگہبانی اور حفاظت کرنا چاہتی تھی۔

☆ دوسری تحریک اپنے ظن و گمان یا اجتہاد کی بناء پر زمانے کی ترقی کے لحاظ سے سیاسی نظام اور کبھی نظام قانون میں تجدید و اصلاح کو ضروری سمجھتی تھی اور یہ نظریہ رکھتی تھی کہ سنت کو اہمیت دینے والے حقیقت کو کماحقہ نہیں سمجھتے۔ وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس تبدیلی کو مسلمانوں

☆ تاکہ دوسرے کی بات کو اعتراض سے خالی نہ جانے اور اسے قبول کرنے سے پردہ میں رہے (قبول نہ کرے)۔

☆ تاکہ یہ بہتر فرقے قیامت کے دن تک دنیا میں باقی رہیں۔

آخر کار یہ سب برج منجنیق (سنگ انداز) کے ذریعہ الٹ جائیں گے اور تمام حرکات ایک نقطے پر پہنچ جائیں گی اور سنت شکن اور سنت کی پیروی کرنے والے حق تعالی کی رحمت و مغفرت کے سائے میں مل کر زندگی گزاریں گے۔ اس کام کے لئے میں اپنے آپ کو اس کا اہل پاتا ہوں نہ میرے کاندھوں پر موجود ذمہ داری مجھے ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ وہ لوگ جو تاریخ میں جستجو اور تحقیق کا ذمہ اپنے سر لیتے ہیں وہ اسناد کے مطالعہ، مختلف قسم کے بیانات کی چھان بین اور روایات کے موازنہ اور جرح و تعدیل کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتے۔ واقعہ نگار ناچار جو کچھ واقع ہوا ہے، اسے لکھ سکتا ہے اور جس حد تک اسناد و قرائن کے توسط سے واقعات کے بارے میں اپنی رائے قائم کرسکتا ہے، فیصلہ کرتا ہے۔ لہذا اسے چاہیے کہ اگر اس میں انحرافی نکات موجود ہیں تو ان کی نشاندہی کرے۔ اس طرح حقیقت آشکار ہو جائے گی۔ لیکن وہ ان اسناد و روایات کو کس طرح قبول کرے؟ کس طرح ان کی درجہ بندی کرے اور کس معیار پر انہیں پرکھے؟ یہ بذات خود ایک انتہائی کٹھن کام ہے۔

جب یہ تاریخی واقعہ رونما ہوا تو اس کے دوسو سال یا کچھ کم عرصے کے بعد اسے مؤرخین اور محدثین نے اپنی کتابوں میں محفوظ اور تحریر کیا اور یوں اسے فراموشی، عبارت میں تصرف اور دیگر عارضوں کے نقصان سے بچالیا۔ ان دو صدیوں میں مضبوط اور طاقتور سیاسی مکاتب فکر ایک دوسرے کے مدمقابل رہے، جن کے سایہ یا تقلید میں لوگوں کے کئی گروپ تھے یا ایک گروہ نے دوسرے کی جگہ لے لی۔ وہ افراد جو صدر اسلام سے لے کر تیسری صدی ہجری کے اختتام تک کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس دوران حدیث گھڑنا، اس میں تخلیط اور تدلیس، ملاوٹ اور فریب، حدیث کو مٹانا، حدیث کی اپنے مفادات کے حق میں اور دوسرے کے دعویٰ کو باطل کرنے کے لئے تفسیر اور تاویل رائج رہے ہیں۔

سیاست اموی، خوارج، عباسی اور ان کے مدمقابل پارٹیوں سے وابستہ افراد، وہ نو مسلم جو خدا کی وحدانیت اور محمدؐ کی رسالت کی گواہی کو اپنی جان کی حفاظت کا وسیلہ قرار دیتے اور اندر ہی اندر دین کی جڑوں کو کھوکھلا کرتے اور مختلف مکاتب فکر کے استاد جو اپنے حلقہ درس میں فقط مخالف کی بات کو باطل ثابت کرتے، خدا جانتا ہے اس مدت میں ان سب نے تاریخی اسناد کا کیا حلیہ بگاڑا ہے۔ سیاسی اسناد کا بھی یہی حال ہے۔

تاریخی داستانوں، کسی شخصیت کی تاریخ ولادت یا تاریخ وفات بیان کرنے والی روایات اور

اس طرح کے دیگر بیانات کا سارا دارومدار چونکہ راویوں کے حافظے پر تھا اس لئے ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی واقعہ ایک طرح سے نقل ہوا ہو۔ اس صورت حال میں کیا کرنا چاہئے؟ مصنف نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ اپنے بیانات کو درجہ اول یا درجہ اول کے نزدیک ترین اسناد اور روایات کی بنیاد پر استوار اور منظم کرے، کیونکہ ان روایات میں تحریف کا احتمال کمتر ہے۔(۱) نیز مصنف نے حتی الامکان اپنے بیانات کو خارجی قرائن سے بھی تطبیق دی ہے اور بالآخر مختلف اقوال میں سے ان اقوال کو قبول کیا ہے جن کو سب نے یا اکثریت نے قبول کیا ہے یا وہ ان کی کسی نہ کسی طرح سے تائید کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ایسی حقیقت ہے جو واقعیت کے مطابق ہے کیونکہ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

---

(۱) اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دختر رسولؑ کے بارے میں دوسروں کی تحریریں مصنف کی نگاہ سے دور رہی ہیں۔ چنانچہ کتاب کی فہرست مصادر میں آپ ملاحظہ کریں گے جو کچھ اس کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ ان میں سے بیشتر پر مصنف کی نظر رہی ہے۔

مَنْ عالَ جارِيَتَيْنِ حَتّٰی تُدرِکا دَخَلْتُ اَنَا وَ
هُوَالْجَنَّةَ کَهاتَينِ

(کنزل العمال، کتاب نکاح، باب حقوق دختران)

جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں، میں اور وہ، ان دونوں (ملی ہوئی انگلیوں کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے) کی طرح جنت میں داخل ہوں گے۔

محترم قارئین! اس وقت جب آپ اس کتاب کے مطالعے میں مشغول ہیں، کیا آپ نے عرب کی تاریخ یا جغرافیہ کا مطالعہ کیا ہے؟ عرب سے میری مراد فقط شہر مکہ، مدینہ اور بحیرہ احمر کے ساحل کی آبادی نہیں ہے اور نہ ہی میرا مقصود عرب کا سرسبز و شاداب اور خوشحال علاقہ یمن ہے۔ بلکہ عرب سے میری مراد وہ وسیع و عریض سرزمین ہے جو ایک طرف وادی حضرموت اور صحرائے نفود کے درمیان واقع ہے اور دوسری طرف وادی دَواسِر اور دَهْناء کے صحراؤں سے گھری ہوئی ہے۔ اس جزیرہ نمائے عرب کا زیادہ تر حصہ یعنی بیس لاکھ ساٹھ ہزار کلومیٹر، اسی سرزمین پر مشتمل ہے اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی تقریباً اپنی اصلی حالت پر باقی ہے۔

یہ عجیب خطہ ارضی انسان کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ ایک طرف آباد دنیا سے کٹے ہوئے اس کے خشک اور باشندوں سے خالی بیابان اور دوسری طرف طرف آفتاب کی مسلسل تپش سے جلے ہوئے اور قدیم زمانے کے آتش فشانوں کے یادگار پہاڑوں کا سلسلہ اور ان کی ترکیب سے ایک عجیب اور ساتھ ہی ایک پر کشش مجموعہ ارضی معرض وجود میں آیا ہے۔

مہم جو سیاح سرما میں یا بہار کے آغاز میں اس سرزمین میں داخل ہو تو وہ میلوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پھر کہیں ایسے مقام پر پہنچتا ہے، جہاں ایک دو دن پہلے کی بارش کا پانی کسی گڑھے میں جمع ہوا ہو اور ممکن ہے پانی کے اس تالاب کے کنارے ایک خاندان، ایک دو اونٹوں کے ساتھ آباد ہو. یہ اس صحرا کی مشکلات، خصوصاً پانی کی قلت کے مقابلے میں سخت جان انسان کا نمونہ ہیں۔

اس بیابان کا انسان پژمردہ، لاغر، سیاہ رنگ، سخت مزاج اور پر حوصلہ ہے۔ اسے بدوی اور رائج طور پر بدو کہا جاتا ہے اور انسان سے بھی زیادہ سخت جان اس صحرا کا بار بردار جانور اونٹ ہے۔

صرف یہ دو جاندار صحرا کی سخت اور صبر آزما مشکلات سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔ اس صحرا میں اگر پودوں کا وجود ہے تو وہ خاردار جھاڑیوں کی شکل میں ہے۔ رات کے وقت جب ہوا ان شاخوں سے گزرتی ہے تو ایک ہولناک آواز پیدا ہوتی ہے۔ صحرائی لوگوں کے وہم و خیال کے مطابق ان درختوں کے نیچے دیو رہتے ہیں اور یہ آوازیں ان کے بچوں کی ہوتی ہیں۔ اس لئے ان خاردار جھاڑیوں کو وہ ''ام غیلان'' کہتے ہیں جو مخفف ہو کر ''مغیلان'' بن گیا ہے۔ اس سرزمین کا درخت کھجور ہے جو نخلستانوں اور تالابوں کے کناروں پر پایا جاتا ہے اور درختوں میں پانی کی کمی کا مقابلہ کرنے میں پہلے نمبر پر ہے۔ ایسے مشکل ترین حالات میں جفاکش انسانوں کی ثابت قدمی قدرتی رکاوٹوں کے خلاف بقاء زندگی کے لئے ان کی جہد مسلسل کی علامت ہے۔ جس چیز کے حصول کے لئے زندہ رہنے کی خاطر انہیں کوشش کرنا پڑتی ہے وہ انسانوں اور حیوانوں کا سرمایہ حیات ''پانی'' ہے۔

پانی کی تلاش میں ہر روز یا چند روز کے بعد بدو کو اپنا رخت سفر باندھنا پڑتا ہے۔ اسے اپنے سامان کو، جس میں چربی کی چند ٹکیاں اور وہ بھی اونٹ کی اون سے مخلوط اور کھجور کے چند دانوں کے سوا کچھ نہیں۔ اپنے باربردار جانور کی پشت پر لاد کر اور معمولاً اپنی بیوی اور کبھی کبھار اپنے چھوٹے بچے کو سامان کے اوپر بٹھا کر ریت کے تپتے ہوئے ٹیلوں کو سر کرنا پڑتا ہے اور پانی کے ذخیرے تک پہنچنے کے لئے اسے سلگتے صحراؤں اور گرم چٹانوں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔

یہ پانی بھی کیسا؟ سیاہ رنگ، بدبودار، کیڑے مکوڑوں اور دوسرے رینگنے والے جانوروں سے پر، جو اس بدو سے پہلے وہاں پہنچے ہوئے ہوتے ہیں. لیکن یہ خستہ حال مسافر زندگی کے اس سہارے کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا سامان اتارتا ہے اور وہاں ڈیرہ لگا لیتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوتی ہے۔ اسی دوران اسی کی طرح کا ایک اور بیچارہ انسان بھی وہاں آن پہنچتا ہے۔ اس بدبخت انسان کے تلوے پھٹے ہوئے اور جلے ہوئے ماتھے پر پڑی ہوئی سلوٹیں یہ بتا رہی ہیں کہ یہ بھی اسی چیز کی تلاش میں سرگرداں ہے جسے پہلے مسافر نے پالیا ہے اور وہ ہے پانی۔

صدیوں پر محیط تمام مدت میں اس سنگدل صحرا نے اپنی دھرتی کے سپوتوں کو صرف ایک سبق سکھایا ہے کہ ''مارو تا کہ زندہ رہو''۔ اسی اصول کے پیش نظر مذکورہ گھاٹ پر لڑائی شروع ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر میں بیچارے انسان کے خون سے زمین رنگین ہو جاتی ہے۔ وہ انسان جو حکم جبلت کے تحت زندہ رہنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے طاقتور حریف کے مقابلے میں شکست کھا گیا اور جان کی بازی ہار گیا۔ ابھی اس کے تشنہ لب، اس کی تھکی ماندی سواری اور اس سے وابستہ ایک دو بے سہارا جانیں پانی سے سیراب بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ بے رحم، سنگدل اور طاقتور دشمن نے دانت دکھائے

اور جس پر اس کی، اس کے اونٹ اور بیوی بچوں کی زندگی کا دارومدار تھا، اسے چھیننے کے لیے اس پر حملہ کردیا۔ افسوس کہ یہ دشمن پہلے دشمن سے زیادہ طاقتور ہے جس کے قتل سے وہ ابھی فارغ ہوا ہے۔ یہ ایسا دشمن ہے جسے یہ کبھی شکست نہیں دے سکتا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ میں گرم پانی کی سطح دن بدن نیچے ہوتے جارہی ہے اور بخارات مسلسل ہوا میں اٹھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس تالاب کی تہہ میں گیلی مٹی اور چند نیم جان کیڑوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ ہاں سورج نے اپنا کام کر دکھایا ہے، اب یہاں سے کسی دوسری جگہ کوچ کرنا چاہیے۔

''اٹھو اب کوچ کرو'' ایک ایسا گیت ہے جسے بدو، اس مشقت بھری پوری زندگی میں گاتا ہے۔ اس کی ہر صبح کسی (نئی) جگہ پر اور ہر رات راہ گزر پر ہوتی ہے۔

اسی افرتفری اور سامان اتارنے اور چڑھانے کے ہنگامے میں اچانک اس کے کانوں سے ہلکی سی آواز ٹکراتی ہے۔ یہ کونسی آواز ہے؟ یہ اس نومولود کے رونے کی آواز ہے جس نے مصائب و آلام کی وادیٔ حیات میں ابھی قدم رکھا ہے۔

ابھی اس کی بیوی دردزہ سے فارغ ہوئی ہے اور اس بے نوا کنبے میں ایک لڑکی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ آہ کتنی بڑی مصیبت! وہ ہمیشہ ایسے وقت سے پریشان اور خوفزدہ تھا.

لڑکی! بیٹی! یہ ذلت و رسوائی کا سامان بچی میرے کس کام کی؟

میری بیوی نے لڑکا کیوں نہ جنا؟ اگر لڑکا ہوتا تو وہ ایک نعمت تھا۔ بچپن میں وہ اونٹوں کی نگہبانی کرتا اور جوان ہو کر میرے شانہ بشانہ دشمنوں سے لڑتا۔ لیکن لڑکی تو پاؤں کی زنجیر ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔ یعنی ذلت و رسوائی کا باعث ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اسے یاد ہے کہ چند دن پہلے اس کی فلاں شخص سے لڑائی ہوئی تھی جس پر اس کی بیٹی کو اس نے اسیر کر لیا تھا اور اس کے ماں باپ اور قبیلے کے ماتھے پر بدنامی اور ذلت کا داغ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ ایک دن اس کے سر بھی وہی بلا نازل ہو گی۔

نہیں! ابھی دیر نہیں ہوئی۔ اس کا حل سوچنا چاہیے اور واقعہ سے پہلے اس کا تدارک کرنا چاہیے۔ اس لڑکی کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ مبادا شرمساری اور رسوائی کا باعث بنے۔ لہذا اسے زندہ در گور کر دینا بہتر ہے۔(۱)

---

(۱) وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (نحل ۵۸ ـ ۵۹) اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو مارے غصے کے اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس بری خبر کی وجہ سے وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کیا اسے ذلت کے ساتھ زندہ رہنے دے یا اسے زیر خاک دبا دے؟ دیکھو! کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کر رہے ہیں

صرف غربت و افلاس اور ذلت و رسوائی کا خوف اس قبیح فعل کے ارتکاب کا سبب نہ تھا بلکہ کبھی خرافاتی عقائد اور باطل اوہام بھی دختر کشی کا موجب بنتے تھے۔ چنانچہ اگر نیلی آنکھوں والی یا سیاہ رنگ والی لڑکی اس کے گھر میں پیدا ہوتی تو اسے وہ فال بد گردانتے تھے۔ موجودہ صدی کے چند عرب ادیب اور مورخین اس غیر انسانی عمل کی تاویل انسانی جذبات اور احساسات کے ذریعے سے کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے بقول چونکہ باپ کو اپنی اس جنس کی اولاد سے شدید محبت ہوتی ہے، لہذا وہ اپنی لڑکیوں کو اس خطرے کے پیش نظر زندہ در گور کر دیتا کہ کہیں ان کی عزت و ناموس پر حرف نہ آئے۔(۱) یہ ایک بے بنیاد توجیہ ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ان افراد کی سخت ملامت اور سرزنش کرتا ہے کہ یہ لوگ کیوں غربت اور تنگدستی کے خوف سے معصوم جان کو قتل کرتے ہیں۔(۲)

قرآن ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ (تکویر ۸-۹)

اس دن جب اس زندہ در گور لڑکی کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اسے کس جرم میں قتل کیا گیا؟

ہاں! اس غیر انسانی فعل کا عامل کچھ بھی ہو، اس کی برائی اور قباحت میں کمی نہیں کرتا۔ وہ لوگ اس قسم کی سرزمین میں اس قسم کی رسم کے حامل تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک اور وحشیانہ طرز عمل اختیار کرتے تھے۔

یہ تھا ظہور اسلام سے پہلے صحرا نشینوں کا حال۔ لیکن جزیرۃ العرب کے شہروں میں بسنے والوں کی حالت بھی مشکلات اور سختیوں کے اعتبار سے ان سے کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ البتہ ان کی لڑائیاں اور طرح کی ہوتی تھیں۔ مالدار، سرمایہ دار اور وڈیروں کی یہ خواہش تھی کہ غریب اور مفلس لوگ انا کے لئے محنت و مشقت کریں اور اپنی جان ماریں، تاکہ وہ عیش و عشرت اور چین و سکون سے رہیں، ان کے مال و دولت اور خزانوں میں اضافہ ہوتا رہے اور ان بے چاروں کی کمریں قرضوں اور غربت و ناداری کے بوجھ تلے مزید جھک جائیں۔ ظاہر ہے کہ جغرافیائی لحاظ سے مذکورہ خصوصیات کی حامل ہونے اور اپنے ساکنین کے اعتبار سے اس قسم کے افراد کی وجہ سے، اس سرزمین، کی علم الانساب کے ماہرین اور ماہرین سماجیات کی نگاہ میں کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ اگر ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں تاریخ کا عظیم معجزہ رونما نہ ہوتا اور اس تاریک بیابان میں نور کا چشمہ نہ پھوٹتا تو بے شک آج بہت

---

(۱) بلوغ الادب ج ۳ ص ۴۲-۵۳

(۲) وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (اسراء: ۳۱) اور تم اپنی اولاد کو تنگدستی کے خوف سے قتل نہ کیا کرو۔ ہم انہیں رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ ان کا قتل یقیناً بہت بڑا گناہ ہے۔

ہی کم لوگ ہوتے جنہیں صحرائے عربستان کے نام کا پتہ ہوتا اور یہ کہ یہ صحرا ایشیا کے جنوب مغربی کنارے پر واقع ہے۔ اس کی جغرافیائی اور تاریخی صورت حال اور دیگر خصوصیات کے بارے میں کسی کو بھلا کیا خبر ہوتی۔ یہ کہاں ممکن تھا کہ ایک مہم جو سیاح جزیرۃ العرب کے پہاڑی سلسلہ سینا کو سر کرتا اور نجد کے خشک بیابانوں کو عبور کرتے ہوئے، تہامہ کے دروں کو پار کر کے اپنے آپ کو ''نفود'' یا ''الربع الخالی'' کے وسیع و عریض صحرا تک پہنچاتا اور صحرا میں چلنے والے طوفان کی زد میں آ کر ریت میں دب کر ابدی نیند سو جاتا اور اگر دسیوں لوگوں میں سے کوئی ایک بچ جاتا تو دوسروں کو اپنے مشاہدات بتاتا۔

لیکن تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ اس سر زمین سے ایسی صدا بلند ہوئی جو ابتداء میں بحیرہ احمر کے کنارے چھوٹے سے شہر سے اٹھی اور پھر اس شہر سے پانچ سو کلومیٹر دور ایک نخلستان میں پہنچی، وہاں سے اس بحیرہ کی مشرقی جانب اور پھر تمام جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی۔ اس کے بعد یہ آواز ایران میں پہنچی۔ پھر مصر، براعظم افریقہ اور آخر کار پورے عالم کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پوری دنیا میں گونجنے والی اس آواز نے صحرانشینوں کو یہ درس دیا کہ اے عرب کے صحرا نوردو! جو سبق تم نے اس صحرا سے سیکھا ہے وہ غلط ہے۔ صحرا نے تمہیں غلط سبق پڑھایا۔ وہ ایک برا استاد ہے۔ تمہیں خدا سے سبق سیکھنا چاہیے۔ تمہارا شعار وہ نہیں جس کی تمہیں عادت پڑ چکی ہے۔ تمہیں قتل وغارت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ تم تو اللہ کے خلیفہ ہو اور اللہ نور، محبت، لطف، رحمت اور مہربانی ہے۔ تم دوسروں کے لیے زندہ ہو اور تم سب ایک دوسرے کے ساتھ خدا کی خاطر ہو۔

تم اس سبق کو فراموش کر دو جو تم نے سینہ بہ سینہ حاصل کیا ہے یا اپنے آباؤ اجداد کی تقلید سے سیکھا ہے۔ وہ کوئی اچھے معلم نہ تھے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سبق تقلید سے نہیں سیکھنا چاہیے۔ لڑکی بھی لڑکے کی مانند ہے۔ یہ دونوں تمہارے کام آئیں گے۔ ہر دو خدا کی نعمتیں ہیں۔ خدا کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ایک کو دوسرے پر برتری نہیں دینی چاہیے۔

اے لوگو! تم اپنی لڑکیوں کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے ہو؟ تم کیوں انہیں فضول اور بے وقعت سمجھتے ہو؟ تمہیں کس نے جنا اور پالا پوسا ہے؟ کیا تم انہی لڑکیوں کی گود میں پروان نہیں چڑھے ہو، جو اب تمہاری مائیں ہیں؟ جان لو کہ جب کسی گھر میں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو ان کے پاس بھیجتا ہے کہ اے گھر والو تم پر سلام ہو۔ اس کے بعد اس لڑکی پر اپنے پروں کو اوڑھا دیتے ہیں اور اپنے ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے اور کہتے ہیں کہ جو کوئی ان کی پرورش اور نگرانی کا ذمہ لے گا اس کی قیامت میں مدد کی جائے گی۔ (۱) جس کی لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ در گور

---

(۱) کنزل العمال، کتاب النکاح، از اوسط طبرانی

نہ کرے، لڑکی کو ذلیل وخوار نہ سمجھے اور لڑکے کو اس پر ترجیح نہ دے تو خدا اسے بہشت میں لے جائے گا۔(۱)

یہ آسمانی تعلیمات کبھی قرآنی آیات کی شکل میں اور کبھی حدیث کی زبان میں ان دیر فہم اور بوجھل کانوں والے افراد پر پڑھی جاتی رہیں، لیکن ان تعلیمات کا عملی نمونہ بھی ہمراہ ہونا چاہیے تا کہ ان کا اثر زیادہ ہو. اس عملی تربیت کا اعلیٰ نمونہ رسول خدا کی بیٹی سیدہ فاطمۃ الزہرا(س) ہیں.

یہ حیران کن بات ہے کہ رسول اللہؐ کی پہلی زوجہ حضرت خدیجہ (س) سے اولاد میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہے اور پھر لڑکے زندہ نہ رہے اور بچپن میں ہی فوت ہو گئے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ بدوی زندگی اور قبائلی نظام میں لڑکا باپ کے گھر کے چراغ کو روشن کرتا ہے اور اگر کسی کے ہاں لڑکا نہ ہو تو اس کا نام مٹ جاتا ہے۔ ایسے شخص کو وہ ''ابتر،، کہتے تھے اور مکے کے کوتاہ فکر افراد یہی بات حضرت محمدؐ کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ ابتر ہیں۔ اس لئے دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کا نام و نشان ختم ہو جائے گا، کیونکہ ان کا کوئی بیٹا نہیں جو ان کا وارث بنے۔ آپؐ کے بارے میں دل کے اندھے قریش کا یہ باطل نظریہ تھا۔

لیکن مشیت الٰہی کے عین مطابق اور ان تاریک دل اور کج فہم و فکر کافروں کی سوچ کے برعکس، رسول اللہؐ کی ایک بیٹی باقی بچیں اور اس ایک بیٹی نے انفرادی زندگی اور اجتماعی و معاشرتی زندگی میں اپنے طرز عمل اور کردار اور رفتار سے آپؐ کی باتوں کو سچ کر دکھایا اور قرآن کے اسرار و رموز کو ان خود خواہوں پر اس طرح واضح کیا کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَالْاَبْتَر (کوثر:۳) ''بے شک تیرا دشمن ہی ابتر ہے''۔ اے محمدؐ آپ کا نام گرامی زندہ وجاوید رہے گا۔ تجھے طعنے دینے والے خود گمنامی کے طوق گلے میں ڈالیں گے۔ وہ گمنامی کی زندگی گزاریں گے اور گمنامی کی موت مریں گے۔

اسی طرح جناب فاطمہ (س) کے بیٹے اور ان کی اولاد، مذکورہ بشارت الٰہی کا ایک راز قرار پائی۔ مولانا رومی نے کیا خوب کہا ہے:

مصطفی را وعده داد الطاف حق　　گربمیری تو نمیرد این سبق
رونقت را روز روز افزون کنم　　نام تو برزر و بر نقره زنم
منبر و محراب سازم بهر تو!　　در محبت قهر من شد قهر تو(۲)

☆ محمد مصطفیٰ (ص) سے الطاف الٰہی نے یہ وعدہ کیا ہے کہ آپ کی رحلت کے بعد یہ اسلام کا سبق ختم نہیں ہو گا۔

---

(۱) کنزل العمال، کتاب النکاح، از مسند ابو داؤد

(۲) مثنوی مولانا رومی، طبع نیکلسن دفتر سوم ص ۶۸

☆ آپؑ کی بزم کی رونق کو میں روز افزوں کر دوں گا۔ آپؑ کا نام سونے اور چاندی کے سکوں پر لگواؤں گا۔ (آپ کے نام کا سکہ چلے گا)۔

☆ منبر و محراب آپ کے لئے بناؤں گا اس میں میری ناراضگی آپ کی ناراضگی بن جائے گی.

تقدیر خداوندی یہ تھی کہ پیغمبر اسلامؐ اپنی تمام پدری محبت و شفقت سیدہ فاطمہ (س) کے نام کر دیں تا کہ اس عملی تربیت کے ذریعہ وہ خود خواہ لوگ جان لیں کہ بیٹیوں کو بھی بیٹوں کی طرح اہمیت دینی چاہیے۔ کیا ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ رسولؐ کی تین قسم کی سنت ہے جس کی پیروی تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔ اس کی ایک قسم آنحضرتؐ کا طرز عمل ہے۔ پس آپؐ کی پیروی میں آپؐ کے امتی بھی ایسا سلوک اپنی بیٹیوں کے ساتھ کریں اور نسلی بقاء کے سرمائے کو یوں حقیر نہ سمجھیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہر گز نہیں ہے کہ جناب محمدؐ اپنی بیٹی کا جو بھی احترام کرتے تھے وہ صرف دوسروں کی تربیت اور دوسروں کو بتانے کے لئے تھا۔ ایسا نہیں ہے۔ یہاں حضرت فاطمہ (س) کی اخلاقی شخصیت کا بیان آئے گا۔ اس کے متعلق ہم تفصیل سے بات کریں گے اور آپ دیکھیں گے کہ حضرت سیدہ زہرا(س) اس احترام و اہمیت کے لائق تھیں۔ یہاں پر جو بات کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا فرض تھا کہ قرآن کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ امت کے لئے عملی نمونہ بھی پیش کریں۔

☆☆☆☆☆

وَاَيْنَ مِثْلُ خَدِيجَةَ صَدَّقَتْنِي حِينَ كَذَّبَنِي النَّاس

(حدیث شریف۔ سفینۃ البحار ج ا ص ا۔۳)

خدیجہ کی طرح (بیوی) کہاں ہے؟ اس نے میری (باتوں کی)
اس وقت تصدیق کی جب لوگوں نے مجھے جھٹلایا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت فاطمہ (س) حضرت محمد رسول اللہ کی بیٹی ہیں اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہ بنت خویلد ہیں. حضرت خدیجہ کی پیغمبر اسلامؐ سے شادی سے پہلے کی زندگی کے بارے میں چند اشاروں کے سوا مستند معلومات قدیم کتب تاریخ میں نہیں ہیں۔ ابتدائی منابع میں چند واقعات کے حوالے سے گاہ بگاہ ان کے والد اور چچازاد کا نام آیا ہے۔ خویلد بن عبدالعزی بن قصی بن کلاب، قریش کے معروف خاندان اور شرفاء میں سے تھے۔ دور جاہلیت میں خویلد اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ دوسری جنگ فجار(۱) میں جو شمطہ کے نام سے مشہور ہے اور اس دن قریش، کنانہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہوئے۔ قبیلہ اسد کے رئیس وہ تھے۔(۲)

مورخین نے لکھا ہے کہ جب تبع حجرالاسود کو یمن لے جانا چاہتا تھا تو خویلد اس کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے(۳)۔ ان کا یہ اقدام ان کے زمانے میں ممتاز حیثیت کا پتہ دیتا ہے۔ حضرت خدیجہ کے چچازاد ورقہ بن نوفل عرب کے کاہنوں میں سے تھے اور جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے کہ وہ سابقہ ادیان کی کتابوں کو جانتے تھے۔ حضرت خدیجہ ظہور اسلام سے قبل قریش کی ممتاز خواتین میں

---

(۱) اس جنگ کو جنگ فجار اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ حرام مہینوں میں واقع ہوئی۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس وجہ سے یہ نام دیا گیا کیونکہ اس جنگ میں کچھ حرام چیزوں کو حلال قرار دے دیا گیا۔ ملاحظہ فرمائیں: سیرت ابن ہشام ۲۰۱ ج ا۔ مجمع الامثال میدانی، فصل ایام العرب، نیز اقرب الموارد۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

شمار ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ انہیں قریش کی عورتوں کی سردار اور طاہرہ کہا جاتا تھا. رسول اکرمؐ سے عقد سے قبل وہ پہلے ابو ہالہ ہند بن نباش بن زرارہ (۱) کی بیوی تھیں اور پھر بنی مخزوم کے فرد عتیق بن عائذ کی زوجہ بنیں (۲) ان کے ابو ہالہ سے دو بیٹے ہوئے اور عتیق سے ایک بیٹی ہوئی۔ یہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے ماں کی طرف سے بھائی اور بہن ہیں.

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

(۲) ابن اثیر ج ۱ ص ۵۹۳، انساب الاشراف بلاذری ص ۱۰۲ طبع دارالمعارف۔ لیکن ابن سعد نبی کریمؐ کی حضرت خدیجہ سے شادی کے دن کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: یہ جو لکھا گیا ہے کہ "حضرت خدیجہ نے اپنے والد کو مشروب پلا کر انہیں طبیعی حالت سے خارج کر دیا" درست نہیں ہے اور اس کی اسناد بالکل غلط ہیں۔ جو کچھ اہل علم سے ہم تک پہنچا ہے اور ان کی اسناد بھی درست ہیں یہ ہے کہ خویلد جنگ فجار سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ (طبقات ص ۸۵ ج۱) لیکن تفسیر میدانی نے "یوم شمط" کا ترجمہ "بنی ہاشم اور بنی عبد شمس کے مابین جنگ کا" کیا ہے۔ (مجمع الامثال) جنگ فجار میں ایک طرف قریش اور دوسری طرف کنانہ تھا اور اس حوالے سے "تفسیر میدانی" دقت نظر اور باریک بینی سے محروم ہے۔ اسی طرح خدیجہ کے نکاح کے دن خویلد کے مست ہونے اور اس شادی پر راضی ہونے کا جو واقعہ بعض لوگوں نے نقل کیا ہے وہ بھی بے بنیاد ہے۔ جیسا کہ اکثر اہل سنت کی روایات اور شیعی مآخذ میں ہم پڑھتے ہیں، اس خواستگاری میں حضرت خدیجہ کے چچا عمرو ابن اسد اور ورقہ ابن نوفل موجود تھے اور ظاہراً خویلد اس تاریخ کو زندہ ہی نہیں تھے۔

(۳) عقاد فاطمة الزهراء ص ۱۰۔ عقاد نے اپنی سند کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یمن کے بادشاہوں کا عام لقب "تُبعّ" ہے۔ اگر یہ داستان درست ہو تو یہ شخص تبعّ الاصغر حسّان تھے۔ لیکن مؤرخین نے چند بادشاہان یمن "تبعّ" کی داستانوں کو خلط کر دیا ہے۔ (تاریخ یعقوبی، حبیب السیر، مجمل التواریخ والقصص، اور تاریخ گزیدہ کی طرف رجوع کیجئے۔) جہاں تک مؤلف نے تحقیق کی ہے، اس تبعّ نے ایک خواب دیکھنے کے بعد خانہ کعبہ کا احترام کیا اور اسے غلاف پہنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے کعبہ کو غلاف پہنایا۔ جو داستان محمد ابن اسحاق سے نقل کرتے ہوئے سیر ہشام میں لکھی گئی ہے اور یاقوت نے بھی اس کا کچھ حصہ لفظ کعبہ کی تشریح میں بیان کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ بے بنیاد ہے۔ واللہ العالم۔ (سفینۃ البحار ج ۲ ص ۴۴۳ کی طرف رجوع فرمائیں)

(۱) بلاذری انساب الاشراف۔ ص ۳۹۰

(۲) ابن سعد، طبقات ج ۸ ص ۸۔ بعض مآخذ نے ان کی عتیق سے پہلے ابوہالہ سے شادی کا ذکر کیا ہے۔ (مقاتل الطالبین ص ۴۸۔ کشف الغمہ ج ۱ ص ۵۱۱۔) اس شہرت کے مقابلے میں ابن شہر آشوب نے مناقب اور سید مرتضٰی نے شافی میں لکھا ہے کہ حضرت خدیجہ پیغمبر اسلامؐ سے شادی کے موقع پر کنواری تھیں اور جس کی شادی ابوہالہ سے ہوئی تھی وہ خدیجہ کی بہن تھیں۔ ابن شہر آشوب نے اپنے متعدد مآخذ میں احمد بلاذری کی کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے۔ (مناقب۔ ج ۱ ص ۱۵۹) قاعدةً احمد بلاذری کو "انساب الاشراف" کا مؤلف احمد ابن یحیٰی ہونا چاہیئے اور اگر ایسا ہے تو وہ امام حسنؑ کا ایک جملہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "میں نے اپنے ماموں ہند ابن ابی ہالہ سے پوچھا۔" اور اس جملے کی تفسیر میں وہ کہتا ہے کہ چونکہ خدیجہ بنت خویلد پہلے ابوہالہ اسدی کی بیوی تھیں۔ (انساب الاشراف ص۔ ۳۹۰) اور اسی طرح کتاب کے صفحہ ۴۰۶ پر یوں نقل کیا گیا ہے کہ خدیجہ نبی کریمؐ سے نکاح سے پہلے ابوہالہ ہند ابن نباش کی زوجہ تھیں۔

حضرت محمدؐ کے ساتھ ان کی شادی

ان دو شادیوں کے بعد باوجود اس کے کہ وہ خوبصورت اور مالدار خاتون تھیں اور ان کے رشتے کے خواہاں بہت سے تھے، انہوں نے کسی سے شادی نہ کی اور اپنے مال سے تجارت کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابو طالب نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ وہ بھی اپنے دوسرے حصہ داروں کی طرح خدیجہ کے عامل بنیں اور ان کی طرف سے ان کا مال شام لے جائیں اور ایسا ہی ہوا۔ اس تجارتی سفر کے بعد حضرت خدیجہ حضرت محمدؐ سے شادی کرنے پر مائل ہوئیں اور جیسا کے ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے آنحضرتؐ کو اپنا شوہر قبول کرلیا۔ جیسا کہ مؤرخین کے درمیان مشہور ہے اور سنت بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ حضورؐ سے شادی کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال تھی۔ لیکن ان کے بطن سے آنحضرتؐ کی جو اولاد ہوئی ان کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مؤرخین نے اس لحاظ سے چالیس کے عدد کا انتخاب کیا کہ یہ ایک مکمل عدد ہے۔ اس شہرت کے مقابلے میں ابن سعد اپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت محمدؐ سے شادی کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر اٹھائیس سال تھی۔(۱)

حضرت خدیجہ پہلی خاتون تھیں جو آنحضرتؐ پر ایمان لائیں. جب پیغمبر اکرمؐ نے اعلانیہ دعوت کا آغاز کیا تو مکہ کے ثروتمند اور امیر لوگ آپؐ کے مقابلے کو اٹھ کھڑے ہوئے اور آپؐ کو اور آپ کے پیرو کاروں کو آزار واذیت پہنچانا شروع کر دی۔ حضرت ابو طالب اپنے بھتیجے کی دشمنوں کے گزند سے حفاظت کرتے تھے۔ ان کے ساتھ حضرت خدیجہ آپؐ کی مونس و مدد گار تھیں جو گھر میں آپؐ کو آرام و سکون پہنچاتیں اور آپؐ کی ہمت افزائی کرتیں۔ اسی انسانی جذبے اور اسلامی احساس کی بنا پر رسول خداؐ ہمیشہ انہیں اچھے انداز سے یاد کرتے(۲)۔

حضرت فاطمہ اطہر(س) ایسے باپ اور ایسی ماں کی بیٹی تھیں۔ ان کی ولادت کب اور کس تاریخ کو ہوئی؟ اس کا دن بلکہ سال بھی معلوم نہیں ہے۔ یعنی مورخین نے اس سلسلے میں کوئی متفقہ تاریخ بیان نہیں کی بلکہ مختلف تاریخیں ذکر کی ہیں۔ اسلام کی عظیم شخصیات (مرد ہو یا عورت) کی تاریخ ولادت اور وفات کا مشخص ہونا تاریخی لحاظ سے اگرچہ قابل اہمیت اور قابل بحث ہے اور ہم بھی اس کی تحقیق کریں گے لیکن شخصیات کے تجزیہ و تحلیل میں چنداں اہم نہیں ہے۔ اسلام کی بڑی اور غیر معمولی شخصیات کی زندگیوں کے حوالے سے بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے جو چیز اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ انہیں معلوم ہو کہ وہ کون تھے؟ ان کی تربیت کیسی ہوئی؟ انہوں نے زندگی کس

---

(۱) ابن سعد طبقات، ج ۸ ص ۱۰۔ کشف الغمہ ج ۱ ص ۵۱۳

(۲) بخاری ج ۵ ص ۴۷۔ ۴۸۔ رجوع کیجئے اعلام النساء ج ۱ ص ۳۳۰

طرح گزاری؟انہوں نے کیا کردار اپنایا؟اور کیوں اپنایا؟ معاشرے پر اپنی زندگی میں اور بعد میں کیا اثرات مرتب کیے؟ لیکن وہ کب پیدا ہوئے اور کب وفات پائی؟ اس بارے میں بعض افراد کا خیال ہے کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ معلوم ہے کہ ایک دن وہ دنیا میں آئے اور ایک دن اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ شاید بات یہی درست ہو۔ ایسی شخصیات کبھی نہیں مرتیں اور ہمیشہ تاریخ کے ساتھ زندہ ہیں۔ لیکن تاریخ نویس تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کو مشخص کرنا اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داری سمجھتا ہے۔ اس لئے کے وہ مؤرخین اور سیرت نگاروں کی سنت اور روش کی پیروی کرنا اپنا فریضہ جانتا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ یہ تاریخیں تاریخ کے عظیم افراد کی زندگی کے تمام واقعات سے ایک طرح سے مربوط ہو جائیں۔

اس کتاب میں اگرچہ اس کی ضرورت ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمام تر سعی و کوشش کو بروئے کار لانے کے باوجود رسول اللہؐ کی بیٹی کے سال پیدائش کے متعلق کوئی صحیح اور دقیق اطلاع نہیں دی جا سکتی۔ یہ صرف جناب فاطمہ (س) کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ نہیں کہ جس میں مؤرخین متفق نہیں ہیں بلکہ دین کے پیشواؤں اور آئمہ معصومین علیہم السلام بلکہ خود رسول اکرمؐ کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات میں سے کسی ایک پر بھی مورخین کا اتفاق نہیں ہے۔ یہ سب اختلاف کیوں پیش آیا؟ پہلی فصل میں اس کا مختصر جواب دیا جا چکا ہے۔

اس زمانے میں واقعات کو محفوظ رکھنے اور لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ راویوں نے جو کچھ سنا اسے ذہن نشین کر لیا۔ جو کچھ قوم کے بوڑھے اور بزرگ افراد کہہ دیتے قوم اسے قبول کر لیتی۔ کبھی کبھار کوئی اہم ترین واقعہ یا کوئی ایسا واقعہ جو نیا نیا وقوع پزیر ہوتا، تاریخ کا مبداء قرار پا جاتا۔اس سے بڑی شخصیات کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا حساب کرتے۔ جیسا کہ خود ہم نے اپنی زندگیوں میں اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ فلاں سال سیلاب آیا، فلاں سال شہر برباد ہوا، فلاں سال قحط پڑا، فلاں سال وبا پھیلی وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے واقعات و حادثات کی تاریخ کو اس کے چند سال بعد لوگ یاد رکھتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر اپنے حساب و کتاب کرتے ہیں لیکن ایک مدت گزرنے کے بعد خود وہ واقعات مجہولات میں شامل ہو جاتے ہیں۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی ولادت باسعادت عام الفیل میں ہوئی۔ جس سال ابرہہ اپنے ہاتھیوں سمیت خانہ کعبہ کو تباہ و برباد کرنے کے لئے مکے آیا تھا۔ عام الفیل کئی سالوں تک مکہ کے لوگوں کو یاد رہا۔ لیکن ہم اگر جاننا چاہیں کہ یہ واقعہ کس سال میں رونما ہوا تو بذات خود یہ ایک مشکل ہے۔ اس کے باوجود مبداء تاریخ بننے والے واقعات کو درست بھی مان لیا جائے اور دقیق تاریخ سے عینی شاہدوں کی غفلت اور فراموشی سے ہم صرف نظر کر لیں، پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ راویوں کا حافظہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو کیا یہ غلطی نہیں کر سکتے؟ بالفرض پہلے درجے کے راوی

غلطی نہ کریں لیکن سو سال میں تقریباً تین نسلیں بدلتی ہیں، اس حالت میں کون اس بات کی ضمانت دے سکتا ہے کہ راویوں کے اس سارے سلسلے میں سب کا حافظہ کمال درجے کا ہے۔ نیز یہ کہ دو یا چند با اعتماد گواہ کسی کے قوی حافظہ کی تعریف کردیں تو یہ علم روایت یا درایت اور اصول یا فقہ کے کام کے حوالے سے دلیل بن سکتا ہے، لیکن واقعات بیان کرنے میں جہاں روایتوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، ایسا ضابطہ اور اصول کافی نہیں ہے۔ تاریخی واقعات کو محفوظ کرنے میں راویوں اور مؤرخین میں پائے جانے والے اختلاف کی مذکورہ دو وجوہ کافی ہیں، لیکن ان کے علاوہ اور اسباب کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم ملاحظہ کریں گے کہ ہماری زیر بحث شخصیت کے بارے میں بھی یہی صورت حال ہے۔

اہل تسنن کے سیرت نگاروں اور مؤرخین نے عام طور پر حضرت **فاطمة الزهرا**(س) کی تاریخ پیدائش پانچ سال قبل از بعثت رقم کی ہے۔ جبکہ بعض شیعہ تاریخ نویسوں اور بڑے بڑے علماء کے مطابق ان کی ولادت بعثت کے پانچویں سال ہوئی ہے۔

ابن سعد ''طبقات'' میں،(۱) طبری ''تاریخ'' میں ،(۲) بلاذری ''انساب الاشراف'' میں،(۳) ابن اثیر ''کامل'' میں،(۴) ابو الفرج اصفہانی ''مقاتل الطالبین'' میں،(۵) محمد بن اسحاق (۶) اور ابن عبدالبر ''استیعاب'' میں(۷) اور دوسرے چند افراد نے اول الذکر تاریخ کو قبول کیا ہے اور عموم نے لکھا ہے کہ یہ وہ سال تھا جب قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر نو کی۔ بلاذری اس طرح روایت کرتا ہے:

> ایک دن عباس بن عبدالمطلب حضرت علیؑ کے پاس آئے دیکھا کہ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ (س) اس بات پر گفتگو کر رہے ہیں کہ دونوں میں سے کون بڑا ہے۔ عباس نے کہا علیؑ تم بڑے ہو کیونکہ تم خانہ کعبہ کی تعمیر نو سے چند سال پہلے پیدا ہوئے جبکہ میری بیٹی (فاطمہ) اس سال پیدا ہوئی جب قریش خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے۔(۸)

نیز طبری اور دوسروں نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ وفات کے وقت حضرت زہرا (س) کی عمر انتیس (۲۹) سال کے لگ بھگ تھی۔(۹)۔ لیکن یعقوبی جو اپنی زیادہ تر روایات میں منفرد ہے اس نے حضرت زہرا (س) کی عمر، وفات کے وقت تئیس (۲۳) سال درج کی ہے۔(۱۰) اس کے بقول حضرت زہرا (س) کی ولادت پیغمبر اکرمؐ کی بعثت والے سال میں ہوئی ہے۔

---

(۱) طبقات ابن سعد ج۸ ص ۱۱(۲) تاریخ طبری ج ۱۳ ص ۲۴۳۴ نیز ج ۴ ص ۱۸۶۹(۳) بلاذری انساب الاشراف ص ۴۰۲(۴) ابن اثیر کامل ج ۲ ص ۳۴۱ (۵) مقاتل الطالبین ص ۴۸ (۶) نقل از مجلسی بحار الانوار ص ۲۱۴(۷) استیعاب ص ۷۵۰ (۸) انساب الاشراف ص ۴۰۳۔ (۹) ج ۴ ص ۱۸۶۹۔ (۱۰) یعقوبی ص ۹۵ ج ۲

اسی شہرت کے برخلاف شیعہ علماء اور محدثین مثلاً کلینی نے کافی (۱) میں، ابن شہرآشوب نے مناقب،(۲) علی بن عیسی اربلی نے کشف الغمہ (۳) اور مجلسی نے بحارالانوار میں دلائل الامامہ اور دوسری کتب (۴) سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رسول اللہؐ کے منصب رسالت پر مبعوث ہونے کے پانچ سال بعد حضرت زہراؑ کی ولادت ہوئی۔ صرف مصباح المتہجد (۵) میں شیخ طوسی کی تحریر اس مشہور روایت کے برخلاف ہے۔ کیونکہ انہوں نے حضرت زہرا (س) کی حضرت علیؑ سے شادی کے وقت عمر تیرہ سال لکھی ہے اور اگر ان کی شادی ہجرت کے پانچ ماہ بعد ہونے کو ہم تسلیم کریں تو ان کی ولادت بعثت کے پہلے سال میں ماننا پڑے گی اور یہ رائے یعقوبی کے قول سے مطابقت رکھتی ہے۔ روایات میں اس اختلاف کے ساتھ کسی ایک کی سند کو قبول کرنا اور دوسری سند کو چھوڑ دینا نہایت مشکل نظر آتا ہے، جیسا کہ ہم نے مقدمے میں اشارہ کیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خارجی قرائن کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے ان قرائن کی مدد سے کسی ایک طرف کا پلڑا بھاری ہو جائے اور اسے اختیار کرنے میں آسانی ہو سکے اور یوں نتیجے کے طور پر اسے مرجح قرار دے دیا جائے۔

ایک قابل ذکر اور قوی قرینہ شیعہ علماء اور محدثین کی روایات میں عمومی طور پر پایا جاتا ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دختر رسول اکرمؐ کی ولادت بعثت کے بعد ہوئی تھی۔ یہ قرینہ حضرت زہرا (س) کی پیدائش کا معراج النبیؐ سے باہم مربوط ہوتا ہے۔ معراج کی روایات کے ضمن میں رسول اللہؐ نے فرمایا کہ شب معراج مجھے بہشتی سیب دیا گیا اور میری بیٹی فاطمہ (س) کا نطفہ اسی پھل سے وجود میں آیا (۶)۔

اگر مورخین نے معراج کی تاریخ کو بطور دقیق معین کر دیا ہوتا، مثلاً بعثت کے کون سے سال میں یہ واقعہ ہوا تو کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ لیکن دوبارہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معراج رسول اکرمؐ کس سال واقع ہوئی تھی؟ اس سوال کا جواب بھی واضح نہیں ہے۔ ابن سعد نے ایک روایت کے مطابق ہجرت مدینہ سے اٹھارہ ماہ پہلے اس واقعہ کا وقوع ذکر کیا ہے اور دوسری روایت کی بنا پر ہجرت سے ایک سال قبل کا واقعہ کہا ہے۔(۷) اور ابن اثیر نے تین سال اور بروایتے ایک سال قبل از ہجرت بیان کیا ہے۔ جب کہ شیعہ علماء نے بعثت کے دو سال بعد سے لے کر ہجرت سے چھ ماہ پہلے تک اس کی تاریخیں بیان کی ہیں۔ جب روایات کے اختلاف کا سامنا ہوا تو اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ حضور اکرمؐ کئی بار آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔(۸) لیکن جو بات اہل سنت کے مورخین اور محدثین کے قول کی تائید کرتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ (س) اس سال پیدا ہوئیں جب قریش نے خانہ

---

(۱) اصول کافی ص ۴۵۸ ج ۱ (۲) مناقب ج ۳ ص ۳۵۷ (۳) کشف الغمہ ج ۱ ص ۴۴۹ (۴) الامامہ ج ۴۳ ص ۷ (۵) مصباح المتہجد ص ۵۶۱ (۶) بحار ج ۴۳ ص ۵ از علل الشرائع (۷) الکامل ص ۵۱ ج ۲ (۸) منتہی الآمال ص ۷۳ ج ۲

کعبہ کو دوبارہ بنایا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر نو کا واقعہ تاریخوں میں بیان ہوا ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی حیات طیبہ کی تاریخ سے واقف سب افراد اس واقعہ کو جانتے ہیں۔ مختصر طور پر یہ واقعہ یوں ہے کہ ایک دفعہ سیلاب کی وجہ سے خانہ کعبہ گر گیا۔ لہذا اس کی تعمیر نو کی گئی۔ جب تعمیر کے دوران میں حجرالاسود کو نصب کرنے کا مرحلہ آیا تو اس سعادت کے حصول میں قریش کے قبائل کے درمیان اختلاف اور نزاع پیدا ہو گیا۔ ہر گروہ کا سردار یہ چاہتا تھا کہ یہ افتخار اس کے حصے میں آئے۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جاتی۔ آخر کار وہ سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ جو بھی سب سے پہلے دروازے سے اندر داخل ہو گا اس کا فیصلہ مان لیں گے۔ سب سے پہلے آنحضرتؐ دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ سب نے کہا وہ امین ہیں اور ہم انہیں اپنے درمیان حَکَم (منصف) کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ آپؐ سے ماجرا بیان کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا ایک چادر یا بڑا کپڑا پھیلایا جائے۔ اس کے بعد آپؐ نے حجرالاسود اٹھا کر چادر پر رکھا اور چار قبیلوں کے سرداروں سے کہا کہ وہ ایک ایک کونہ پکڑ لیں اور زمین سے اٹھائیں۔ ان سب نے چادر کو زمین سے اٹھایا۔ آپؐ نے حجر الاسود اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ یوں آپؐ نے اپنی انوکھی تدبیر سے طویل اور مسلسل قتل و غارت سے انہیں بچا لیا۔

حضرت محمدؐ کا فیصلہ کرنا اور حجرالاسود کو نصب کرنا، ان مقدمات کے ساتھ ہو تو یقیناً یہ بعثت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ کیونکہ بعثت کے پانچویں سال میں قریش پیغمبر اکرمؐ کے سخت دشمن تھے۔ لہذا انہیں فیصلہ کرنے کا حق ہر گز نہ دیتے۔

دیگر خارجی قرائن کو مختصر طور پر ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ ایک دن اونٹ کا فضلہ اور اوجڑی، ابوجہل کے کہنے پر رسول اللہ پر گرائی گئی۔ حضرت فاطمہ(س) کو معلوم ہوا تو وہ مسجد الحرام گئیں اور اس گندگی کو اپنے بابا کے لباس سے صاف کیا(۱) قریش کی طرف سے حضور اکرمؐ کے ساتھ ایسا ہتک آمیز سلوک ظاہراً بعثت کے دسویں سال سے پہلے، رسول اللہ کی طائف ہجرت سے پہلے، شعب ابی طالب کے محاصرہ اور بائیکاٹ سے پہلے تھا۔ اگر حضرت فاطمہ(س) کی پیدائش کو بعثت کے پانچویں سال تسلیم کیا جائے تو اس وقت ان کی عمر تین سے پانچ سال سے زیادہ نہ تھی اور بعید ہے کہ اس عمر کی بچی مسجد جائے اور وہاں پر ایسا کام انجام دے۔

۲۔ جنگ احد کے دن جب حضرت فاطمہ (س) نے سنا کہ ان کے بابا کا چہرہ زخمی ہوا ہے تو وہ چند عورتوں کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں گئیں اور جب باپ کو دیکھا تو ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر روئیں اور پھر آپؐ کے چہرہ اقدس سے خون صاف کیا۔ (۲) اگر ہم واقعہ معراج کو بعثت کے پانچویں

---

(۱) انساب الاشراف ص ۱۲۵ و مآخذ دیگر (۲) انساب الاشراف ص ۳۲۴ ۔ مغازی ص ۳۴۹

سال مانیں تو اس وقت احد کے واقعہ میں کسی قسم کا عدم امکان نظر نہیں آتا لیکن اگر اٹھارہ ماہ یا چھ ماہ ہجرت سے پہلے والی روایت صحیح ہو تو اس وقت تسلیم کرنا پڑے گا کہ جنگ احد کے موقع پر حضرت فاطمہ (س) کی عمر پانچ سال یا اس سے کم تھی۔ جیسا کہ آئندہ آئے گا حضرت زہرا کی شادی ہجرت کے دوسرے سال ذوالحجہ میں جنگ احد سے پہلے انجام پائی۔ یعنی اس وقت ان کی عمر نو سال یا اس سے زیادہ تھی۔

۳۔ جیسا کہ ہم لکھیں گے، شیعی روایات میں یہ بات مذکور ہے کہ حضرت زہرا بعثت کے پانچ سال بعد پیدا ہوئیں اور یہ وہ سال تھا جب قریش خانہ کعبہ دوبارہ تعمیر کر رہے تھے۔ قریش کے سرداروں کے درمیان ثالثی کرانا حتمی طور پر بعثت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ کیونکہ بعثت کے پانچ سال پہلے اور بعد میں قریش آنحضرتؐ کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھتے تھے۔ چہ جائیکہ وہ آپؐ کو امین سمجھیں اور آپؐ کی ثالثی فیصلے کے سامنے اور وہ بھی اتنے بڑے مسئلہ میں سر تسلیم خم کریں۔

۴۔ ہم جانتے ہیں کہ مؤرخین نے حضرت خدیجہ کی نبی اکرمؐ سے شادی کے وقت عمر چالیس سال لکھی ہے۔ اگر ہم کہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا (س) کی ولادت بعثت کے پانچویں سال ہوئی ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس وقت حضرت خدیجہ کی عمر ساٹھ سال تھی۔ اگرچہ یہ امر محال تو نہیں ہے لیکن بعید نظر آتا ہے۔ دوسری طرف علامہ مجلسی نے امالی صدوق سے اس مضمون کی روایت نقل کی ہے:

> حضرت خدیجہ نے رسول اللہؐ سے شادی کی تو مکہ کی عورتوں نے حضرت خدیجہؑ سے دوری اختیار کر لی، ان کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ نہ ان سے ملتیں اور نہ انہیں سلام کرتیں اور نہ ہی کسی عورت کو ان کے پاس جانے دیتیں۔ چنانچہ جب زہراء (س) کی ولادت قریب ہوئی تو حضرت خدیجہ نے قریش اور بنی ہاشم کی عورتوں کو مدد کے لیے بلایا، لیکن انہوں نے صاف جواب دے دیا اور کہا: تم نے ہماری نصیحت کو نہ مانا اور ابوطالب کے یتیم بھتیجے سے شادی کر لی۔ (۱)

اگر اس روایت کو اسی طرح قبول کر لیا جائے اور جناب زہرا کی ولادت کو بعثت کے پانچویں سال مانا جائے تو اس وقت حضرت خدیجہ کی آنحضرتؐ سے شادی اور حضرت زہرا (س) کی ولادت میں بیس سال کا وقفہ بنتا ہے۔

ان بیس سالوں میں ملامت کرنے والی عورتوں میں کچھ مر کھپ گئی ہوں گی۔ جو جوان تھیں وہ بوڑھی ہو چکی ہوں گی اور نابالغ لڑکیاں جوان ہو گئی ہوں گی اور تمام تر صورت حال بدل

---

(۱) امالی صدوق از مجلسی ج ۴۳ ص ۔۶

چکی ہو گی۔ اب حضرت محمدؐ ابو طالب کے یتیم بھتیجے نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ لوگوں کا ایک گروہ ان کا دل و جان سے گرویدہ اور ان کا پیرو کار ہے۔ قریش کے مردوں کی یہ آرزو ہے کہ آپؐ ان سے مدد طلب کریں اور وہ اس امداد طلبی کو غنیمت شمار کرتے ہوئے اپنے تئیں اسے موافقت اور رفع اختلاف کا مقدمہ قرار دیں.

ان حالات میں ہو سکتا ہے قریش کی عورتیں جن کے شوہر رسول اکرمؐ کے دشمن ہیں حضرت خدیجہ کی بات کو ٹھکرا دیں لیکن بنی ہاشم کی عورتیں کیوں مثبت جواب نہ دیں؟ اور اصولی طور پر حضرت خدیجہ کو اس وقت کافر اور بت پرست قریش کی عورتوں کی مدد کی کیا ضرورت تھی؟ کیا مسلمان عورتیں اس کام میں ان کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ یہاں پر یہ بات کہنا مناسب ہے کہ ان راویوں کی روایت پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا جو صرف اپنے حافظے پر اعتماد کرتے ہوئے روایت نقل کریں۔

کشف الغمہ میں ایک اور روایت بیان ہوئی ہے:

حضرت فاطمہ (س) بعثت کے پانچ سال بعد پیدا ہوئیں اور یہ وہ سال تھا جب قریش نے خانہ کعبہ کو دوبارہ تعمیر کیا...۔ (۱)

ہمیں یوں لگتا ہے کہ سب سے پہلے راوی یا بعد والے راویوں میں سے کسی ایک نے روایت نقل کرنے میں غلطی کی ہے اور اس کے ذہن میں بعثت سے پہلے کی بجائے بعثت کے بعد کا لفظ یاد رہ گیا اور اس نے پھر یونہی آگے نقل کردیا۔ جیسا کہ ہم نے کہا کہ خانہ کعبہ کی عمارت کی تعمیر نو بعثت سے پانچ سال پہلے ہوئی ہے۔ بالفرض اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ اس تاریخ کے بعد بھی خانہ کعبہ کی کئی دفعہ تعمیر ہوئی ہے (جیسا کہ بعض متاخرین نے اس کا احتمال بتایا ہے) مسلم ہے کہ قبائل کے درمیان وہ جھگڑا دوبارہ پیش نہیں آیا ہو گا اور اگر یہ واقعہ بھی تکرار ہوا ہو تو جیسا کہ ہم نے بیان کیا انہوں نے ثالثی کے لیے رسول خداؐ کو ہر گز قبول نہیں کیا ہو گا اور اگر خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے ساتھ یہ تمام واقعات وقوع پذیر نہ ہوئے ہوں تو پھر اس کی اس حد تک اہمیت نہیں رہتی کہ یہ مبداء تاریخ قرار پائے۔ بہر حال جو چیز مسلم ہے وہ یہ ہے کہ حضرت زہرا (س) کی ولادت اور خانہ کعبہ کی تعمیر نو ایک ہی سال میں ہوئی ہے اور اس کا ذکر شیعہ و سنی دونوں کی چند روایات میں موجود ہے.

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ان روایات کے بارے میں بحث کا فائدہ سوائے تاریخ کے تعین کے اور کوئی نہیں ہے۔ رسولؐ خدا کی بیٹی بعثت سے پانچ سال پہلے پیدا ہوں یا پانچ سال بعد، نو

---

(۱) کشف الغمہ ج ۱ ص ۴۴۹۔ بحار ج ۴۳ ص ۷

سال کی عمر میں ان کی شادی ہوئی یا اٹھارہ سال میں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئی ہوں یا اٹھائیس سال کی عمر میں۔ وہ نبی آخر الزمانؐ کی دختر، تربیت یافتہ خاتون کا کامل نمونہ اور اعلیٰ اسلامی اخلاق کے زیور سے آراستہ ہیں۔ ان کی زندگی سے ہر مسلمان مرد اور عورت کو جو درس لینا چاہیے، وہ ان کے تقویٰ، پارسائی، پرہیز گاری، بردباری، فضیلت، خدا پر ایمان، خوف الٰہی اور دوسری اعلیٰ انسانی اقدار کا درس ہے۔ وہ سب اعلیٰ صفات کی مالک تھیں۔ ان صفات کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

اس بحث کو ہم نے اس لئے تفصیل کے ساتھ بیان کیا تاکہ مؤرخین اور محدثین کی سنت کا بھی لحاظ رکھا جائے.

فُطِمَتْ فَاطِمَةُ مِنَ الشَّر

(امام صادقؑ ـ روضۃ الواعظین ج ۱ ص ۱۴۸)

فاطمہ (س) کو شر سے پاک کر دیا گیا ہے۔

سیرت نگاروں اور محدثین نے دختر رسولؐ کے چند القاب ذکر کئے ہیں: زہراء، صدیقہ، طاہرہ، راضیہ، مرضیہ، مبارکہ، بتول اور دوسرے القابات۔ ان میں سے لقب زھرا زیادہ مشہور ہے اور کبھی کبھی ان کے نام کے ساتھ آتا ہے۔ یعنی فاطمہ زہرا یا عربی ترکیب فاطمة الزهرا. عرف عام میں ان کے نام کی بجائے بیشتر زہرا استعمال ہوتا ہے۔ لغت کے اعتبار سے زہرا کا لفظ درخشندہ، روشن اور اس کے مترادف معنوں کا حامل ہے۔ یہ لقب ہر لحاظ سے اس بانو کے شایان شان ہے۔ وہ مسلمان خاتون کا درخشندہ چہرہ، معرفت کی تابندہ روشنی، پرہیز گاری اور خدا پرستی کا روشن نمونہ ہیں۔ یہ درخشند گی کسی خاص لمحے یا معین دن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جس دن انہوں نے اپنا فرض نبھایا اس دن سے لے کر آج تک وہ اسلامی تربیت کی پیشانی پر گوہر کی مانند درخشندہ ہیں۔

ان میں سے بعض القاب اور ان کے اسباب و وجوہات کے حوالے سے محدثین نے بہت سی روایات نقل کی ہیں. ان سب کے ذکر کرنے سے گفتگو طویل ہو جائے گی۔ مجموعی طور پر ان روایات سے حضرت فاطمہ (س) کے باپ اور شوہر کی نظر میں ان کے بلند مقام و مرتبے اور ان کی عظمت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام میں اور مسلمانوں کے درمیان ان کی قدرومنزلت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے تمام اسلامی مذاہب کے پیرو کار معترف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ کتب میں اکثر اور اہل سنت کی معتبر کتابوں میں کبھی کبھار حضرت فاطمہ (س) کی فضیلت پر علیحدہ کتاب دیکھنے کو مل جاتی ہے یا ان کتابوں میں فضائل کے بارے میں روایات پر مشتمل جداگانہ ابواب ذکر کئے جاتے ہیں.

ان کا اسم گرامی فاطمہ (س) ہے. فاطمہ فطم کے مصدر سے اسم صفت ہے اور فطم عربی

لغت میں کاٹنے، قطع کرنے اور جدا ہونے کے معنوں میں آیا ہے۔ اس صیغے کا جو کہ فاعل کے وزن پر مفعولی معنی دیتا ہے، یہاں پر معنی کٹا ہوا اور جدا شدہ ہیں۔

فاطمہ کس چیز سے علیحدہ اور جدا ہے؟ شیعہ اور سنی کتب میں پیغمبر اسلام کی ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ان کا نام فاطمہ رکھا گیا چونکہ وہ اور ان کے شیعہ دوزخ کی آگ سے جدا ہیں(۱). علامہ مجلسی نے ایک روایت عیون اخبار الرضا اسے نقل کی ہے۔ عیون اخبار الرضا کے راوی نے اپنی اسناد کے ساتھ اسے علی بن موسی الرضا علیہا السلام اور محمد بن علی علیہا السلام سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے مامون سے اور مامون نے ہارون سے، اس نے مہدی سے اور مہدی نے اپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایات کی ہے کہ ابن عباس نے معاویہ سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ فاطمہؑ کو فاطمہؑ کیوں کہتے ہیں؟ اس نے جواب دیا نہیں! ابن عباس نے بتایا کہ کیونکہ وہ اور ان کے شیعہ دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ (۲) فتال نیشاپوری نے امام صادقؑ سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ فاطمہ (س) چونکہ برائیوں اور بدیوں سے دور اور جدا ہیں اس لئے انہیں فاطمہ کہا جاتا ہے۔ (۳) اسی قسم کے مفہوم پر مشتمل دوسری احادیث بھی منقول ہوئی ہیں۔ اسی طرح اس کے صیغہ اسم صفت کے مذکورہ معانی کے علاوہ اور معانی بھی بیان ہوئے ہیں۔ (۴)

ظہور اسلام سے پہلے دو یا تین عورتوں کے نام فاطمہ تھے۔ جو اسلام میں فواطم کے نام سے مشہور ہیں. جیسے اسد بن ہاشم کی بیٹی فاطمہ، عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی فاطمہ۔(۵) اور عمر بن عائذ کی بیٹی فاطمہ۔(۶)

حضرت زہرا(س) کی پرورش نبوت کے گھر میں اپنے باپ رسول خداؐ کی آغوش میں ہوئی۔ وہ اس گھر میں پروان چڑھیں جو فرشتوں کی آماجگاہ اور مرکز نزول وحی و آیات قرآن تھا۔ وہ جگہ جہاں مسلمانوں کا اولین گروہ اللہ تعالی کی وحدانیت پر ایمان لایا اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہا۔ ان کے دلوں کو اللہ نے آزمایا اور ان کی قرآن میں مدح فرمائی۔ دین کی تعلیم و تربیت حضرت زہرا(س) نے حضرت محمدؐ جیسے معلم سے حاصل کی جو معلم انسانیت تھے۔ جب تک دین باقی ہے، دین و دانش کا چراغ آپؐ کے دم سے روشن و تابندہ رہے گا۔

یہ چھوٹی سی بچی ان مسلمانوں کو دیکھتی کہ وہ آیات قرآن کی تعلیم لینے اور اللہ کی عبادت وبندگی کے احکام سیکھنے روزانہ کس شوق اور گرمجوشی کے ساتھ ان کے بابا کے پاس آتے ہیں۔. یہ وہ گھر تھا جس سے تکبیر کی آواز بلند ہوئی۔ جہاں پروردگار عالم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی ابتدا ہوئی

---

(۱) بحار ص ۱۸ ج ۴۳ از امالی شیخ طوسی۔ نسائی، حافظ ابوالقاسم دمشقی۔ (۲) بحار ص ۱۲ ج ۴۳ (۳) روضۃ الواعظین ص ۱۴۸۔

(۴) بحار ص ۱۲۔ (۵) ابن سعد ج ۱ ص ۳ لسان العرب ذیل فطم۔ (۶) یعقوبی ج ۲ ص ۸۔

اور ہر روز و شب، خاص اوقات میں وحدہ لاشریک کی بزرگی کا ذکر شروع ہوا۔ ان ایام میں پورے عرب بلکہ پورے جہان میں صرف ایک ہی گھر تھا جہاں سے ''اللہ اکبر،، کی صدا بلند ہوتی تھی۔ مکہ میں فاطمہ زہرا ہی چھوٹی لڑکی تھیں جو اپنے ارد گرد اس جوش و جذبے کا مشاہدہ کرتیں۔ اس آسمانی آواز نے اور ان بے مثال اعمال عبادت نے اس کمسن بچی کی روح پر جو اثرات مرتب کئے یہ کئی سالوں بعد آشکار ہوئے۔

وہ گھر میں اکیلی تھیں اور انہوں نے اپنا بچپن تنہائی میں گزارا۔ ان کی دو بہنیں رقیہ اور ام کلثوم (۱) ان سے چند سال بڑی تھیں۔

گھر میں ان کے ساتھ کھیلنے کے لئے کوئی ہمجولی نہ تھی۔ شاید ان کی تنہائی بھی ان عوامل میں سے ایک عامل ہو جس کی وجہ سے بچپن ہی میں ان کی تمام تر توجہ جسمانی ریاضت و عبادت اور روحانی تعلیم و تربیت کی طرف مرکوز ہو گئی۔ اللہ اکبر کی تعلیم پھر اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُولُ اللہ کا درس۔ آہستہ آہستہ دوسری آیات نازل ہوئیں اور دروس میں وسعت آتی گئی۔ قرآنی اخلاق کے درس اور انسانی عادات و اطوار اور اقدار کے حصول کی تعلیمات اور یہ کہ تمام لوگ اللہ اور اس کے قانون کے سامنے برابر ہیں، کسی کو دوسرے پر کوئی برتری حاصل نہیں، خدا کے حضور آقا اور غلام مساوی ہیں، تمہارا فرض ہے کہ غلاموں کے ساتھ، قیدیوں کے ساتھ، غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ مہربانی کرو اور ان سے خوش اسلوبی سے پیش آؤ، اپنی لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح سمجھو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش مت آؤ۔ ان تعلیمات کے نازل ہونے اور انہیں مسلمانوں کو سکھانے اور مسلمانوں کے ان تعلیمات کے حصول میں جوش و جذبے کے ساتھ ساتھ حضرت زہرا (س) نے اپنے باپ کے ساتھ رشتہ داروں اور مکہ والوں کی دشمنی کو بھی دیکھا۔ وہ لوگ ان باتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان احکامات اور تعلیمات سے لوگ آگاہ ہوں، جو اس سے پہلے سنی، نہ دیکھی گئی تھیں۔ ان تعلیمات کے پھیلنے نے ان کی زندگیوں کو درہم برہم کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے ڈر اور خوف کو چھپانے اور اپنے خیال میں ان تعلیمات کے اثرات زائل کرنے کے لیے آپؐ پر تہمتیں لگائیں کہ آپؐ جادو گر ہیں، دیوانے ہیں۔ کہاں ابو طالب کا یتیم بھتیجا اور کہاں پیغمبری؟ یہ وحی مکے اور یثرب کے کسی بڑے امیر آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوئی وغیرہ۔(۲) انہوں نے کہا کہ کہیں معاملہ ہمارے ہاتھوں سے نکل نہ جائے، لہذا اس کے لئے کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ لیکن اگر انہیں قتل کریں

---

(۱) اکثر شیعہ مؤرخین کی یہ رائے ہے کہ حضرت رقیہ اور ام کلثوم آنحضرتؐ کی اپنی بیٹیاں نہیں بلکہ ربیبائیں تھیں۔ مترجم

(۲) وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ o (زخرف ۳۱:) اور کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟

تو ابو طالب اور بنی ہاشم سے جنگ کرنا ہو گی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ان کے پیرو کاروں کو ان کے پاس سے منتشر کر دیا جائے اور اگر وہ زبان سے نہ سمجھیں اور اسے نہ چھوڑیں تو پھر ڈنڈے کے زور سے انہیں دور کیا جائے۔

جھوٹے آدمی کے پاس کون سا ہتھیار ہوتا ہے؟ دشنام، گالی، لڑائی، جھگڑا اور اگر ممکن ہو تو قتل۔ چھوٹے شہر میں خبریں بڑی تیزی سے پھیلتی ہیں۔ خاتون جنتؑ کے بابا کا گھر ان دنوں ایسے واقعات اور خبروں کے انعکاس کا مرکز تھا: آج بلال کو شکنجے دیئے گئے۔ آج عمار کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ آج عمار کی ماں کو شہید کر دیا گیا۔ آج آپؐ کے چچا ابو لہب نے یہ کہا اور ابو جہل نے یہ بکواس کی۔ روزانہ اسی قسم کی بری اور روح فرسا خبریں آتیں۔ یہاں تک کہ ایک دن انہوں نے سنا کہ بابا نے اپنے پیرو کاروں کو حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا ہے، کیونکہ ان کے والد گرامی مسلمانوں پر ظلم و ستم اور مصائب کو دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے تھے، آخر یہ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر سفر کی صعوبتیں کیوں جھیلیں؟ اور اس جگہ کی طرف جائیں جس کے بارے میں یہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہے؟ اس سے پناہ طلب کریں جسے نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔ اس کا طرز عمل کیسا ہے؟ ان کے بابا نے انہیں بتایا کہ نجاشی اپنے پاس پناہ لینے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے لیکن انہوں نے کون سا جرم کیا ہے کہ وہ اس کے پاس جا کر پناہ مانگیں؟ وہ کیوں غریب الوطنی کا غم سہیں؟ کیا حقیقت میں، خانہ کعبہ کے اندر خدا کے نام پر لکڑی اور پتھر دل کے بتوں کی اتنی قدر و منزلت ہے؟ کیا قریش کے بزرگ لوگ نہیں جانتے کہ انسانوں کے ہاتھوں سے بنائے ہوئے یہ بت نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان؟ یہ بات نہیں۔ یہ لوگ ایک اور چیز سے خوفزدہ ہیں اور وہ ایسے نقصانات ہیں جو محمدؐ کی دعوت کے پھیلنے سے انہیں لاحق ہوں گے:

> اَلَّذِی جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَہ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗ اَخْلَدَہ کَلَّا لَیُنْبَذَنَّ فِی الْحُطَمَہ۔ (سورہ ھمزہ)
>
> وہ جس نے مال جمع کیا اور اسے گنتا رہا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ باقی رکھے گا۔ نہیں، ہرگز ایسا نہیں ہے۔ یہ مال اسے دوزخ کی آگ میں پھینک دے گا۔

جی ہاں! جنگ شروع ہو چکی ہے۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ مخلوق کی اطاعت سے خالق کی اطاعت کی طرف لوٹ آئیں۔ غلامی کا طوق گردنوں سے اتار پھینکیں اور آزاد ہو جائیں۔ اسی کی خاطر وہ ان تمام مصائب و آلام کو اپنی جان کے بدلے خرید رہے ہیں۔ لیکن خدا کی اطاعت و بندگی چھوڑ کر شیطان کی بندگی کو ہرگز قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ جبکہ ان کا مخالف گروہ یہ چاہتا ہے کہ سب لوگ اسی طرح ان کی خدمت گزاری میں لگے رہیں اور ان کی مال و دولت میں

اضافے کا سبب بنتے رہیں۔ ان تمام واقعات میں ہر ایک اپنے لحاظ سے حضرت زہرا کے ظاہراً چھوٹے لیکن معنوی اعتبار سے بڑے دل پر اثر ہوا۔ ہر واقعہ نے انہیں ایک درس اور پیغام دیا۔ استقامت اور ثابت قدمی کا درس دیا۔ وہ لوگ جو اللہ کی حکومت کے سامنے گردن جھکا دیتے ہیں اور اپنے قول پر ثابت قدم رہتے ہیں، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔(۱) اس جہان میں روحانی اطمینان و سکون اور اگلے جہان میں بہشت جاوداں اس شخص کے نصیب میں ہے جو مصائب ومشکلات میں پامردی اور استقامت دکھائے اور شیطانی مکروہ حیلوں سے نہ گھبرائے۔ یہ وہ سبق تھے جو مسلمانوں کو سکھائے جاتے تھے۔ حضرت فاطمہ (س) کا اس ہستی کے ساتھ بلا واسطہ تعلق تھا جن کے قلب مقدس پر یہ الٰہی احکامات اور تعلیمات نازل ہوتی تھیں۔ لہذا وہ آپؐ سے ان کی علیحدہ تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ حضرت زہراؑ کو یکے بعد دیگرے ان تمام آزمائشوں سے گزرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ لوہے کو جتنا زیادہ پگھلایا جائے اتنا زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتا ہے۔ لیکن یہ آزمائشیں نہ ختم ہونے والی ہیں۔ ہر روز نیا امتحان اور ہر شب نئی مشکل۔

آزمائش و مشکلات کی گھڑیاں یکے بعد دیگرے گزرتی گئیں۔ ہر آزمائش پہلی سے سخت اور تلخ تھی۔ آزمائشوں اور ابتلاء کا سلسلہ لگا تار، دشوار تر اور دردناک تر ہوتا گیا۔ دھمکیوں، دشمنیوں، تکلیفوں، بھوک اور زندگی کی سختیوں کی تمام بھٹیوں سے گزارا گیا۔

ایک دن انہوں نے سنا کہ ان کے بابا جان پر اونٹ کی غلاظت پھینکی گئی ہے اور آپؐ کے لباس مبارک کو گندگی سے آلودہ کردیا گیا ہے۔ وہ فوراً اپنے والد گرامی کی خدمت میں پہنچتی ہیں اور اپنے باپ کے لباس کو صاف اور پاک کرتی ہیں۔ دوسرے دن انہیں یہ خبر ملی کہ ان کے باپ کے پاؤں کو پتھر مار کر زخمی کر دیا ہے۔ ان تمام زیادتیوں کا جیسا کہ دشمن لوگ چاہتے تھے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ نہ حضور اکرمؐ اپنی دعوت و تبلیغ سے دست بردار ہوتے ہیں اور نہ آپ کے اصحاب آپؐ کا ساتھ چھوڑتے ہیں۔ کچھ مدت کے بعد شکست خوردہ اور غم و غصے سے بھرے قریش ایک زیادہ سخت فیصلہ کرتے ہیں اور وہ فیصلہ بنی ہاشم کے اقتصادی و معاشرتی بائیکاٹ کا تھا کہ انہیں معاشی اور معاشرتی طور پر محاصرہ میں لیا جائے۔ بھوک اور لوگوں سے قطع تعلق انہیں اچھا سبق سکھائے گا۔ اگر یہ کچھ مدت تک اسی حالت میں رہے تو اکتا جائیں گے اور آخر کار تنگ آکر اپنے آرام و سکون کی خاطر ہی سہی، محمدؐ کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اس وقت محمدؐ کے سامنے دو راستے ہوں گے یا اپنے مشن سے ہاتھ اٹھالیں گے یا قریش کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔ مکہ سے کچھ فاصلے پر

---

(۱) اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ... (فصلت۔ ۳۰) تحقیق جو کہتے ہیں۔ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر ثابت قدم رہتے ہیں ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں ....

موجود شعب ابی طالب کا شہر بدر کیئے جانے والے افراد کے لئے انتخاب کیا گیا۔ ان کے ساتھ خرید و فروخت اور ملنا جلنا سب بند کر دیا گیا۔ ان تک غذا، خوراک اور لباس پہچانے کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ بنی ہاشم کتنی مدت تک اس وحشتناک گھائی میں رہے؟ یہ صحیح طور پر معلوم نہیں۔ ابن ہشام نے یہ مدت دو یا تین سال لکھی ہے۔ اس دوران میں حضرت زہرا (س) پر کیا گزری؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس زندگی کا زیادہ تر بھاری بوجھ ان کے کندھوں پر تھا۔ لیکن ان سب تکلیفوں سے زیادہ سخت اور دردناک غم عزیزوں کی وفات کا تھا۔

حضرت خدیجہ (س)
اور حضرت ابو طالب (ع) کی وفات

تقدیر الٰہی تھی کہ اسلام کی پہلی مسلمان خاتون اور ایثار و قربانی کا مجسمہ بی بی جناب خدیجہ کبریٰ اور حضرت ابو طالب کی وفات تھوڑے وقفے کے ساتھ ایک ہی سال میں ہوئی (۲) فاطمہ زہرا (س) نے قرآن سے درس سیکھا تھا۔ انہیں اس آزمائش سے بھی گزرنا تھا۔ اپنے عزیزوں کی جدائی ان کے لیے ایک اور امتحان تھا۔ انہیں ان مشکلات و تکالیف کو تحمل و برداشت کرنااور اپنے رب کی بشارت کا انتظار کرنا تھا۔(۳) پہلی آزمائش جسمانی تھی، لیکن یہ روحانی طاقت کا امتحان ہے۔ حضرت خدیجہ گھرمیں ان کے باپ کی غم خوار تھیں اور حضرت ابو طالب گھر سے باہر دشمنوں کے مقابلے میں آپؐ کی حمایت کرتے تھے۔ حضرت ابو طالب کے ہوتے ہوئے مشرکین مکہ آپؐ کی جان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے، کیونکہ ان کا خاندان (قبیلہ بنی ہاشم) بہت بڑا تھا۔ اگرچہ ان کے پاس بنی زہرہ یا بنی مخزوم یا بنی حرب جیسی دولت اور طاقت تو نہ تھی لیکن شرافت و بزرگواری میں کوئی قبیلہ ان کے ہم پلہ نہ تھا۔ مکے کے سردار اور مالدار لوگ یہ جانتے تھے کہ اگر وہ محمدؐ کی جان کے درپے ہوں تو بنی ہاشم خاموش نہیں بیٹھیں گے اور چہ بسا دوسرے قبائل اور طوائف بھی ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ انہوں نے مجبوراً اپنے سینوں کے اندر بغض و کینے کی آگ کوانہیں آزار و تکلیف دے کر ٹھنڈا کیا۔ دشنام، تمسخر، گالی گلوچ، طعنہ زنی، منہ چڑانا، پتھر مارنا، اور تہمتیں لگانے کے حربے وہ بزدل استعمال کرتے تھے۔ تقدیر کا لکھا تھا کہ ان سب چیزوں کو فاطمہ زہرا(س) دیکھیں اور یہ تمام

---

(۱) ابن ہشام ج ۱ ص ۳۷۵

(۲) کلینی کے بقول حضرت طالب کا انتقال حضرت خدیجہ کی وفات سے ایک سال بعد واقع ہوا۔ اصول کافی ج ۱ ص ۴۴

(۳) وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ (بقرۃ: ۱۵۵ ـ ۱۵۶) ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیجئے۔ جو مصیبت میں مبتلا ہونے کی صورت میں کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔

مصائب و مشکلات جھیلنے کے بعد یہ دو صدمے بھی برداشت کریں۔

اب جناب فاطمہ (س) اس گھر کی لڑکی نہیں ہے۔ وہ اب عبداللہ، عبدالمطلب، ابو طالب، اور خدیجہ کی جانشین ہے۔ ام ابیھا (اپنے باپ کی ماں) ! کیسی مناسب کنیت ہے۔ اب انہیں اپنی ماں والے فرائض ادا کرنا ہیں۔ وہ اپنے باپ کے لئے بیٹی کا کردار بھی ادا کرے گی اور ماں کے فرائض بھی انجام دے گی۔

اگر ہم اس بات کو قبول کریں کہ حضرت زہرا (س) کی ولادت بعثت سے پانچ سال پہلے ہوئی ہے تو اس صورت میں ان کے اسی ماں والے کردار کی وجہ سے سترہ سال تک ان کی شادی نہ ہو سکی یا انہوں نے کرنا نہ چاہی۔ وہ اپنے باپ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ جس قدر ہو سکے گھر کے اندر رسول اکرمؐ کو آرام و سکون بہم پہنچائیں۔ کیونکہ اب پیغمبر اکرمؐ کے پاس خدیجہ جیسی ہمدرد اور غم خوار ہستی نہیں ہے اور نہ ابو طالب جیسا حمایت کرنے والا سرپرست ہے۔ اب مشرکین کی دشمنی شدت اختیار کر گئی ہے۔ انہیں دلجوئی کی ضرورت ہے اور رسول خداؐ بھی ان کے ایثار و فدا کاری کے جذبے کو دیکھتے ہوئے محبت و مہربانی کے ساتھ اپنی رضا و خوشنودی کا اظہار فرماتے۔ ان واقعات کے کئی سالوں بعد جب حضرت عائشہ سے پوچھا گیا کہ وہ جنگ جمل میں کیوں آئیں تو انہوں نے کہا کہ اس داستان کو نہ دھرایئے گا۔(۱) انہوں نے کہا کہ میں نے فاطمہؑ کے بابا کے سوا فاطمہ (س) سے زیادہ کسی کو سچا نہیں پایا۔ (۲) ممکن ہے ان افراد کے ذہنوں میں، جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اہل بیت کی سیرت کا دقیق مطالعہ اور تحقیق نہیں کی یا جنہوں نے شریعت محمدیؐ اور اسلام کی روح کو جیسا کہ چاہیے تھا لمس نہیں کیا، یہ بات آئے کہ یہ محبت جبلت انسانی کے تحت ہر باپ کی اپنی اولاد سے محبت کی طرح ہے۔ ایک لحاظ سے ان کا خیال شاید صحیح ہو کیونکہ ہم یہ نہیں کہتے کہ فاطمہ زہرا (س) سے رسالتمآبؐ کی محبت شفقت پدری کے جذبے سے خالی تھی۔ کیونکہ حضرت محمدؐ باپ تھے اور حضرت فاطمہ (س) ان کی بیٹی تھیں۔ لہذا باپ بیٹی کا رشتہ موجود تھا لیکن مذکورہ روایت اور تھوڑے بہت الفاظ کے اختلافات کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول دیگر روایات ایک اور حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ پیغمبر اکرمؐ کے دور اور بعد کے اکابر اسلام کی نگاہوں میں حضرت زہرا (س) کی عظمت و بزرگی ہے۔ جناب فاطمہ (س) کو یہ مقام و مرتبہ صرف اس وجہ سے نہیں ملا کہ وہ رسول اللہؐ کی بیٹی ہیں۔ جس چیز نے انہیں اس بلندی تک پہنچایا وہ ان کا ایثار، پارسائی، زہد، دانش اور دوسرے انسانی ملکات ہیں جو ان میں حد کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ سب شیعہ و

---

(۱) بحار ج ۴۳ ص ۲۳ از امالی شیخ طوسی

(۲) مناقب ج ۱ ص ۳۶۲

سنی مؤرخین نے ان کے ان فضائل اور امتیاز کو اپنی معتبر کتب میں بیان کیا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ بعض لوگ آپ سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں جو ناقابل قبول ہے۔ وہ کہتے ہیں:

فاطمہ (س) کی ناراضگی سے اللہ تعالی ناراض ہوتا ہے۔'' (۱)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

کیا تمہاری کتابوں میں یہ حدیث موجود نہیں ہے کہ بندہ مؤمن کی ناراضگی سے خدا ناراض ہو جاتا ہے؟

انہوں نے جواب دیا: ''کیوں نہیں۔''

امامؑ نے فرمایا:

پس تمہیں اس بات پر کیوں اعتبار نہیں آتا کہ فاطمہ (س) ایک با ایمان خاتون ہوں اور ان کے ناراض ہونے سے خدا بھی ناراض ہو جائے۔(۲)

حضرت خدیجہ اور حضرت ابو طالب کی وفات نے رسول اکرمؐ کو بھی سخت رنجیدہ اور غمزدہ کر دیا۔ آپؐ اب اپنے آپ کو تنہا اور کسی غم خوار اور پشت پناہ کے بغیر محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ان تمام حالات میں خدا آپؐ کا مددگار تھا اور اللہ کی بندگی کی دعوت آپؐ کا شعار تھا۔ آپؐ نے طائف کا سفر اختیار کیا، اس امید پر کہ اس شہر کے طاقتور قبیلے ثقیف کے افراد میں سے کسی کو شاید الٰہی دین میں داخل کر سکیں۔ لیکن وہاں کے سرداروں اور دیگر لوگوں نے نہ صرف آپ سے برا سلوک کیا بلکہ آپ کو اتنی تکلیف دی اور اتنا ستایا کہ آپؐ لہولہان ہو گئے۔

الٰہی دین کی اس شمع کو بجھانے کے لئے اہل مکہ نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن اس سے انہیں کچھ حاصل نہ ہوا۔ ہر روز صدائے اسلام میں قوت آتی گئی اور روز نئے نئے افراد کے کانوں تک اس کی گونج سنائی دینے لگی۔ مشرکین قریش کا آخری حربہ یعنی معاشی بائیکاٹ بھی ناکام ہو گیا۔ یہاں تک کہ قوم کے لیڈروں نے خود اس معاہدہ کو توڑ دیا۔ اب انہوں نے ایک اور فیصلہ کیا۔ اب جبکہ مکہ میں محمدؐ کا کوئی حامی و ناصر، یعنی حضرت ابو طالب نہیں ہے، لہٰذا اب ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ البتہ ان کے قتل میں سب قبائل شریک ہوں تا کہ بنی ہاشم ان کا انتقام اور قصاص کسی سے نہ لے سکیں۔ لیکن شیطانی مکر و فریب کو تقدیر الٰہی کے سامنے دوام نہیں ہے۔ ان کی سازش سے کچھ مدت پہلے دعوت اسلام کا مرکز مکہ سے پانچ سو کلومیٹر دور شہر یثرب میں منتقل ہو چکا تھا یا اس سے بہتر

---

(۱) خوارزمی ج ۱ ص ۶۰

(۲) بحار ص ۲۲ ج ۴۳

الفاظ میں یوں کہیں کہ اسلام کی دعوت و اشاعت کے لئے ایک جدید مرکز کھل گیا تھا۔ فاطمہ زہرا(س) کے بابا کے اصحاب ایک ایک کر کے یا گروہ کی شکل میں اپنے گھربار چھوڑ کر یثرب کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ یثرب کے لوگوں نے، جنہیں اس کے بعد تاریخ اسلام میں ''انصار'' کا لقب دیا گیا، ان ہجرت کرنے والے مسلمانوں کا نہایت پرتپاک استقبال کیا اور ان کی ہر ضرورت کو پورا کیا۔ یہاں تک کہ اپنے آپ پر انہیں ترجیح دی۔ جس رات قریش نے اپنی سازش کو عملی جامہ پہنانے کا منصوبہ بنایا کہ پیغمبر اسلامؐ کو تمام قبائل پر مشتمل گروہ قتل کر دے، آنحضرتؐ نے اپنے بستر پر حضرت علیؑ کو سلا دیا اور خود حضرت ابو بکر کے ساتھ یثرب کا سفر اختیار کیا۔ یہ وہی عظیم واقعہ ہے جو چند سالوں بعد مسلمانوں کی تاریخ کا مبداء قرار پایا اور آج تک '' تاریخ ہجری'' کے نام سے رائج ہے۔

مدینے میں آہستہ آہستہ تمام امور سنبھلنے لگے۔ ایک مسجد بن گئی۔ مہاجرین اپنے نئے گھروں میں آباد ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے جناب فاطمہ (س) کو ہجرت کا حکم دیا۔ بلاذری لکھتے ہیں: زید بن حارثہ اور ابو رافع سیدہ فاطمہؑ (س) کو لے آئے۔(۱) لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ عباس بن عبدالمطلب کو فاطمہ (س) کے لانے پر مامور کیا گیا تھا۔ (۲) بہرحال سیدہ زہرا اپنے لانے والے کے ساتھ اپنی سواری پر سوار ہوئیں۔ قافلے نے سفر شروع کر دیا۔ اس دوران میں حویرث بن نقید جو حضورؐ کا بڑا سخت دشمن تھا اور ہمیشہ آپؐ کی بدگوئی کرتا تھا، قافلے کے پاس آیا اور اس نے ان کے اونٹ کو زخمی کر دیا۔ اونٹ بدک گیا اور فاطمہؑ (س) گر پڑیں۔ ابن ہشام اور دیگر مؤرخین نے اس حادثے میں حضرت زہرا (س) کو پہنچنے والے کسی ضرر کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں انہیں کچھ نہ کچھ ضرور ضرر پہنچا ہو گا۔ اس پست فطرت شخص کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے، جن کے بارے میں فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ یہ افراد اگر خانہ کعبہ کے غلاف سے بھی چمٹے ہوئے ہوں تو پھر بھی ان کا خون بہایا جائے۔ حویرث، فاطمہ (س) کے شوہر نامدار حضرت علی(ع) کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا۔(۳) ان اسناد کے برخلاف درجہ اول کے مورخ یعقوبی لکھتے ہیں کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو حضرت علی علیہ السلام مدینہ سے لائے تھے۔ (۴) البتہ شیعہ روایات یعقوبی کے قول کی تائید کرتی ہیں۔ آخر کار وعدہ الٰہی پورا ہوا۔ مسلمان، مشرکوں اور دشمنوں کے شر سے آسودہ خاطر ہوئے۔ تاریخ اسلام میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد وہ نہ صرف اپنے مذہبی مراسم اور عبادات بغیر خوف و خطر اور مکمل آزادی کے ساتھ انجام دے سکتے تھے، بلکہ اب وہ اس پوزیشن میں تھے کہ دوسروں کو بھی دین حق قبول کرنے کی دعوت دیں اور اگر وہ قبول نہ کریں تو پھر ان سے جنگ کریں۔

---

(۱) انساب الاشراف ص ۴۱۳ و ۲۶۹ (۲) ابن ہشام ج ۴ ص ۹ (۳) ابن ہشام ج ۴ ص ۳۰ (۴) ج ۲ ص ۳۱

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب:۲۱)

بتحقیق تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔

مہاجرین کو مدینے آئے ہوئے دو سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا۔ ان دو سالوں میں مسلمانوں کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں قابل ذکر تبدیلیاں ہوئیں۔ اسی طرح بعض سریہ (۱) پیش آئے جن میں مسلمانوں کو فتح و کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے امور میں کچھ آسانیاں پیدا ہو گئیں اور مخالف قبائل کے سامنے مسلمانوں کی حیثیت و طاقت میں اضافہ ہوا۔ اسی طرح وہ چند قبائل جو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان لڑائی میں حالت تردد میں تھے وہ یا تو غیر جانبدار ہو گئے یا مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے اور یہی حال منافقین مدینہ کا تھا۔

ان سب سے بڑی اور اہم کامیابی غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح تھی۔ جس نے مکہ کی افسانوی قدرت و طاقت کو درہم برہم کر دیا اور قریش کے سرداروں کی شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا۔ وہ افراد، قبائل جو ابھی تک مکہ والوں کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتے تھے، سمجھ گئے کہ قریش اور ان کے تاجر بھی قابل شکست ہیں۔

رسول اکرمؐ کی گھریلو زندگی میں بھی تبدیلی آئی۔ زمعۃ بن قیس کی بیٹی حضرت سودہ اور حضرت ابو بکر کی بیٹی حضرت عائشہ آپ کی بیویاں بن کر آپ کے گھر آ گئیں. حضرت سودہ کی شادی ہجرت سے چند ماہ پہلے ہوئی۔(۲) جبکہ حضرت عائشہ کی شادی ہجرت کے پہلے سال ماہ شوال میں انجام پائی۔ (۳) اگرچہ ان دونوں بیویوں میں سے کوئی بھی حضرت خدیجہ کی کمی حضرت فاطمہ زہرا(س) اور

---

(۱) رسول اللہؐ کے زمانے میں آپؐ کے حکم سے مسلمان ایسی جنگوں میں شریک ہوئے جن میں آپؐ نے بذات خود شرکت نہیں فرمائی، جنہیں سریہ کہا جاتا ہے۔

(۲) بلاذری۔ انساب الاشراف ص ۱۰۷

(۳) ایضاً ص ۴۰۹

حضور پاکؐ کی نظر میں پورا نہ کر سکتی تھی لیکن پھر بھی وہ آنحضرتؐ کا خیال رکھتیں۔ اب اس لحاظ سے جناب زہرا کو اپنے والد گرامی کے حوالے سے پریشانی نہ تھی۔ حضرت عائشہ کی عمر نو سال تھی اور حضرت سودہ سکران بن عمرو بن عبد شمس کی بیوہ تھیں۔ سکران نے حبشہ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے دوسرے گروہ کے ساتھ ہجرت کی۔ حضرت سودہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔(۱) مکہ واپس آنے کے بعد سکران فوت ہو گئے تو حضرت سودہ سے آپؐ نے نکاح کر لیا۔ اب اگر حضرت فاطمہؑ (س) کی شادی ہو جائے اور وہ اپنے شوہر کے گھر سدھار جائیں تو ان کے والد کا خیال کرنے والے موجود ہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ جناب فاطمہ زہرا (س) کے رشتہ کے خواہاں کئی افراد تھے۔ اس بارے میں روایات کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے والد کا مقام اعلان نبوت سے پہلے اپنی قوم میں بہت بلند اور ارجمند تھا۔

جناب فاطمہ (س) کی تربیت وحی کے زیر سایہ مرکز نزول قرآن میں ہوئی تھی۔ جیسا کہ آپ اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے اور اس کے مآخذ پہلے درجے کی اسلامی تاریخ ہے۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر بھی جناب فاطمہؑ کے خواستگاروں میں سے تھے۔ جب انہوں نے رسالتمآبؐ کی خدمت میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ کے فیصلے کا منتظر ہوں۔(۲) اہل سنت کے بہت بڑے محدث امام نسائی اپنی کتاب سنن میں کہتے ہیں: پیغمبر اسلام نے ان کے جواب میں فرمایا: "فاطمہ (س) چھوٹی ہیں۔" جب حضرت علیؑ نے خواستگاری کی تو آپؐ نے قبول فرما لیا۔(۳) البتہ اس حدیث کو ایسے باب میں نقل کیا جس کا عنوان ہے: "عورت و مرد کا ہم عمر ہونا۔" مذکورہ دو اصحاب کا نام اس لئے بیان کیا جاتا ہے کیونکہ یہ دو، باقی اصحاب کے لحاظ سے زیادہ معروف اور مشہور ہیں، نہ اس لئے کہ نبیؐ کی بیٹی کے لئے انہی دو بڑی عمر کے بوڑھے مردوں کے رشتے آئے۔ یعقوبی نے لکھا ہے کہ مہاجرین میں سے کئی افراد نے آپؐ سے فاطمہ (س) کا رشتہ مانگا۔(۴) جناب فاطمہ (س) کی خواستگاری اور حضرت علی علیہ السلام سے ان کی شادی کے حوالے سے جو ہم بیان کریں گے، وہ سب کچھ اور شیعہ اور سنی کتب میں آ چکا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بعض روایات ملتی ہیں لیکن ان کا مفہوم اور مطلب بھی یہی ہے۔ شاید تھوڑا بہت اختلاف روایات کے الفاظ میں موجود ہو۔ یہ روایات اور جو کچھ بلاذری،

---

(۱) انساب الاشراف ص ۴۱۹۔ الاصابہ ج ۴ ص ۱۰

(۲) ابن سعد طبقات ج ۸ ص ۱۱۔

(۳) سنن ج ۶ ص ۶۲۔ فاطمۃ الزہراء ص ۲۰۵ ج ۲۔

(۴) یعقوبی ج ۲ ص ۳۱

اسحاق، ابن ہشام، طبری جیسے مؤرخین اور کلینی، مفید اور شیخ طوسی جیسے علماء نے تحریر کیا ہے، بعد کے مصنفین کے لئے واحد اسناد و مآخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ شیعہ ہو یا سنی مغربی ہو یا مشرقی جو بھی ان پہلی اور دوسری صدی ہجری کے واقعات کے بارے میں کتاب لکھنا یا تحقیق کرنا چاہے، اسے انہی کتابوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس کتاب کے مصنف نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔ اگر مستشرقین کی کتاب میں ایسا مطلب یا بات نظر آئے جو ان بنیادی کتابوں میں نہ ہو تو اسے رد کر دینا چاہیے یا کم از کم اس کی صحت میں شک کرنا چاہیے۔ ہمیں ہر گز نہیں کہنا چاہیے کہ شاید ان کے پاس ایسے مدارک ہوں جو ہماری دسترس میں نہ ہوں۔ کون سے مآخذ؟ انہوں نے ان مآخذ کو کہاں سے حاصل کیا؟ صدر اسلام کی تاریخ لکھنا، ایشیائی اور حمیری تہذیبوں کے بارے میں تحقیق کی طرح نہیں یا دور ہخامنشی کی پتھروں پر کندہ تحریروں کو پڑھنا نہیں یا انیسویں اور بیسویں کی سائنسی ایجادات پر ریسرچ نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ ان غیروں کے پاس ایسے وسائل ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اس قسم کی تصدیقات یکطرفہ اور اندھی تقلید کہلا سکتی ہیں۔ جس کی وجہ احساس کمتری یا ان کاآلہ کار بننا یا مختلف کتب اور مدارک کی طرف رجوع اور تحقیق کرنے کی فرصت یا ہمت کا نہ ہونا ہے۔

البتہ ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ بعض موارد میں تاریخی واقعات اور مسائل کے تجزیہ و تحلیل میں مغرب کے محققین کی روش بعض گزشتہ مشرقی مؤرخین کی روش سے زیادہ عمیق اور گہری ہے۔ لیکن جہاں اصل واقعہ درجہ اول کی اسناد کے ساتھ واضح طور پر موجود ہو، وہاں نص کے مقابلے پر اجتہاد معنی نہیں رکھتا۔

ہمیں ان مستشرقین سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے جو حقیقت تبدیل کر دیتے ہیں یا حقائق کی اس طرح تاویل و تفسیر کرتے ہیں جو ان کے عقیدے (یہودیت یا عیسائیت) کے مطابق ہو۔ ان سے شکوہ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ کیونکہ یہ لوگ معذور ہیں۔ ہمیں تعجب تو اپنے تاریخ دان دوستوں پر ہوتا ہے جو مکمل طور پر ان کے اقوال و بیانات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو مسلم حقیقت اور ناقابل اعتراض سمجھ لیتے ہیں۔ جب ان کے سامنے ان محققین کی غلطیوں کو رکھا جاتا ہے تو وہ یہ بہانہ کر کے ان سے چشم پوشی اختیار کر لیتے ہیں کہ ان کا ہم پر استاد والا حق ہے۔ اس کم ہمتی، سہل انگاری یا ناآگاہی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تاریخ اسلام کے اکثر شعبوں پر یہودی مستشرقین کا قبضہ ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں لکھتے ہیں۔ پھر ان کا عربی اور فارسی ترجمہ ہوتا ہے اور وہ مسلمان مؤرخین کی تحقیقات کا منبع قرار پاجاتا ہے۔

کبھی کبھار ہمارے ایرانی برادران عربوں کے بارے میں حسن ظن سے کام لیتے ہوئے ان کی کتابوں کا بلا تبصرہ اور کسی قسم کا اظہار نظر کئے بغیر عربی سے فارسی میں ترجمہ کر دیتے ہیں۔ پھر یہی تحریریں ان افراد کے لئے منبع علم قرار پاتی ہیں جو صدر اسلام کی تاریخ سے کما حقہ واقفیت نہیں

رکھتے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

> چونکہ فاطمہ (س) بدصورت تھی اس لیے سترہ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ باپ کے گھر بیٹھی رہیں اور کوئی ان کا رشتہ لینے نہ آیا۔ ایک دن ان کے باپ نے آ کر بتایا کہ علیؑ رشتہ لینے آئے ہیں تو انہوں نے اظہار تعجب کرتے ہوئے کہا: کیا ایسا ممکن ہے؟

نعوذباللہ! حقیقت کی پردہ پوشی، جنگ جوئی اور بد طینی انسان کو کس مقام تک لے جاتی ہے؟

اس قسم کے دانشور اور محققین چاہتے ہیں کہ تاریخی واقعات کا جدید علوم کی روشنی میں تجزیہ و تحلیل کریں۔ لیکن اس علم کو انہوں نے کس ماخذ سے اور کس طرح سیکھا؟ یہ معلوم نہیں۔

اگر رسول اللہؐ کی لخت جگر کی ولادت بعثت کے پانچویں سال ہوئی ہو تو اس وقت یہ مسئلہ پیش ہی نہیں آتا اور اگر ان کی ولادت بعثت کے پانچ سال پہلے ہو اور سترہ سال کی عمر میں شادی ہو تو اس کی دلیل ہم نے بیان کر دی ہے کہ مسلمانوں کی معاشرتی صورتحال، ہر قسم کا ڈر اور خوف، مشکلات و مصائب ہر کام میں رکاوٹیں، حبشہ کی طرف ہجرت، ایک طرف بنی ہاشم کا معاشی و معاشرتی بائیکاٹ، دوسری طرف ان کی ذاتی زندگی پر اثر انداز ہونے والے حادثات، مثلاً والدہ حضرت خدیجہ اور باپ کے چچا ابو طالب کی وفات، اس قسم کے حالات انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی شادی کے بارے میں سوچتیں۔

وہ نہیں چاہتی تھیں کہ والدہ کی وفات کے بعد ان کے بابا کے گھر میں کوئی غمخوار اور ہمدرد نہ ہو۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ چند معتبر روایات ان کی ولادت کے بارے میں بیان کرتی ہیں کہ بعثت کے پانچویں سال ہوئی۔ اگر حقیقت یہ ہو تو یہ کہانی بالکل درست نہیں ہے اور اگر ہم اس روش کو نظرانداز کر کے ایک سمجھ دار اور دانشور مصنف کا طرز عمل اختیار کریں اور واقعات کی چھان بین جدید تحقیقات کی روشنی میں اور معاشرتی نظر سے کریں تو پھر بھی وہ نتیجہ نہیں نکلتا جو اس مستشرق نے اخذ کیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ:

بالعموم مؤرخین اور سیرت نگاروں نے حضرت محمدؐ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپؐ کا چہرہ خوبصورت تھا اور جسم انتہائی مناسب ڈیل ڈول والا تھا۔ اسی طرح حضرت خدیجہ جہاں تک میں جانتا ہوں ایک خوبصورت اور حسین عورت تھیں۔ فطری طور پر خوبصورت والدین کی اولاد بھی اچھی شکل و صورت والی ہوتی ہے۔

سیرت نگاروں نے عمومی طور پر دوسری اور تیسری نسل تک ہاشمی لڑکیوں کی خوبصورتی اور چہرے کے حسن کو بیان کیا ہے۔ جب حسن بن حسنؑ اپنے چچا امام حسین علیہ السلام کے پاس ان کی دو بیٹیوں میں سے ایک کا رشتہ مانگنے گئے اور امام حسین علیہ السلام نے فرمایا ان دو میں سے جس کا رشتہ

چاہو لے سکتے ہو۔ حسن شرم کی وجہ سے چپ رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ امام حسین علیہ السلام نے خود فرمایا: فاطمہ(س) کو تمہارے لئے منتخب کرتا ہوں جو کہ میری ماں کی شبیہ ہیں۔(۱)جہاں تک معلوم ہے یہ فاطمہ(س) خاص حسن و جمال کی مالک تھیں۔(۲)شیخ مفید نے لکھا ہے کہ یہ بی بی اتنی خوبصورت تھیں کہ انہیں حور سے تشبیہ دی جاتی تھی۔(۳)

اب اس بڑے مستشرق ''دانشور'' کا علمی انکشاف کس بنیاد اور کس مآخذ پر ہے؟ جو ہر واقعہ کی جدید علوم کی روشنی میں تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ نص کے مقابلے میں اجتہاد اور متن تاریخ میں ملاوٹ نہیں ہے؟۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے یا عربی سے عدم واقفیت کی بنا پر؟ ہم نہیں جانتے۔ لیکن اس عنوان سے کہ ''دروغ گو را حافظہ کم است''یعنی جھوٹے آدمی کی یادداشت کمزور ہوتی ہے، مصنف موصوف اپنی کتاب میں جعل و افتراء، جھوٹ اور اپنی غلطیوں کے نشانات چھوڑتا ہے۔ اس نے اپنا مآخذ بلاذری کی کتاب کو قرار دیا ہے اور سب جانتے ہیں کہ اصولی طور پر اس کی مشہور کتاب انساب الاشراف ہے۔ کتاب ابھی میرے پاس موجود ہے۔ اس میں یہ عبارت موجود ہے:

> پیغمبر اکرمؐ نے جناب زہرا سلام اللہ علیہا سے فرمایا کہ خاندان میں سب سے پہلے آپؑ مجھ سے آملیں گی۔(۴) جناب سیدہ کے جسم میں جھرجھری آئی۔ رسول پاکؐ نے فرمایا: کیاآپ نہیں چاہتیں کہ جنت کی عورتوں کی سردار بنیں۔ جناب زہرانے تبسم فرمایا۔

نہیں معلوم اس مستشرق نے اپنی علمی تحقیق کا نتیجہ اخذ کرنے میں ان دو روایتوں کو گڈمڈ کر دیا ہے یا جیسا کہ ہم نے لکھا کہ عربی سے کم آگاہی موجب بنی کہ وہ فاش غلطی کا ارتکاب کرے؟ یا زیادہ ''ایماندار'' مستشرقین کی طرح کسی خاص مشن پر مامور ہے؟ اور اس نے اپنا فرض نبھایا ہے۔ بہر حال ان میں سے کوئی بھی سبب ہو، نتیجہ ایک ہی ہے۔ ہم نے مستشرقین یا مشرق کے بارے میں مغربیوں سے زیادہ واقف مشرقی افراد کی کتابوں میں ایمانداری سے فرائض کے نبھانے کی بہت سی مثالیں دیکھی ہیں۔

اہل بیت اطہار کی محبت میں نسل در نسل زندگیاں گزارنے والے قارئین ایسے دشمنوں کے

---

(۱) مقاتل الطالبین ص ۱۸۰ نیز ملاحظہ فرمائیں اغانی ج ۱ ص ۱۴۲ و ارشاد مفید ج ۲ ص ۲۲۔ نسب قریش ص ۵۱۔

(۲) نسب قریش ص ۵۱۔

(۳) ارشاد ص ۲۲ ج ۲۔

(۴) انساب الاشراف ص ۴۰۵ (فوجمت)

بیانات اور اقوال یا ایسے کج فکر افراد کی علمی ابحاث کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ممکن ہے یہ لوگ ہم پر اعتراض کریں کہ مذکورہ موضوع کے بارے میں اس کی اسناد، مصادر کے متعلق اتنی تحقیق اور بحث کی کیا ضرورت ہے؟ درست نہیں، ان لوگوں نے محبت اہل بیت کو ماؤں کے دودھ کے ساتھ پیا ہے اور اسے سینے سے لگائے قبر میں جائیں گے۔ وہ ایسے فضول قسم کے محققین کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے اور شاید کبھی بھی ان کی تحریریں نہ پڑھیں۔ لیکن یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اہل بیت اطہار کی سیرت پر لکھی جاتے والی یہ اور اس طرح کی دیگر کتابیں سب کے لئے لکھی گئی ہیں۔

اسے افسوس کے ساتھ لکھوں یا مایہ خوش بختی کہوں کہ سو سال یا اس سے زیادہ عرصہ گزرا ہے کہ ہماری ثقافت مغربی ثقافت سے نزدیک ہوئی ہے اور بعض جگہوں پر آپس میں مخلوط ہو چکی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سالوں سے مغربی محققین اور مستشرقین میں سے ہر ایک یا ہر گروہ اسلام کی تہذیب و تمدن اور ثقافت کے ہر شعبے میں ریسرچ کر رہا ہے اور اس بارے میں کتابیں لکھ رہا ہے۔ اسلامی تہذیب اور ثقافت اور بڑی بڑی اسلامی شخصیات کے بارے میں یورپ اور امریکہ کے اسلام کے متعلق تحقیقاتی مراکز میں ہر سال کئی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ حضرت محمدؐ، بعض آئمہ علیہم السلام اور جناب زہرا سلام اللہ علیہا کی حیات طیبہ کے بارے میں بہت ساری کتابیں ان مراکز سے چھپ چکی ہیں۔ ان میں سے بعض کا فارسی میں ترجمہ کیا جا چکا ہے یا ان کتابوں سے اقتباسات کو فارسی میں بیان کر دیا گیا ہے۔

لامنس، گلڈزیہر، دورمنگام، لوئی ماسینیون، برنارڈ لوئیس، پڑو شوفسکی، رونیلسن، گیب اور دسیوں دیگر مستشرقین کی کتابوں کے تراجم تہران اور دوسرے شہروں میں بک سٹالوں پر دستیاب ہیں۔

ان میں سے اکثر علمی خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ''بلاشر'' جیسا دانشور اور محقق جس نے اپنی ساری زندگی قرآن کے فرانسیسی زبان میں ترجمے میں صرف کر دی، اس نے اپنے ترجمے میں کسی قسم کا تبصرہ اور اظہار نظر کئے بغیر سورہ نجم میں دو آیتوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ وہی دو آیات جنہیں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں کہانیاں گھڑنے والوں اور افسانہ نگاروں نے جعل کیا اور دشمنان اسلام کے لئے ایک دستاویز اور ثبوت فراہم کیا۔ مصنف نے تیس سال پہلے افسانہ غرانیق کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا ہے۔ اس مقام پر ''بلاشر'' کی بدبختی کو اتفاق سے میں نے دیکھا ہے۔ کیا دوسرے مقامات پر بھی اس نے ایسا کام کیا ہے؟ اللہ بہتر جانتا ہے۔

اپنے ہم وطنوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو اپنے خیال و گمان کے تحت اسلام کو سائنسی اور فلسفے کے آئینے میں سمجھنا اور جاننا چاہتے ہیں۔ وہ ان مستشرقین اور ایران شناس لوگوں کی کتابوں کو

اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور انہی پر ان کی تحقیقات کا دارومدار ہوتا ہے۔ آخر کار اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ غلط ترجمہ کی بناء پر فِصَلِ ابن حزم، حضرت علی ابن ابی طالب کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا سرمایہ دار قرار دیتا ہے۔ اب ابن حزم نے یہ انکشاف کیسے کیا اور اس کا منبع کیا ہے؟ مصنف اسے اہمیت نہیں دیتا، لیکن ممکن ہے کچھ عرصے بعد یہی کتاب اسلام اور عربی سے صحیح واقفیت نہ رکھنے والے افراد کے لئے تحقیقات کی سند قرار پائے۔

اس کے باوجود میں ان کتابوں کے محترم مترجمین کی قدردانی کرتا ہوں۔ اگر کسی مکتب فکر سے ان کا نظریاتی لگاؤ نہیں ہے تو ان سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ایک اور زحمت بھی گوارا کریں کہ ان کتب کے مندرجات اور مطالب کو پہلے درجہ (پانچویں صدی ہجری کے آخر تک) کی کتابوں کے مطالب کے ساتھ موازنہ کریں۔ خدانخواستہ وہ نادانستہ طور پر کسی ایک یا کئی افراد کی گمراہی یا حقیقت سے دوری کا موجب نہ بنیں۔

ان مستشرقین کے بعض مقالات اور کتابوں کا عربی ترجمہ ہو چکا ہے اور چونکہ ایرانی عرب مترجمین اور مصنفین پر حسن ظن رکھتے ہیں، اس لئے انہوں نے ان تراجم کو آنکھیں بند کر کے فارسی میں منتقل کر دیا ہے۔ میں کم و بیش ان تراجم کے کمزور نقاط اور خامیوں سے آگاہ ہوں، لیکن میں پھر بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ سب مؤلفین کج فکر یا اسلام دشمن ہیں۔

ممکن ہے عربی زبان سے کم واقفیت کی بناء پر یا تعصب سے عاری روایات و اسناد کی عدم دستیابی کی وجہ سے انہوں نے ایسے نتائج اخذ کئے ہوں۔ لیکن ان میں سے بعض کو میں قریب سے جانتا ہوں یا ان سے اس بارے میں گفتگو کر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ دلوں میں مسلمانوں سے ایسا کینہ وعناد رکھتے ہیں کہ اسے کبھی بھی فراموش نہیں کریں گے۔ کیوں؟ اس کا سبب خود ان سے پوچھنا چاہیے۔

میں ایک اسلام شناس دانشور کو جانتا ہوں جو اپنے شعبے میں لاثانی یا کم نظیر ہے۔ چند یورپی زبانوں میں مہارت کے علاوہ عربی زبان سے اس نے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اس بنیاد پر اسے اسلام کی روح اور اس دین کے اصول و قوانین سے صحیح معنوں میں آگاہ ہونا چاہیے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ فاتحان عرب سب یکساں نہ تھے۔ ان میں سے اکثر دین کا درد رکھتے تھے۔ ان میں سے ایسے کم تھے جو دنیا کے پجاری تھے۔

اسلام کے بانی ہر دو قسم کے افراد کو خوب جانتے تھے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

جو شخص خدا کی خاطر میدان جہاد میں جاتا ہے اس کا اجر خدا دے گا اور جو مال غنیمت کے لالچ میں جاتا ہے اس کے حصے میں مال دنیا کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔ (بخاری ج ۱ ص ۲۲)

احتمال یہ ہے کہ مذکورہ مستشرق نے مجھ سے پہلے اس حدیث کو ملاحظہ کیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ایک خاص مکتب فکر سے وابستہ ہے، اس لئے اپنی کتاب کا آغاز اس جملے سے کرتا ہے: ''مصر کی زرخیز زمین اناج اور پھلوں کی بھرپور پیداواری صلاحیت کی وجہ سے بھوکے عربوں کو سیر کر سکتی تھی۔'' میں نہیں کہتا کہ عمرو بن عاص نے رضائے الٰہی اور اسلام کی پیشرفت کے لئے مصر کی سرزمین پر قدم رکھا۔ مسلم ہے کہ جو خلوص افریقہ کو فتح کرتے وقت عقبہ بن نافع میں موجود تھا وہ اس میں نہ تھا۔ اگرچہ یہاں میں یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ عقبہ نے شمالی افریقہ میں جو کردار ادا کیا وہ ہر لحاظ سے درست تھا۔

البتہ رسول اللہؐ کے سچے اصحاب جنہوں نے عمرو بن عاص کی قیادت میں وادی نیل میں قدم رکھے، وہ کیسے تھے؟ کیا وہ بھی اپنی بھوک و افلاس مٹانے گئے تھے اور پیٹ بھرنے کے لئے انہوں نے یہ سفر کیا؟ اس سے زیادہ اس موضوع کے متعلق بحث نہیں کرنا چاہتا۔ خداوند متعال سے اپنے لئے توفیق اور ان کی ہدایت کی دعا کرتا ہوں۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اور جیسا کہ درجہ اول کے محدثین و مؤرخین نے اپنی کتب میں نہایت وضاحت سے لکھا ہے اور شیعہ و سنی کی بنیادی روایات میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، اسی طرح خارجی قرائن بھی ان مؤرخین کی تائید کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ کی بیٹی کے خواستگار بہت تھے، لیکن حضور اکرمؐ نے ان سب میں سے اپنے چچا زاد بھائی علی ابن ابی طالب کا انتخاب فرمایا اور انہیں حضرت زہرا (س) کا شریک حیات قرار دیا۔ آپؐ نے اپنی بیٹی سے فرمایا: میں نے آپ کے لئے ایسا شوہر منتخب کیا ہے جو سب سے زیادہ نیک، بااخلاق اور اسلام میں سبقت رکھتا ہے(۱)

ابن سعد لکھتے ہیں: جب حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کو رسول اکرمؐ کی طرف سے مثبت جواب نہ ملا تو انہوں نے حضرت علیؑ سے کہا آپ خواستگاری کے لئے جائیں۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ انصار کے چند آدمیوں نے حضرت علیؑ سے جناب فاطمہ (س) کا رشتہ مانگنے کو کہا۔ حضرت علی (ع) پیغمبر اکرمؐ کے گھر تشریف لے گئے اور آپؐ کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ آپؐ نے پوچھا:

ابو طالب کے بیٹے! کیسے آنا ہوا؟

.... فاطمہ (س) کی خواستگاری کے لئے۔

.... خوش آمدید۔ بہت اچھا! اس کے علاوہ آپؐ نے کچھ نہ فرمایا۔

جب حضرت علیؑ وہاں سے واپس آئے تو چند افراد نے آ کر پوچھا کہ رسول خداؐ نے کیا جواب دیا؟ حضرت علیؑ نے فرمایا: مرحباً واھلاً فرمایا ہے۔

---

(۱) الریاض النضرۃ ج ۲ ص ۱۸۲۔ الغدیر ج ۳ ص ۲۰۔ نیز ملاحظہ فرمائیں باب ''شعرائے عرب سے انتخاب''۔

یہی جملہ کافی ہے۔(۱) انہوں نے تمہاری خواہش اور خواستگاری کو قبول فرمالیاہے۔

یہ افتخار جو حضرت علیؑ کو نصیب ہوا اور انہیں رسول خداؐ کے داماد ہونے کا جو شرف حاصل ہوا چند افراد پر گراں گزرا۔

علامہ مجلسی نے عیون اخبار الرضا سے نقل کیا ہے:

> پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علی (ع) سے فرمایا کہ قریش کے چند اشخاص مجھ سے ناراض ہوئے ہیں کہ میں نے انہیں کیوں رشتہ نہ دیا۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ یہ کام ارادہ الٰہی سے ہوا ہے۔ کیونکہ علیؑ کے سوا فاطمہ (س) کا شوہر بننے کے لائق کوئی بھی نہیں تھا۔(۲)

بعض روایات میں نبیؐ کی بیٹی کی خواستگاری کے معاملے میں حضرت ام سلمہ کے عمل دخل کا ذکر بھی موجود ہے۔ علی بن عیسیٰ اربلی نے کشف الغمہ میں مناقب خوارزمی سے ایک طویل واقعہ نقل کیا ہے۔ اس واقعہ میں وہ لکھتے ہیں: جب حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کو جناب فاطمہ (س) کی خواستگاری کا مثبت جواب نہ ملا تو وہ حضرت علیؑ کے پاس گئے اور ان سے کہا: آپ فاطمہؑ کی خواستگاری کے لیے کیوں نہیں جاتے؟ حضرت علیؑ نے جواب دیا: تنگدستی مجھے اس کام سے روکتی ہے۔ حضرت ابو بکر نے کہا: اے ابو الحسن(ع)! یہ دنیا اور جو کچھ اس دنیا میں ہے اللہ اور رسولؐ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اس گفتگو کے بعد حضرت علیؑ نے کنویں پر جتا ہوا اونٹ کھولا اور اسے گھر جا کر باندھ دیا اور جوتے پہن کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے چلے۔ اس وقت رسولؐ خدا ابی امیہ مخزومی کی بیٹی حضرت ام سلمہ کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ حضرت علیؑ نے دروازے پر دستک دی۔ حضرت ام سلمہ نے پوچھا کون؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ام سلمہ اٹھو، دروازہ کھولو اور آنے والے سے کہو کہ اندر آجاؤ۔ آنے والا شخص ایسا ہے جو خدا اور رسولؐ سے محبت رکھتا ہے اور خدا اور رسولؐ اس سے محبت کرتے ہیں۔ ام سلمہ فرماتی ہیں میں اس طرح اٹھی کہ نزدیک تھا کہ دروازے کے سامنے گر جاؤں۔(۳)

یہ حدیث مرفوع ہے یعنی اس کی سند متصل نہیں ہے۔ احتمال قوی بلکہ یقین ہے کہ اس انداز میں یہ درست نہیں ہے کیونکہ حضرت ام سلمہ کا نام ہند تھا اور آپ بنی مخزوم کے شخص ابو امیہ

---

(۱) الطبقات الکبری ج ۸ ص ۱۲۔ الصواعق المحرقہ ص ۱۶۲ نیز ملاحظہ فرمائیں انساب الاشراف ص ۴۰۲۔

(۲) بحار ص ۹۲ نیز رجوع کیجئے باب "شعرائے عرب سے انتخاب"

(۳) کشف الغمہ ج ۱ ص ۳۵۴ نیز ملاحظہ فرمائیں بحار ص ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ نیز رجوع کیجئے ناسخ التواریخ ص ۳۸ اور اس کے بعد۔

حزیفہ بن مغیرۃ بن عبداللہ بن عمر کی بیٹی تھیں. رسولؐ اللہ سے شادی سے پہلے آپ ابو سلمہ عبدالاسد بن عبداللہ عمر بن مخزوم کی بیوی تھیں۔

ابو سلمہ اور ان کی زوجہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے تھے۔(۱) لیکن ابھی حضور پاکؐ مکہ میں ہی تھے کہ یہ واپس آگئے۔(۲) ابو سلمہ نے مدینے ہجرت کی۔ جنگ بدر میں شرکت کی(۳)جنگ احد میں اسامہ جُشَمِی نے ان پر تیر چلایا(۴) اور اس جنگ میں ان کی جان بچ گئی۔ ہجرت کے تیں ماہ بعد ایک سریہ میں کمانڈر کے طور پر ''قَطَن'' گئے۔(۵)

اور انہوں نے بنی نضیر کے غنائم سے بھی حصہ لیا۔(۶) آخر کار جمادی الثانی سنہ ۴ ہجری میں وفات پائی۔ عدت گزرنے کے بعد آنحضرتؐ نے شوال سنہ ۴ھ میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہ سے عقد فرمایا۔(۶) البتہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اپنے شوہر کی زندگی ہی میں حضرت ام سلمہ کا حضور اکرمؐ کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ روایت ظاہری طور پر یہ بتا رہی ہے کہ جناب زہرا (س) کی خواستگاری کے لیے جب حضرت علیؑ تشریف لائے تو بی بی ام سلمہ آنحضرتؐ کی زوجہ تھیں۔ پس یہ احتمال درست نہیں ہے۔ البتہ علامہ مجلسی نے شیخ طوسی کی امالی سے یوں نقل کیا ہے:

> حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ میرے پاس ابو بکر اور عمر آئے اور کہا کہ تم پیغمبرؐ سے فاطمہؑ کا رشتہ کیوں نہیں مانگتے؟ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں گیا۔ جب آپؐ نے مجھے دیکھا تو مسکرائے اور پوچھا ابو الحسن کیسے آئے ہو؟ میں نے آپ سے جو تعلق اور رشتہ تھا، اس کا ذکر کیا۔ اسلام میں اپنی سبقت کا ذکر کیا اور دین کے راستے میں جہاد کو بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا: تم سچ کہتے ہو. تمہاری فضیلت اس سے کہیں زیادہ ہے جنہیں تم شمار کررہے ہو۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! فاطمہؑ کی خواستگاری کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ ارشاد فرمایا: اے علیؑ آپ سے پہلے بھی ان کے رشتے کے لیے بہت لوگ آئے ہیں، لیکن میری بیٹی نے انہیں قبول نہیں کیا۔ لہذا اس مرتبہ بھی اپنی لخت جگر سے پوچھ لوں۔ ان کی مرضی کیا ہے۔ اس کے بعد آپ گھر تشریف لے گئے اور اپنی بیٹی سے کہا: علیؑ میرے پاس تمہاری خواستگاری کے لئے آئے ہیں۔ تم علیؑ اور میرے درمیان قرابت اور تعلق سے آگاہ ہو۔ تم ان کی اسلام میں سبقت، کارناموں اور فضائل سے

---

(۱) انساب الاشراف ص ۴۲۹۔ (۲) ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹۰۔ (۳) مغازی واقدی ص ۱۵۵۔

(۴) انساب الاشراف ص ۴۲۹۔ (۵) واقدی ص ۳۴۰۔ (۶) انساب الاشراف ص ۴۲۹ و طبقات ج ۸ ص ۶۔

واقف ہو۔ جناب فاطمہ (س) نے سر ہلانے کی بجائے خاموشی اختیار کی۔
پیغمبر اکرمؐ نے ان کے چہرے پر خوشی کے آثار دیکھ کر کہا: اللہ اکبر!
ان کی خاموشی ان کی رضایت ہے۔(۱)

شیخ طوسی نے اپنی امالی میں لکھا ہے کہ جب رسول خداؐ علیؑ و فاطمہؑ کے ازدواج پر راضی ہوئے تو جناب فاطمہؑ رونے لگیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: خدا کی قسم اگر اپنے اہل بیت میں سے اس سے افضل اور بہتر کسی کو پاتا تو تمہارا رشتہ اس سے کرتا۔(۲)

نیز کشف الغمہ کے مصنف اور ان سے نقل کرتے ہوئے علامہ مجلسی نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے آنحضرتؐ سے عرض کیا:

میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ آپؐ نے مجھے بچپن سے میرے باپ ابو طالبؑ اور ماں فاطمہ (س) بنت اسد سے لے کر اپنے دامن تربیت میں پروان چڑھایا۔ میری تربیت فرمائی۔ اس پرورش میں آپؐ میرے والدین سے بھی زیادہ مجھ پر مہربان تھے۔ آپؐ نے مجھے اس شک و تردید سے نکالا جس میں ہمارے آباء و اجداد مبتلا تھے۔ دنیا و آخرت میں میرا سرمایہ اور مال و دولت آپؐ ہی کی ذات گرامی ہے۔ اب جبکہ خدا نے آپؐ کے وجود پاک سے مجھے توانا و طاقتور کیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اپنا گھر بساؤں اور شادی کروں۔ میں فاطمہ (س) کی خواستگاری کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ کیا آپؐ میری یہ درخواست قبول فرمائیں گے؟

جناب ام سلمہ کہتی ہیں کہ جناب رسالتمابؐ کا چہرہ چمک اٹھا اور آپؐ علی کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: کیا میری بیٹی کو حق مہر دینے کے لئے تمہارے پاس کچھ ہے؟ علی علیہ السلام نے جواب دیا: میری حالت آپؐ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میرے پاس تلوار اور اونٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اونٹ وہ ہے، جس کے ذریعہ سے کنویں سے پانی نکال کر مزدوری کرتا ہوں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: تلوار کو جہاد کے لئے محفوظ رکھو اور اونٹ کھجوروں کو پانی دینے، روزی کمانے، سامان لادنے اور سفر کے لئے اپنے پاس رکھو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں صرف زرہ کو حق مہر قرار دوں۔(۳)

---

(۱) بحار ص ۹۳۔ (۲) امالی ج ۱ ص ۳۹

(۳) کشف الغمۃ ج ۱ ص ۳۵۵۔ بحار ج ۴۳ ص ۱۲۶

جیسا کہ ہم نے لکھا ہے۔ اس موقع پر ام سلمہ موجود تھیں۔ ان کی موجودگی اتفاقیہ ہے۔ کیونکہ اس وقت تک وہ آنحضرتؐ کے عقد میں نہیں آئی تھیں۔

زبیر بکار نے جن کی کتاب "الموفقیات" قدیمی مآخذ میں شمار ہوتی ہے، حضرت علی علیہ السلام کی گفتگو اس طرح بیان کی ہے:

> میں رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے سامنے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ کیونکہ ان جیسا مرتبہ و احترام کسی دوسرے کا نہیں تھا۔ میری خاموشی دیکھ کر آپؐ نے پوچھا: ابوالحسن (۱) کیسے تشریف لائے ہو؟ میں اسی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے تین مرتبہ اپنے سوال کو دہرایا پھر فرمایا: گویا فاطمہ(س) کی خواستگاری کے لیے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! آپؐ نے پوچھا! میں نے جو زرہ تمہیں دی تھی وہ کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا: حضور وہ میرے پاس موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسی زرہ کو فاطمہ(س) کا حق مہر مقرر کرو۔(۲)

ابن سعد کی بعض روایات میں زرہ کی بجائے بھیڑ کی کھال اور پرانے یمنی پیراہن کا ذکر ملتا ہے۔

بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے اپنا اونٹ بیچ کر اس کی قیمت حق مہر میں دی۔ اس زرہ کی کیا قیمت تھی؟ اور حق مہر کتنا تھا؟ قرب الاسناد کے مؤلف حمیری نے اسے تیس درہم لکھا ہے۔(۳) دوسروں نے چار سو اسی درہم تک ذکر کیا ہے۔ ابن سعد نے اپنی روایات میں سے ایک میں زرہ کی قیمت چار درہم (۴) بیان کی ہے۔ اس کے بارے میں میرا گمان یہ ہے کہ یہ چار سو درہم کی بجائے غلطی سے چار درہم لکھا گیا ہے، گویا کتابت کی غلطی ہے۔ ابن قتیبہ نے زرہ کی قیمت تین سو اور ایک روایت کے مطابق چار سو اسی درہم بیان کی ہے۔(۵)

رسول اللہؐ کی دختر کا حق مہر چار سو درہم یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ تھا۔ بس یہی کچھ ان کا سرمایہ تھا۔ اس سادگی کے ساتھ علیؑ و فاطمہؑ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ وہ ایسے مقدس رشتے میں منسلک ہوئے کہ دونوں زندگی کے غموں اور خوشیوں میں ایک دوسرے کے شریک بن گئے۔

---

(۱) یہ تعبیر "ابوالحسن" دیگر بعض روایات میں بھی دیکھی گئی ہے۔ عموماً بڑے بیٹے کے نام پر کنیت اختیار کی جاتی ہے (گو کہ یہ بنیادی شرط نہیں ہے) اور ممکن ہے کہ علی (ع) روایت کرتے ہوئے نام کی بجائے کی بجائے کنیت استعمال کرتے ہوں یا راویوں نے یہ تعبیر کی ہے۔

(۲) الاخبار الموفقیات ص ۳۷۵ نیز رجوع کیجئے کشف الغمۃ ج ۱ ص ۳۴۸ و بحار ج ۴۳ ص ۱۱۹

(۳) بحار ج ۴۳ ص ۱۰۵ (۴) ابن سعد طبقات ج ۸ ص ۱ (۵) عیون الاخبار ج ۴ ص ۷۰

کوئی بھی جنس فروخت نہیں ہوتی جب تک خریدار اور بیچنے والا اس کی قیمت کے بارے میں بات چیت نہ کرلیں۔ بہر حال زرہ تھی، بھیڑ کی کھال یا یمنی پیراہن جو کچھ بھی تھا فروخت ہوا، اس کی قیمت آنحضرتؐ کی خدمت میں لائی گئی۔ رسول خداؐ نے گنے بغیر اس میں سے کچھ رقم بلال کو دی اور فرمایا کہ ان پیسوں سے میری بیٹی کے لئے خوشبو (عطر) خرید لاؤ۔ پھر باقی رقم حضرت ابو بکر کو دی اور فرمایا کہ اس سے میری بیٹی کی ضروریات زندگی کی اشیاء مہیا کرو۔ حضرت عمار یاسر اور دوسرے چند اصحاب کو حضرت ابو بکر کے ساتھ روانہ کیا تاکہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جناب زہراؑ کا جہیز خریدیں۔ شیخ طوسی نے جہیز کی فہرست اس طرح لکھی ھے:

سات درہم قیمت کا پیراہن، چار درہم کا نقاب، خیبر کا بنا ہوا سیاہ اونی کمبل، کھجور کے پتوں کا بنا ہوا ایک بستر، مصری ٹاٹ کے دو گدے جن میں سے ایک کھجور کی چھال اور دوسرا بکری کے بالوں سے بھرا ہوا اور جن کے ابرے موٹی کتان کے بنے ہوئے تھے۔ طائف کے چمڑے کے تکیے، جن میں مکی خوشبودار گھاس بھری ہوئی تھی، ایک اون کا پردہ ایک ھَجَر(۱) کا بنا ہوا بوریا، چکی، کپڑے دھونے کے لیے ایک تانبے کا لگن، دودھ دوہنے کے لئے گہرا پیالہ، پانی کے لئے چمڑے کی مشک، ایک لکڑی کا کٹورہ، تار کول جیسے مادہ سے بنا ہوا لوٹا، سبز صراحی اور مٹی کے چند پیالے۔ (۲)

جب جہیز آنحضرتؐ کی خدمت میں لایا گیا تو آپؐ نے اسے دیکھنے کے بعد فرمایا:

اللہ تعالیٰ اہل بیت کو برکت عطا فرمائے۔

خطبہ نکاح پڑھنے کا وقت آپہنچا۔ ابن شہر آشوب نے مناقب میں، علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں اور دوسرے شیعہ علما اور محدثین نے اس خطبے کو مختلف عبارتوں اور مختلف انداز سے نقل کیا ہے۔ ان میں سے درج ذیل منتخب کی گئی ہے، جسے اکثر محدثین نے تحریر کیا ہے۔ جو اس سے زیادہ تفصیل کا طالب ہو وہ بحارالانوار کی طرف رجوع کرے:

> حمد و ثنا ہے اس پروردگار کی جس کی نعمتوں کی ستائش کی جاتی ہے۔ جس کی قدرت و طاقت کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس کی سلطنت میں اس کی فرمانبرداری کی جاتی ہے۔ جس کے عذاب کا ڈر اور خوف ہے، اس کی عطا اور بخشش کے سب خواہاں ہیں اور زمین و آسمان میں اسی کی حکومت کا سکہ چلتا ہے۔ وہ ایسا خدا ہے جس نے مخلوقات کو اپنی قدرت سے خلق کیا۔ ہر ایک کو اس کی صلاحیت و استعداد کے مطابق ذمہ داری سونپی۔

---

(۱) گویا اس "ھجر" سے مراد مرکز بحرین ہے۔ ھجر مدینہ کے نزدیک ایک گاؤں کا نام بھی تھا

(۲) امالی ج ۱ ص ۳۹

انسانوں کو اپنے دین کی وجہ سے بلندی عطا کی۔ اپنے محمدؐ کے ذریعہ انہیں عزت و فضیلت سے نوازا۔ خداوندتعالیٰ نے نکاح کو ایک دوسرے سے منسلک ہونے کا ذریعہ قرار دیا اور اسے واجب کیا۔ اس نکاح کے ذریعے رشتہ داری کے سلسلے کو مضبوط فرمایا۔ اسے لوگوں کے لئے نسب اور سبب کا رشتہ قرار دیا اور تیرا پروردگار توانا ہے۔(۱) پھر حضور اکرمؐ فرماتے ہیں: اسی خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہ(س) کو علیؑ کی زوجیت میں دے دوں اور میں نے چار سو مثقال چاندی حق مہر کے بدلے انہیں علیؑ کی زوجہ قرار دیا ہے۔اے علیؑ! کیا تم راضی ہو؟

جی ہاں! یا رسول اللہ۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ ابن شہر آشوب نے مناقب(۲) میں خطبے کو انہی الفاظ میں بیان کیا ہے اور علامہ مجلسی نے بھی کشف الغمہ سے اسی صورت میں نقل کیا ہے(۳) اور مذکورہ عبارت کے بعد ایک سطر کا اضافہ کیا ہے۔

البتہ ابن مردویہ نے اس خطبے کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس خطبے کو اور وہ خطبہ جو حضرت علی علیہ السلام نے نکاح کی قبولیت کے عنوان سے پڑھا اسے بحارالانوار اور مناقب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

خطبہ نکاح پڑھا گیا۔ اس کے بعد جناب زہرا(س) حضرت علیؑ کی شریکہ حیات بن گئیں۔ جہیز مذکورہ صورت میں تیار ہو گیا لیکن ایک عرصے کے بعد رخصتی عمل میں آئی اور جناب فاطمہ (س) اپنے باپ کے گھر سے اپنے شوہر کے گھر آئیں۔ علامہ مجلسی نے اپنی روایت میں اس عرصے کو ایک ماہ لکھا ہے، جبکہ بعض نے اس مدت کو ایک سال اور اس سے زیادہ بھی بیان کیا ہے۔

ان جزئیات کی تحقیق و جستجو زیادہ اہم نظر نہیں آتی۔ ایک ماہ یا ایک سال یا جو بھی ہو، بہرحال یہ مدت تمام ہوئی۔ آخرکار ایک دن حضرت عقیل حضور اکرمؐ کے گھر آئے اور آپؐ سے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو رخصت کرنے کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ کی بعض بیویوں نے بھی حضرت عقیل کی

---

(۱) الحمد لله المحمود بنعمة . المعبود بقدرته . المطاع فی سلطانه ، المرهوب من غذائيه المرعوب اليه فيما عنده . النافذ امره فی ارضه و سمائه الذی خلق الخلق بقدررته و فيزهم باحكامه و اعزهم بدينه . و اكرمهم بنبيه محمد . ثم ان الله جعل المصاهرة نسبالا حقا و امرا مفترضا. و شج بها الارحام و الزمها الانام . فقال تبارک اسمه و تعالى جده " و هو الذی خلق من الماء بشرا فجعله نسبا و صهرا (الفرقان: ۵۶)

(۲) مناقب شہر آشوب ج ۳ ص ۳۵۰ (۳) بحار ج ۴۳ ص ۱۱۹

حمایت کی۔ ایک رات جناب فاطمہ (س) کو دلہن بنا کر چند عورتوں کے ہمراہ حضرت علی علیہ السلام کے گھر لے جایا گیا۔ پہلی اور دوسری صدی ہجری کے شیعہ شعراء، جیسے کمیت، سید اسماعیل حمیری اور دیک الجن جس نے تیسری صدی کے آغاز میں وفات پائی، نے جناب فاطمہ (س) کی خواستگاری اور ان کی حضرت علی علیہ السلام سے شادی اور جہیز کی مقدار کے بارے میں نہایت عمدہ قصائد کہے ہیں، جو تذکرہ اور سوانح حیات کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

جس رات فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی رخصتی تھی رسول اکرمؐ نے فرمایا:

اے علیؑ! شادی طعام کے بغیر نہیں ہوتی۔

سعد نے کہا: میرے پاس ایک گوسفند ہے۔ انصار کے چند افراد نے کچھ کلو مکئی کا بندوبست کیا۔

زبیر بکار نے عبداللہ بن ابی بکر کے ذریعے حضرت علیؑ سے یوں روایت کی ہے۔(۱)

جب میں نے فاطمہ (س) سے شادی کرنا چاہی یعنی رخصتی کے وقت پیغمبر اکرمؐ نے مجھے ایک زریں برتن عطا کیا اور فرمایا اس کی قیمت سے اپنی شادی کی دعوت ولیمہ کا انتظام کرو. میں محمد بن مسلم انصاری کے پاس گیا اور کہا کہ اس برتن کی قیمت کے بدلے مجھے کھانے کا سامان دے دو۔ اس نے قبول کیا اور پھر مجھ سے پوچھا:

تم کون ہو؟

علی ابن ابی طالب۔

کیا پیغمبر اکرمؐ کے چچازاد بھائی ہو؟

جی ہاں!

یہ سامان کس لئے خرید رہے ہو؟

اپنی دعوت ولیمہ کے لیے۔

کس سے شادی کی ہے؟

رسول خداؐ کی بیٹی سے۔

اس انصاری نے کہا یہ خوردونوش کا سامان بھی آپ کا اور یہ زریں پیالہ بھی۔

رخصتی کے وقت رسول پاکؐ نے میاں بیوی کے لئے دعا فرمائی کہ اے پروردگار اس عقد

---

(۱) الاخبار الموفقیات ص ۳۷۶

کو ان میاں بیوی کے لئے مبارک قرار دے! خدایا! انہیں بہترین اولاد عطا فرما (۱) ابن سعد نے دوسری روایت میں جس کی سند اسماء بنت عمیس تک پہنچتی ہے، بیان کیا ہے:

علی علیہ السلام نے اپنی زرہ یہودی کے پاس گروی رکھی اور اس سے کچھ مقدار میں "جو" لیے اور ان دنوں میں یہ بہترین دعوت تھی۔(۲)

ابن شہر آشوب نے ابن بابویہ سے روایت نقل کی ہے:

پیغمبر اکرمؐ نے عبدالمطلب کی بہوبیٹیوں اور مہاجرین و انصار کی عورتوں سے فرمایا کہ وہ فاطمہ زہرا (س) کے ہمراہ علی علیہ السلام کے گھر جائیں اور راستے میں شادمانی اور خوشی کا اظہار کریں۔ اس مسرت و شادمانی سے متعلق اشعار پڑھیں۔ لیکن ایسی بات نہ کہیں جو اللہ کو پسند نہ ہو۔ انہوں نے حضرت زہرا (س) کو شہباء نامی خچر (یا اونٹ) پر سوار کیا۔ اس خچر کی باگ حضرت سلمان فارسی کے ہاتھ میں تھی۔ حضرت حمزہ، حضرت عقیل، حضرت جعفر اور دیگر بنی ہاشم کے افراد ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ کی بیویاں دلہن کے آگے آگے چل رہی تھیں اور یہ اشعار پڑھ رہی تھیں:

سرن بعون اللّٰہ یا جاراتی و اشکرنہ فی کل حالات
و اذکرن ما آنعم رب العلی من کشف فکروہ و آفات
فقد ھدانا بعد کفر و قد انعشنا رب السماوات
و سرن مع خیر نساء الوری تقدی بعمات و خالات
یا بنت من فضلہ ذوالعلی بالوحی منہ والرسلات

☆ اے میری ساتھی عورتو!؟ خدا کی مدد سے جاؤ اور ہر حال میں اس خالق کا شکر ادا کرو
☆ یاد رکھو کہ خدائے بزرگ و برتر نے ہم پر احسان فرمایااور ہمیں بلاؤں اور آفتوں سے نجات بخشی
☆ ہم کافر تھے اس نے ہماری ہدایت فرمائی ہم ناتواں تھے اس نے ہمیں قوت بخشی
☆ جاؤ! بہترین عورتوں کے ساتھ تجھ پر قربان ہوں پھوپھیاں اور خالائیں
☆ وحی و رسالت کے ذریعے سب پر فضیلت عطا کی

---

(۱) رجوع کیجئے مناقب شہر آشوب ج ۳ ص ۳۵۱

(۲) طبقات ج ۸ ص ۱۴۔ یاد رہے کہ اسماء بنت عمیس جیسا کہ ہم آیندہ لکھیں گے اس زمانے میں اپنے شوہر جعفر بن ابی طالب کے ساتھ حبشہ میں تھیں۔

حضرت عائشہ کی زبان پر یہ اشعار تھے ان کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

یا نسوة استرن بالمعاجر و اذکرن ما یحسن فی المحاضر
واذکرن رب الناس اذ خصنا بدینه مع کل عبد شاکر
فا لحمد لله علی افضاله و الشکر لله العزیز القادر
سرن بها فا الله اعطی ذکر ها و خصها منه بظهر طاهر

☆ اے عورتو! اپنے آپ کو پردے میں رکھو اور زبان پر اچھی بات کے سوا کچھ نہ لاؤ
☆ اپنی زبان پر رب العالمین کا نام لاؤ جس نے ہمیں اور سب انسانوں کو اپنے دین سے فضیلت بخشی
☆ فیاض اور مہربان خدا کی حمد و ثنا عزیز اور قادر خدا کا سپاس و شکر!
☆ اس دختر کو لے چلو جسے خدا نے محبوب کیا اور اسے پاک و پاکیزہ شوہر عطا فرمایا۔

حضرت حفصہ نے یہ اشعار پڑھے:

فاطمه خیر النساء البشر و من لها وجه کوجه القمر
فضلک الله علی کل الوری بفضل من خص بآی الزمر
ذوجک الله فتی فاضلا اعنی علیا خیر من فی الحضر
فسرن جاراتی بها انها کریمة بنت عظیم الخطر

☆ اے فاطمہ (س)! اے دنیا کی تمام عورتوں سے افضل آپ کا چہرہ چاند جیسا ہے!
☆ خدا نے آپ کو تمام انسانوں پر فضیلت عطا کیا اپنے باپ کے ذریعے جسے اللہ نے اپنی آیات سے خصوصیت بخشی
☆ آپ کو ایسا شوہر عطا کیا جو صاحب فضیلت ہے یعنی علی جو سب حاضرین سے بہتر ہیں!
☆ میری ساتھیو! انہیں لے چلو! کہ خود بھی عظیم ہیں اور عظیم خاندان کی بیٹی ہیں۔

سعد بن معاذ کی والدہ معاذہ نے یہ اشعار پڑھے:

اقول قولا فیه ما فیه و اذکر الخیر و ابدیه

محمد خیر بنی آدم ما فیه من کبر و لآتیه
بفضله عرفنا رشدنا فالله بالخیر مجازیه
و نحن مع بنت نبی الهدیٰ ذی شرف قد فکنت فیه
فی ذروة شامخة اصلها فما آریٰ شیئا یدانیه

☆ جو بات کہنی چاہیے وہی کہوں گی۔ نیکی اور بھلائی کے سوا کچھ نہ کہوں گی!
☆ محمد خیر البشر ہیں۔ غرور و تکبر سے مبرا ہیں۔
☆ آپ نے ہمیں ہدایت کی راہ دکھائی۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے
☆ ہم دختر نبی ہدیٰ کے ساتھ ہیں کہ عطا ہوا اسے شرف نبیؐ سے
☆ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئی جس کی اصل برتر ہے جس کا نہ کوئی ثانی ہے نہ کوئی ہمسر

دوسری خواتین پہلے شعر کی تکرار کرتی جاتی تھیں

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے یہ روایت اسی صورت میں مناقب ابن شہر آشوب سے نقل کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنی سند کتاب مولد فاطمہ اور ابن بابویہ کی روایت سے ملائی ہے۔ ابن بابویہ علماء امامیہ کے بزرگوں میں سے ہیں۔

لیکن اس روایت کو مذکورہ شکل میں قبول کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ سب سے پہلی چیز جو ہمیں شک و شبہ میں مبتلا کرتی ہے، یہ بیان ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی گھر والیاں جناب فاطمہ(س) کے خچر کے آگے آگے چل رہی تھیں۔ اس کتاب کے مؤلف نے حضرت زہراؑ کی شادی کی تاریخ ماہ ذوالحجہ سنہ ۲ ہجری ذکر کی ہے۔ (۱)

جبکہ ہماری تحقیق کے مطابق حضرت ام سلمہ ہجرت کے چوتھے سال اور حضرت حفصہ جنگ بدر کے بعد آنحضرتؐ کے گھر آئیں۔ (۲) جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت زہراؑ کی شادی کے موقع پر صرف حضرت سودہ اور حضرت عائشہ پیغمبر اکرمؐ کے عقد میں آئی ہوئی تھیں۔

دوسری بات جو شک و تردد کا موجب ہے، وہ حضرت عائشہ کے اشعار میں یہ جملہ ہے جس میں انہوں نے خواتین سے کہا کہ اوڑھنیوں سے اپنے سروں کو ڈھانپ لو۔ پیغمبر اکرمؐ کی ازواج

---

(۱) مناقب ابن شہر آشوب ج ۳ ص ۳۵۷

(۲) خنیس بن حذافہ، حضرت حفصہ کے شوہر نے جنگ بدر کے بعد وفات پائی۔

مطہرات کو اوڑھنی لینے اور اپنے سینوں کو ڈھانپنے کا حکم سورہ احزاب میں ہے۔(۱) ہم جانتے ہیں کہ یہ سورت ہجرت کے پانچویں سال نازل ہوئی ہے۔

تیسری قابل شک بات حضرت جعفر طیار کا شادی کے شرکاء میں تذکرہ کرنا ہے۔ حالانکہ ان دنوں حضرت جعفر طیار حبشہ میں تھے۔ اس کے بارے میں آئندہ صفحات میں مزید وضاحت کی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

---

(۱) احزاب ۵۹

اس نے اس دنیا کی برائی کو دیکھا اور اپنے آپ کو اس سے مبرا کر لیا۔

(ابو نعیم اصفہانی)

شوہر کے گھر میں حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی زندگی نمونہ ہے۔ ان کی تمام زندگی نمونہ ہے۔ کیونکہ وہ خود نمونہ ہیں۔ ان کے والد، ان کے شوہر نامدار اور ان کے فرزند نمونہ ہیں۔ یہ ہستیاں انسانی اقدار و فضائل کی حامل نمونہ مسلمان تھیں۔ یہ ہستیاں لوگوں کے درمیان رہتی تھیں، ان کے ساتھ زندگی گزارتی تھیں دوسرے انسانوں کی طرح چلتی پھرتی، کھاتی پیتی، لباس پہنتی تھیں۔ ان کی سرشت فرشتوں سے بھی افضل تھی۔ ایسی سرشت جو خدا سے پیوستہ ہوتی ہے۔ یہ ایسے انسان تھے جو دوسروں کا درد رکھتے یا لوگوں کے دکھ درد کو سمجھتے اور اپنے کردار اور رفتار سے ان کے دکھوں اور تکلیفوں کا مداوا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اگر ایسا نہ کر سکیں تو خود ان کی تکلیف اور مشکل میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی وہ خود تکلیف اٹھاتے تھے تاکہ دوسروں کو آرام ملے۔ ایسے افراد اطباء الٰہی اور ذات حق کے شاگرد ہیں اور اس شعر کے کامل مصداق ہیں:

كُلٌّ يُرِيدُ رِجَالَهُ لِحَيَاتِهِ يَامَنْ يُرِيدُ حَيَاتَهُ لِرِجَالِهِ (۱)

وہ روح کی عظمت میں برتری سمجھتے ہیں نہ کہ جسم پالنے اور جسمانی ضرورت کو پورا کرنے میں۔ اگر وہ جسم کے ساتھ زندہ اور موجود ہیں تو اس لئے تاکہ دوسروں کو اچھی زندگی کا درس دیں۔

وہ ان سے کہتے ہیں کہ جب لوگوں کے ساتھ زندگی گزارو تو پھر تم نہیں ہو، بلکہ یہ لوگ ہیں جن کی خدمت کے لئے تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔

---

(۱) دیوان متنبی ص ۱۹۰ ج ۳

انسانی ہمدردی میں اس مقام تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ میں کس طرح پیٹ بھر کر سو جاؤں جبکہ کسی دور دراز مقام پر کوئی انسان بھوکے پیٹ لیٹا ہو۔(۱) جناب زہرا(س) ایسے مدرسے کی تعلیم یافتہ تھیں۔ نئی نویلی دلہن جس کا جہیز ایک زرہ کی قیمت، یعنی چار سو درہم کا تھا اور اس کے گھر کا اثاثہ چند مٹی کے کاسے اور کوزوں پر مشتمل تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ شوہر کے گھر میں کس طرح زندگی گزارے گی۔

اب زہرا(س) شوہر کے گھر جانے کے لئے تیار ہیں۔ ان کے والد گرامی انہیں آخری سبق دیتے ہیں۔ انہوں نے پہلے بھی اس طرح کے سبق سیکھے تھے۔ لیکن اخلاقی دروس کا پے درپے تکرار ہونا چاہیے تاکہ عملی مشق کے ذریعے وہ ملکہ نفسانی کی صورت میں بدل جائے۔ اگرچہ انہیں عملی مشق کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی جو کچھ بھی ہوں آخر انسان ہیں اور رشتہ دار اور ہمسایہ عورتوں سے میل جول رہتا ہے لہذا آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

> میری بیٹی! لوگوں کی طرف دھیان نہ دینا، مبادا پریشان ہو جاؤ کہ تمہارا شوہر غریب ہے۔ فقر دوسروں کے لیے باعث ذلت ہے، لیکن پیغمبرؐ اور ان کے خاندان و اہل بیت کے لیے مایہ افتخار ہے۔
>
> میری بیٹی! اگر تیرا باپ چاہتا تو زمین کے خزانوں کا مالک بن سکتا تھا لیکن اس نے رضائے الٰہی کو اختیار کیا۔ بیٹی! جو کچھ تیرا باپ جانتا ہے اگر تو جان لے تو دنیا تیری نظروں میں بری لگنے لگے۔(۲) میں نے تیرے حق میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ تجھے میں نے اپنے خاندان کے بہترین فرد کے سپرد کیا۔ تیرا شوہر دنیا و آخرت میں عظیم ہے۔(۳)
>
> اے پروردگار! فاطمہ(س) مجھ سے ہیں اور میں فاطمہ(س) سے ہوں۔ خدایا اسے ہر پلیدی و ناپاکی سے دور فرما۔ فاطمہ(س) خدا کی پناہ میں اپنے گھر جاؤ۔

بعض روایات میں یوں آیا ہے کہ سب عورتیں اپنے گھروں کو واپس چلی گئیں لیکن اسماء بنت عمیس رہ گئیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کون ہیں اور کیوں نہیں گئیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے رسول اللہ کی بیٹی کے پاس رہنا چاہیے۔ شب عروسی جوان لڑکی کے پاس ایسی خاتون کا ہونا ضروری

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں حضرت علی علیہ السلام کا عثمان بن حنیف کے نام خط۔ نہج البلاغہ ص ۵۰ ج ۴

(۲) کشف الغمۃ ج ۱ ص ۳۶۳

(۳) ایضا ص ۳۵۱

ہے۔ شاید اسے کوئی ضرورت پیش آئے۔

کشف الغمہ کے مصنف نے اس داستان کے آخری حصے کو اسی صورت میں بیان کیا ہے۔ ابو نعیم اصفہانی نے بھی اسماء بنت عمیس کے حالات زندگی میں یہ بات تحریر کی ہے۔(۱) جیسا کہ ہم نے لکھا ہے کہ جعفر بن ابی طالب اور ان کی زوجہ اسماء بنت عمیس حبشہ کے مہاجرین کے پہلے گروہ میں سے تھے۔(۲) وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کے ساتویں برس فتح خیبر کے موقع پر مدینہ آئیں۔ ان کے حبشہ سے آنے پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ ان دو میں سے کس پر زیادہ اظہار مسرت کروں، فتح خیبر یا جعفر کی آمد پر۔(۳)

اس بناء پر یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ حضرت اسماء جناب فاطمہ زہرا (س) کی شب عروسی کے موقع پر مدینے میں تھیں۔ اگر اصل میں روایت درست ہو اور راویوں نے نام لکھنے میں اشتباہ نہ کیا ہو تو احتمال یہ ہے کہ یہ عورت اسماء ذات النطاقین بنت ابو بکر اور زبیر بن عوام کی زوجہ تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ابو نعیم نے پہلے خود حضرت اسماء کی حبشہ کی طرف ہجرت وہاں سے واپسی اور ان کی اس مسئلے پر حضرت عمر سے بحث کا حوالہ دیا کہ حبشہ کے مہاجرین کی مدینہ کے مہاجرین پر فضیلت بہت ہے، پھر اس کے بعد فوراً حضرت فاطمہ (س) کی شب عروسی کے موقع پر آنحضرتؐ سے ان کی گفتگو کو نقل کیا ہے۔(۴)

معاصرین میں سے ایک فاضل شخص نے فاطمة الزهراء من المهد الى اللحد (فاطمہ (س) گود سے گور تک) نامی کتاب تالیف کی ہے جو تین سال پہلے بیروت میں چھپ چکی ہے۔ مذکورہ کتاب میں جب مصنف کو اس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو وہ گزشتہ علماء کے اقوال کو بنیاد بنا کر اس شادی میں اسماء بنت عمیس کی شرکت کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جلد ۲ صفحہ ۲۰۴ میں کہتے ہیں:

> اس کا معقول حل یہ ہے کہ یہ اسماء وہی اسماء بنت عمیس ہیں لیکن وہ حبشہ جانے کے بعد چند مرتبہ مکے واپس آئیں اور چونکہ ان دو علاقوں کے مسافروں کو صرف بحیرہ احمر عبور کرنا پڑتا ہے اس لئے یہ امر زیادہ مشکل بھی نہیں۔

اس محترم مصنف نے ایک اہم نکتہ فراموش کر دیا اور وہ یہ کہ تاریخی واقعات ہمارے فرض

---

(۱) حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۷۵

(۲) رجوع فرمائیے: ابن ہشام ج ۱ ص ۳۴۵ و ابن سعد ج ۸ ص ۵۰

(۳) ابن ہشام ج ۳ ص ۴۱۴ (۴) حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۷۴ ـ ۷۵

اور تصور کے تابع نہیں ہیں۔ اگر تعارض روایت کے موقع پر ایک اصولی یا فقیہ جہاں تک ممکن ہو جمع عرفی یا جمع فقاہتی کا سہارا لیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مدلول روایت کا عملی اثر ہے۔ یعنی وہ احکام تکلیفی کی پانچ اقسام (واجب، حرام، مستحب، مکروہ، اور مباح) میں سے ایک قسم کو بیان کر رہی ہے اور جہاں تک ممکن ہو ایک فقیہ کو امارت سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن اس قسم کی تاریخ کو تاریخی واقعات اور روایات میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اگر بالفرض قبول کر بھی لیں تو کم از کم ایک سند ایسی ہونی چاہیے جو اشارۃً یا اجمالاً یہ بیان کرے کہ مہاجرین حبشہ مکے آتے جاتے رہتے تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مہاجرین حبشہ کے چند افراد مدینے سے پہلے مکے واپس آگئے تھے اور وہ اس وقت جب انہوں نے سنا یا خود خیال کیا کہ قریش مکہ نے حضور اکرمؐ کی مخالفت سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔

ابن ہشام نے ان مہاجرین میں سے ہر ایک کا نام اور قبیلہ لکھا ہے۔ کسی چھوٹی سی روایت میں حضرت جعفر ابن ابی طالب یا ان کی زوجہ اسماء بنت عمیس کی واپسی کا اشارہ بھی نہیں ملتا۔

اگر آج حجاز سے حبشہ کا سفر بحیرہ احمر کے عرض کو عبور کرنے سے آسان ہو گیا ہے تو اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ چودہ سو سال پہلے بھی یہ سفر اتنا ہی آسان تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے جان کے خوف اور جسمانی آزار و تکلیف کے ڈر سے ایک غیر ملک میں پناہ حاصل کی ہو، وہ تاجروں یا سیاحوں کی طرح نہ تھے جو ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہمارے پاس دوسری صدی ہجری کی ایک سند موجود ہے جس میں اسماء بنت عمیس کی ہجرت کا تمام واقعہ نقل ہوا ہے۔ یہ سند ابو عبداللہ مصعب بن عبداللہ زبیری کی کتاب "نسب قریش" ہے۔ مصعب کی کتاب پروپیگنڈے کی غرض سے نہیں لکھی گئی بلکہ نہایت دقیق بیان ہے جو درجہ اول کی روایت کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔ وہ اسماء کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

> جب جعفر بن ابی طالب نے حبشہ ہجرت کی تو اپنی زوجہ اسماء بنت عمیس کو بھی ساتھ لے گئے۔ حبشہ میں اسماء کے بطن سے جعفر کے تین بیٹے عبداللہ، محمد، اور عون پیدا ہوئے۔ عبداللہ کی پیدائش کے چند دن بعد نجاشی کے ہاں بھی ایک بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اس نے کسی کو حضرت جعفر کے پاس بھیجا اور پوچھا کہ آپ نے اپنے بیٹے کا کیا نام رکھا ہے؟ حضرت جعفر نے بتایا عبداللہ! نجاشی نے بھی اپنے بیٹے کا نام عبداللہ رکھا اور حضرت اسماء نے اس بچے کو دودھ پلانا اپنے ذمے لے لیا۔ اس وجہ سے نجاشی کی نظروں میں ان کی قدر و منزلت بڑھ گئی. جب حضرت جعفر نے دو کشتیوں کے مسافروں کے ہمراہ واپسی کا ارداہ کیا تو اسماء بنت عمیس

نے اپنے بیٹوں کو جن کی ولادت حبشہ میں ہوئی تھی ساتھ لیا اور مدینے آ گئیں۔ وہ مدینے میں رہیں یہاں تک کہ جنگ موتہ میں حضرت جعفر گئے اور شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔(۱)

اسماء بنت عمیس کے بارے میں یہ تاریخی سند قدیم ترین بھی ہے اور اس کے ساتھ واضح ترین ماخذ بھی ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ حضرت جعفر فتح خیبر کے بعد ساتویں ہجری میں مدینے آئے تھے۔ حضرت جعفر نے حبشہ کی طرف ہجرت مہاجرین کے دوسرے گروہ کے ساتھ کی۔ ہجرت کا واقعہ ابن ہشام نے اپنی سیرۃ (۲) اور بلاذری نے انساب الاشراف میں بھی بیان کیا ہے۔ بلاذری لکھتے ہیں:

جعفر اپنی زوجہ اسماء بنت عمیس کے ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے دوسرے گروہ میں تھے اور حبشہ میں ہی رہے۔ ابو طالب اپنی زندگی میں ان کے اخراجات بھیجتے رہے۔ آخر میں وہ فتح خیبر کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ مدینے آگئے۔(۳)

پس وہ روایات جو مکہ میں حضرت خدیجہ کی وفات کے موقع پر اور مدینے میں حضرت زہرا کی شادی کی رات اسماء کی موجودگی کا تذکرہ کرتی ہیں، واقعات کو آپس میں خلط ملط کرنے یا کسی دوسری خاتون کے ساتھ نام کے اشتباہ کرنے پر مبنی ہیں۔ اس طرح کے واقعات میں اس طرح کی غلطیاں بکثرت دیکھنے میں آتی ہیں.

شادی کے تین دن بعد پیغمبر اکرمؐ اپنی بیٹی سے ملنے جاتے ہیں. اپنی لخت جگر اور داماد کے حق میں دعا فرماتے ہیں. بار دیگر علی علیہ السلام کے فضائل کا تذکرہ کرتے ہیں اور واپس گھر آجاتے ہیں۔ لیکن آپؐ کے چہرے سے عیاں ہے کہ اپنے جگر گوشہ کی دوری اس تھوڑے سے فاصلے کے لئے بھی آپ کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ کئی سالوں تک فاطمہ زہرا(س) دن رات آپ کے ساتھ رہیں۔ وہ بیٹی ہونے کے ساتھ حضرت خدیجہ کی یادگار اور آپؐ سے ہی حضرت خدیجہ کی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں. آپؐ فرماتے تھے:

کون ہے جو خدیجہ کی جگہ لے سکے؟ جب لوگوں نے مجھے جھٹلایا تو اس نے میری تصدیق کی۔ جب سب نے مجھے چھوڑ دیا تو اس نے اپنے ایمان

---

(۱) نسب قریش ص ۸۱

(۲) سیرہ ابن ہشام ج ۱ ص ۳۱۵

(۳) ایضا ص ۱۹۸

اور مال کے ساتھ دین خدا کی نصرت کی۔(۱)

آپؐ کی خواہش تھی کہ خدیجہ کی یادگار ہمیشہ ان کے پاس رہے۔ لیکن اب وہ علیؑ کی زوجہ تھیں۔ لہٰذا انہیں علیؑ کے گھر میں رہنا چاہیے تھا۔ اگر آپؐ اپنے گھر کے نزدیک ان کے لئے ایک حجرہ فراہم کردیتے تو آپؐ آسودہ خاطر ہوجاتے ۔ شاید اس کے لئے مدینہ کے مسلمانوں کو زحمت اٹھانا پڑے۔ آخر کار آپؐ نے بیٹی اور داماد کو اپنا حجرہ دینے کا فیصلہ کیا، لیکن یہ کام بھی مشکل ہے۔ کیونکہ آپؐ کے گھر میں پہلے دو بیویاں (حضرت سودہ اور حضرت عائشہ) موجود ہیں۔ حارثہ بن نعمان کو اس امر کی خبر ملتی ہے. وہ آنحضرتؐ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں:

میرا گھر آپؐ سے زیادہ نزدیک ہے. میں بذات خود اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب آپ کے اختیار میں ہے۔ خدا کی قسم! میں یہ زیادہ پسند کرتا ہوں کہ میرا مال آپؐ کے پاس رہے بجائے اس کے کہ وہ میرے پاس رہے۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا: اللہ سبحانہ آپ کو اجر عنایت فرمائے.

اس دن کے بعد علیؑ اور فاطمہ (س) حارثہ کے گھروں میں سے ایک گھر میں منتقل ہو گئے(۲)

ہجرت کے بعد پہلے دو سال اور اس کے بعد کا کچھ عرصہ پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کے لئے انتہائی سخت اور مشکل دور تھا۔ سیاسی حالات کے حوالے سے بھی اور معاشرتی و معاشی حوالے سے بھی۔ جس دن میثاق مدینہ کا پیمان باندھا گیا(۳) اگرچہ یہودی سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے تمام سہولیات سے بہرہ مند تھے، لیکن انہوں نے بعض وجوہات کی بنا پر (جن کی تفصیل بیان کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے) (۴) پیغمبر اکرمؐ سے اپنی مخالفت اور دشمنی کا آغاز کردیا اور وہ مخالفت میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ مسلمانوں نے قرآن کے حکم سے یہودیوں سے ہر قسم کے روابط و تعلقات یکسر ختم کردیئے۔ مسجد اقصیٰ سے خانہ کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی نے رسول اکرمؐ سے ان کے بغض و کینہ میں اضافہ کردیا۔ یثرب میں ایک اور گروہ بھی تھا جو مسلمانوں کے بھیس میں مسلمانوں کے خلاف سرگرم تھا۔

اس گروہ کا سرغنہ عبداللہ بن ابی بن ابی سلول تھا. پیغمبر اکرمؐ کے مدینے میں تشریف لانے سے پہلے یثرب شہر کی سرداری کا سودا عبداللہ ابن ابی کے سر میں تھا۔ اس کی حکومت کے مقدمات

---

(۱) بحار ج ۴۳ ص ۱۳۱

(۲) ابن سعد، طبقات ج ۸ ص ۱۴ نیز رجوع فرمائیں اصابہ ج ۸ ص ۱۵۸ حصہ اول اور الاخبار الموفقیات ص ۳۷۶۔

(۳) تحلیلی از تاریخ اسلام از ڈاکٹر جعفر شہیدی ص ۳۹۔۵۳

(۴) ایضا ص ۵۵

فراہم ہو چکے تھے لیکن رسول اللہؐ کی مکہ سے مدینہ ہجرت نے اسے معاشرہ میں رعب و دبدبہ و بزرگی سے محروم کردیا۔

عبداللہ اور اس کے طرفدار بظاہر مسلمان ہو گئے اور رسول اللہ کے حمایتی بن گئے. لیکن ان کے دل آپؐ کے ساتھ نہ تھے۔ خصوصاً عبداللہ کو جب بھی موقع ملتا وہ اسلام اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگاتا۔ جیسا کہ جنگ احد میں (درے سے) عقب نشینی مسلمانوں کی شکست کا موجب بنی۔ اسی طرح رجیع اور بئر معونہ(۱) کا حادثہ جس میں چالیس سے زیادہ ممتاز مسلمان شہید ہو گئے، بھی دشمنوں کی زبان درازی کا سبب بنااور اس کی وجہ سے دنیا طلب قبائل اسلام کے دشمنوں سے مل گئے.

مسلمانوں کی اقتصادی حالت بھی نہایت ابتر تھی. مدینے کے مسلمانوں اور انصار نے جہاں تک ہو سکا مہاجرین کے ساتھ تعاون کیا۔ بلکہ تمام تر مشکلات اور تنگدستی کے باوجود انہوں نے مہاجرین کو اپنے پر ترجیح دی۔ لیکن غریب کسانوں اور ٹھیلے والے دکانداروں کی مالی توانائی کس قدر ہو سکتی ہے؟ جنگی مال غنیمت بھی اتنی مقدار میں نہ تھا کہ نئے مسلمانوں کی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ آنحضرتؐ کے ذمے ان لوگوں کی ہدایت اور ان کے امور کا انتظام تھا،آپؐ ان مسلمانوں کو اپنے آپ اور اپنے رشتہ داروں پر مقدم رکھتے تھے۔ اگر کہیں سے کوئی راہ کھلتی تو وہ ضرورت مند مہاجرین اور انصار کا حق ہوتی۔ یہ سبق آپؐ کو اور آپ کے خاندان والوں کو قرآن نے سکھایا کہ اگر وہ خدا سے محبت رکھتے ہیں اور خدا کو دوست رکھتے ہیں تو اپنے منہ سے لقمہ بچا کر فقیروں، یتیموں، اور اسیروں کو کھلائیں اور ان پر منت بھی نہ جتائیں اور جان لیں کہ یہ لقمہ ان ضرورت مندوں کا حق ہے جو خدا نے ان کے لئے معین فرمایا ہے اور اس حق کی ادائیگی کے بعد کسی ،جزا اور شکریے کی امید بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ اس نیک عمل کی جزا دوسرے جہان میں پائیں گے جس دن تمام چہرے مرجھائے اور اترے ہوئے ہوں گے۔ ان کے چہرے خوش و خرم ہوں گے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ ہو گی۔ (۲)

یہ امر مسلم ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے چچا زاد بھائی علی علیہ السلام اور آپؐ کی بیٹی فاطمہ زہرا(س) اس حکم کے بجالانے میں دوسروں کی نسبت زیادہ حقدار تھیں۔ یعنی اس حکم پر عمل کرنے میں ان سے بڑھ کر کون سزا وار تھا۔ یہ آیات ان کے گھرمیں اور ان پر نازل ہوئیں۔ یہ اسی اخلاقی حکم کی

---

(۱)حادثہ رجیع کا خلاصہ یہ ہے کہ کنانہ کا ایک گروہ رسول اکرمؐ کے پاس آیا اور ان سے درخواست کی کہ کچھ آدمیوں کو اُن کے قبیلہ میں اسلام کے احکام کی تعلیم دینے کے لیے بھیج دیں۔آپؐ نے چھ آدمی ان کے ہمراہ بھیج دیئے۔ لیکن ان لوگوں نے ان چھ آدمیوں پر رجیع کے مقام پر حملہ کر دیا اور ان میں سے چار کو قتل کر دیا اور بقیہ دو کو مکہ کے مشرکین کے سپرد کر دیا۔ ان لوگوں کو قریش نے اپنے مقتولوں کے بدلہ میں قتل کر دیا۔بئر معونہ کے حادثہ میں رسول اللہؐ کے ۳۸ نمائندے شہید ہوئے۔

(۲) سورہ دھر آیات ۸ ۔ ۱۱

بجاآوری تھی کہ ان میاں بیوی نے عام انسان کی توانائی سے بڑھ کر سختیوں اور مشکلات کو برداشت کیا۔ ان ایام کے چالیس سال بعد جب علی علیہ السلام نے اس پر مشقت اور پر رنج دنیا سے آنکھیں بند کیں اور ان کی روح نے ملکوت اعلیٰ کی طرف پرواز کی تو باوجود اس کے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری پانچ سال عالم اسلام کے حکمران کی حیثیت سے گزارے تھے، ان کے بیٹے امام حسن علیہ السلام نے اپنے پہلے خطبے میں ان کی یوں تعریف کی:

> اے لوگو! ایک ایسا انسان اپنے خالق سے جا ملا ہے کہ پہلے والوں میں سے کوئی ان سے سبقت نہیں لے سکا اور آئندہ آنے والوں میں سے کوئی ان کے مرتبے پر نہ پہنچ سکے گا۔ جب رسول اللہؐ انہیں کوئی مہم سر کرنے کے لیے بھیجتے تھے تو جبرائیل ان کے دائیں طرف سے اور میکائیل ان کے بائیں طرف سے محافظت کرتے تھے یہاں تک کہ وہ کامیاب لوٹتے۔ جو کچھ انہوں نے چھوڑا ہے وہ سات سو درہم ہیں۔

اس سند کو ابن سعد نے طبقات الکبریٰ میں بیان کیا ہے۔ یہ قدیم ترین تاریخی اسناد میں سے ہے اور تمام مؤرخین نے اس سے استناد کیا ہے۔(۱)

ابن عبد ربہ اندلسی جس کی وفات چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں ہوئی اور اس نے یہ کتاب تیسری صدی ہجری کے آخر میں لکھی ہے، اپنی کتاب میں اس نے علی علیہ السلام کا باقی ترکہ تین سو درہم لکھا ہے۔(۲)

یہ بڑی بے انصافی ہو گی کہ اگر کوئی اپنے خیال کے مطابق یا ناآگاہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی خاطر ایک کتاب تحریر کرے اور اسلام کا تعارف فلسفہ کی روشنی میں کرانا چاہے، پھر ابن سعد اور ابن عبد ربہ سے بھی چند صدیوں بعد کے منابع اور مآخذوں کے غلط ترجموں پر اعتماد کرتے ہوئے علی علیہ السلام کو اپنے زمانہ کے سرمایہ دار کے طور پر پیش کرے۔

یہ بے انصاف افراد اپنے کوتاہ بیں افکار کی وجہ سے ہر واقعے کو اپنی غلط، بے جا اور غیر منطقی تاویلات کے ذریعے اپنے خود ساختہ اور نادرست نتائج پر منطبق کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس مختصر زحمت کو بھی تحمل نہیں کرتے کہ پہلے تمام اسناد اور روایات کی تحقیق کریں، ان کی درجہ بندی کریں اور پھر کوئی نتیجہ اخذ کریں۔ کیا یہ افراد ایسا نہیں کر سکتے یا کرنا نہیں چاہتے؟ اللہ بہتر جانتا ہے "وَمَن يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِن هَادٍ (الرعد۔۳۳)

---

(۱) الطبقات ج ۳ ص ۲۶

(۲) العقد الفرید ج ۵ ص ۱۰۳

اِنْ یَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ط

(آل عمران: ۱۴۰)

اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو تمہارے دشمن کو بھی ویسا ہی زخم لگ چکا ہے۔

ہجرت کے تیسرے سال کا رمضان آ پہنچا ہے۔ ایک نومولود ''حسن'' کی ولادت نے، جنگ بدر کی کامیابیوں کی حسین و شیریں یادوں کو، جو پچھلے رمضان میں مسلمانوں کو حاصل ہوئی تھیں، مزید شیریں کر دیا ہے۔ لیکن اس فرخندہ ولادت کے چند دن بعد غم و اندوہ کے بادل اس شہر پر چھا جاتے ہیں۔ مکہ اور مدینہ ایک بار پھر ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے ہیں۔ قریش اور ابو سفیان جنگ بدر میں اپنی شکست برداشت نہ کر سکے تھے، لہٰذا انہوں نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے سپاہیوں کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مدینے کا محاصرہ کر لیا ہے۔ گزشتہ سال کے برخلاف اس دفعہ مکہ نے یثرب پر کاری ضرب لگائی ہے۔ کیوں؟ چونکہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی تمام تر توجہ خدا کی طرف تھی لیکن جنگ احد میں سپاہیوں کے ایک دستے نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیا اور دنیا کے لالچ میں آ گئے۔ انہوں نے پیغمبر کے فرمان پر عمل نہ کیا اور مال غنیمت لوٹنے لگے۔ کمین گاہ میں چھپے دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ ایک اور گروہ نے جو عبداللہ بن ابی کے ساتھ تھا، جنگ سے پہلے میدان کارزار چھوڑ دیا اور اپنے گھروں کو واپس چلا گیا۔ عبداللہ بن ابی پیغمبر اکرمؐ کی مدینہ تشریف آوری کے دن سے ہی دلی طور پر خوش نہیں تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ مدینے کے لوگ اسے شہر کا حکمران بنانا چاہتے تھے۔ جب اس کی خواہش پوری نہ ہوئی تو اس نے رسول خداؐ سے ہمیشہ منافقانہ رویہ اپنایا۔ جنگ احد کی شوریٰ میں، مدینے میں رہ کر دفاع کرنے کی اس کی تجویز بھی نہ مانی گئی۔ بہر حال اس جنگ میں کچھ عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں، کچھ بچے یتیم ہو جاتے ہیں۔ کچھ خاندان بے سہارا ہو جاتے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ کے چچا اور اسلام کے شجاع اور دلیر کمانڈر حضرت حمزہ چوہتر دیگر مسلمانوں کے ساتھ شہید ہو جاتے

ہیں۔ اگرچہ یہ تعداد زیادہ قابلِ توجہ اور کثیر نہیں ہے، لیکن مدینہ کی نو مسلم آبادی بالخصوص ان مسلمانوں کے لئے جو دو منظم گروہوں، یہودیوں اور منافقوں کے درمیان زندگی گزار رہے ہوں نا قابل تلافی نقصان تھا۔ یہ صدمہ مسلمانوں کے لئے اس قدر شدید تھا کہ اللہ تعالی نے چند آیات ان کی تسلی و تشفی کے لئے نازل فرمائیں۔ ارشاد ہوا:

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ ... وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ (آل عمران ۱۴۰...۱۴۳)

اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو تمہارے دشمنی کو بھی ویسا ہی زخم لگ چکا ہے اور یہ ہیں وہ ایام جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں.... اور موت کے سامنے آنے سے قبل تو تم مرنے کی تمنا کر رہے تھے سو اب وہ تمہارے سامنے ہے جسے تم دیکھ رہے ہو۔

جناب زہرا سلام اللہ علیہا کو خبر ملتی ہے کہ جنگ میں آپ کے بابا زخمی ہو گئے ہیں۔ آپؐ کے چہرہ اقدس پر پتھر لگا ہے اور خون سے رنگین ہو گیا ہے۔ حضرت زہرا فوراً چند عورتوں کو ساتھ ملاتی ہیں۔ پانی اور خوراک اٹھاتی ہیں اور میدان جنگ کی طرف جاتی ہیں۔ خواتین زخمیوں کو پانی پلاتی ہیں ان کے زخموں کی مرہم پٹی کرتی ہیں اور جناب فاطمہ (س) اپنے باپ کے زخم صاف کرتی ہیں (۱) خون نہیں رکتا۔ وہ بوری کے ایک ٹکڑے کو جلاتی ہیں اور اس کی راکھ زخم پر رکھتی ہیں تاکہ خون رک جائے (۲)۔ ان با ایمان مسلمانوں خصوصاً حضرت حمزہ کی شہادت، پیغمبر اکرمؐ آپ کے خاندان، آپ کی بیٹی اور تمام مسلمانوں پر بڑی گراں گزری۔ واقدی نے لکھا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ حضرت حمزہ کے غم میں گریہ کرتے رہے۔ حضرت زہرا (س) بھی روتی رہیں (۳)۔

ستر سے زیادہ پاک دل مجاہدوں کی شہادت نے تمام مسلمانوں کو غمزدہ کر دیا تھا لیکن دشمنوں (یہودیوں اور منافقوں) کے طعنے اور باتیں ان سے زیادہ رنج آور تھیں۔ یہود نے زبان درازی شروع کی اور مسلمانوں کی سرزنش کرنے لگے کہ اگر تمہارا رہبر پیغمبر ہوتا تو اسے ایسی شکست نہ کھانا پڑتی۔ منافقین نے بھی مختلف قبائل کو پیغمبر اکرمؐ سے علیحدہ کرنے کی بہت کوشش کی۔ رسول خداؐ نے ایک طرف قرآن کی آیات تلاوت فرما کر اور دوسری جانب شہدا کے پسماندگان سے دلجوئی

---

(۱) مغازی ص ۲۴۹۔ نیز رجوع فرمایئے: انساب الاشراف ص ۳۲۴۔ واقدی نے عورتوں کی تعداد چودہ لکھی ہے۔

(۲) مغازی ص ۲۵۰

(۳) ایضا ص ۲۹۰

کر کے اس منافقانہ پروپیگنڈے کا اثر زائل کیا۔ آپؐ کبھی کبھی شہدا کی قبروں پر تشریف لے جاتے اور خدا سے ان کے لئے مغفرت طلب فرماتے۔ آپؐ کی دختر بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شہدا کے لواحقین کی دلجوئی کرتیں۔

واقدی نے لکھا ہے کہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا ہر دوسرے یا تیسرے دن احد جاتیں، شہیدوں کے مزاروں پر گریہ کرتیں اور ان کے لئے دعا فرماتیں۔(۱)

☆☆☆☆☆

---

(۱) واقدی ص ۳۱۳

... وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

(الحشر۔۹)

...اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود محتاج ہوں۔

رفتہ رفتہ جنگ احد کا تلخ واقعہ فراموش ہو جاتا ہے۔ درہم برہم گھر نئے سرے سے آباد ہونا شروع ہوتے ہیں۔ بیوہ عورتیں نکاح کرلیتی ہیں۔ موقع پرستوں پر حملوں کا آغاز ہوتا ہے اور مدینے سے باہر بھیجے ہوئے دستوں کو کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں.

ہجرت کے چوتھے سال ماہ شعبان میں حسین علیہ السلام کی ولادت سے علی علیہ السلام کا گھر ایک بار پھر منور ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش سے علی علیہ السلام کے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ان کے دو بیٹوں کے بعد حضرت علیؑ کے ہاں جناب فاطمہ (س) کے بطن پاک سے زینب، ام کلثوم اور محسن پیدا ہوئے۔

بلاذری نے لکھا ہے کہ پہلے جناب حسنؑ کا نام حرب رکھا گیا، لیکن حضورؐ نے فرمایا ان کا نام حسنؑ ہے۔۔ اس کے بعد حسینؑ اور محسنؑ کا نام بھی حرب رکھا گیا، لیکن حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ میں ان کے نام حضرت ہارون علیہ السلام کے بیٹوں کے نام پر رکھنا چاہتا ہوں۔(۱) البتہ اہل بیت کی روایات میں آیا ہے کہ علیؑ اور فاطمہ (س) نے اپنے بچوں کے نام آنحضرتؐ کے سپرد کیے کہ آپؐ ہی ان کے نام تجویز فرمائیں اور انہوں نے بچوں کے نام اس ترتیب سے رکھے: حسن، حسین، اور محسن۔(۲)

تنگ دست مسلمانوں کی مالی حالت بھی بتدریج بہتر ہونے لگی۔ وہ قبائل جو جنگ احد کے بعد مسلمانوں سے الگ ہو گئے تھے، جب انہوں نے مسلمانوں کی ثابت قدمی اور بعد کی کامیابیوں کو دیکھا

---

(۱) انساب الاشراف ص ۴۰۴ و فاطمۃ الزہراء ص ۴

(۲) ارشاد مفید ج ۲ ص ۳ و ۴

تو انہوں نے مکے سے مُنہ موڑ کر دوبارہ مدینے کی طرف رخ کیا یا کم از کم مکے کے مقابلے میں غیر جانبداری اختیار کی۔ جنگی غنائم کی وجہ سے مسلمانوں کے امور میں کچھ آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ نبی زادی کا گھر اسی طرح خالی اور ضروریات زندگی سے محروم تھا۔ علیؑ اور فاطمہ (س) نے زہد، قناعت ایثار اور بھوک کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔

ابن شہر آشوب بیان کرتے ہیں: ایک دن علی علیہ السلام نے فاطمہ (س) سے پوچھا کیا کھانے کی کوئی چیز ہے؟

جواب ملتا ہے: ! خدا کی قسم دو دن سے میں اور میرے دونوں فرزند حسن اور حسین (علیہما السلام) بھوکے ہیں۔

علیؑ فرماتے ہیں: آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟

فاطمہؑ فرماتی ہیں: مجھے خدا سے شرم آتی تھی کہ آپ سے اس چیز کا مطالبہ کروں جسے آپ مہیا نہیں کر سکتے۔

حضرت علیؑ گھر سے باہر جاتے ہیں۔ ایک دینار قرض لیتے ہیں۔ گرمی بہت زیادہ ہے۔ تپتے ہوئے سورج نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس گرمی کے عالم میں مقداد بن اسود پریشان حالت میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

علیؑ پوچھتے ہیں: مقداد کیا ہوا؟ کیوں اس گرمی میں گھر سے باہر نکلے کھڑے ہو؟

مقداد: اس کا جواب دینے سے مجھے معاف رکھیں۔

علیؑ: یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کو مجھے بتانا ہو گا۔

مقداد: اگر ایسا ہے تو سنیے! بات یہ ہے کہ بھوک نے مجھے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھ سے بچوں کا رونا برداشت نہیں ہو سکتا۔

علیؑ: خدا کی قسم! میں بھی اسی خاطر گھر سے نکلا تھا۔ یہ دینار قرض لیا ہے لیکن تجھے اپنے آپ پر مقدم سمجھتا ہوں۔ یہ کہہ کر قرض لی ہوئی رقم مقداد کے حوالے کر دیتے ہیں۔(۱)

اس مساوات میں پیغمبر اکرمؐ کی دختر کا بھی برابر کا حصہ تھا بلکہ کبھی کبھار ان کا حصہ بڑھ جاتا تھا۔ ایک دن، دو دن یا تین دن وہ خود اور ان کے بچے بھوکے رہتے تھے، لیکن فاطمہ زہرا(س) علی علیہ السلام کو نہیں بتاتی تھیں۔ جب علی علیہ السلام آگاہ ہوتے تو فرماتے کہ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ بچے بھوکے ہیں؟ فاطمہ زہرا(س) جواب میں فرماتیں:

میرے بابا نے فرمایا ہے۔ علیؑ سے کوئی چیز طلب نہ کر مگر یہ کہ وہ خود

---

(۱) کشف الغمہ ج۱ص۴۶۹ (آخر حدیث تک)

آپ کے لئے مہیا کریں(۱)

ابن شہر آشوب کی روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا:

مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ آپ سے ایسی چیز مانگوں جسے پورا کرنے کی طاقت آپ میں نہ ہو۔ (۲)

ابو نعیم اصفہانی علمائے اہل سنت و الجماعت میں سے ہیں۔ سنہ ۴۳۰ ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے خدا کے برگزیدہ بندوں کے اوصاف کے متعلق ایک کتاب بنام حلیته الاولیاء وطبقات الاصفیاء چند جلدوں میں تحریر کی ہے۔ اس میں انہوں نے ایک فصل جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے مختص کی ہے۔ اس فصل میں وہ اپنی اسناد کے ساتھ عمران بن حصین سے یوں بیان کرتے ہیں:

ایک دن پیغمبر اکرمؐ نے مجھ سے فرمایا: کیا تم فاطمہ زہرا سے ملنے میرے ساتھ نہیں چلتے؟

عمران: کیوں نہیں۔ ہم اکٹھے فاطمہ زہرا (س) کے گھر گئے۔ حضورؐ نے اجازت مانگی۔ آپ کی بیٹی نے گھر آنے کی اجازت دی۔ رسول اللہؐ: میرے ساتھ ایک اور آدمی ہے، کیا اس کے ساتھ اندر آجاؤں؟

فاطمہ (س): بابا جان! خدا کی قسم ایک عبا کے علاوہ دوسرا کپڑا نہیں ہے۔

رسول اللہؐ: میری بیٹی عبا سے اپنے آپ کا اس طرح سے پردہ بنا لے۔ (آپ نے پردہ کرنے کا حکم دیا) فاطمہ (س): میرے پاس اوڑھنی نہیں ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے کاندھے پر جو پرانی چادر تھی وہ فاطمہ زہرا (س) کے سامنے رکھ دی اور کہا اس سے اپنے سر ڈھانپ لیں۔ عمران نقل کرتے ہیں: ہم اکٹھے حجرے میں داخل ہوئے۔

رسول اللہؐ: بیٹی کیسی ہو؟

فاطمہ (س): بابا جان تکلیف سہنے کے ساتھ خالی پیٹ بھی ہوں۔

رسول اللہؐ: کیا آپ راضی نہیں ہیں کہ آپ جہان کی عورتوں کی سردار ہوں؟

فاطمہ (س): بابا جان کیا مریم بنت عمران عورتوں کی سردار نہیں ہیں۔

رسول اللہؐ: وہ اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار تھیں۔ تم سب جہان کی

---

(۱) بحار ج ۴۳ ص ۳۱ از تفسیر عیاشی

(۲) مناقب ج ۱ ص ۳۶۹

> عورتوں کی سردار ہو اور تمہارا شوہر دنیا و آخرت میں صاحب عظمت و بزرگی ہے۔(۱)

یہ عمران نامی صحابی جو پیغمبر اکرمؐ کے ہمراہ حضرت زہرا (س) کے گھر گئے اور اس واقعہ کا مشاہدہ کیا، قبیلہ ء خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان افراد میں سے تھے جو جنگ خیبر کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔(۲) ان کی روایت سے ایک نہایت اہم نکتہ اخذ ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ ملاقات تقریباً فتح مکہ کے بعد یا اس سے کچھ پہلے ہوئی ہے۔ اس مدت تک مسلمانوں کی معاشی حالت پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو چکی تھی، لیکن پیغمبر اکرمؐ کے گھر والے اب بھی انہی مشکل حالات میں زندگی گزار رہے تھے۔ رسول زادی (س) کے پاس اپنے آپ کو چھپانے کے لئے عبا کے سوا کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا اور وہ باپ کی طرف سے دی گئی چادر سے اپنا سر چھپاتی ہیں۔

ابو نعیم اپنی کتاب میں رسول اللہؐ کی دختر کے حالات زندگی پر مشتمل باب کے آغاز میں حضرت زہرا (س) کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

> انہوں نے اس دنیا کی برائی اور آفتوں کو دیکھا اور اپنے آپ کو دنیا اور مافیہا سے جدا کر لیا۔(۳)

ایک دن حضرت سلمانؓ رسول زادی (س) کے گھر جاتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے سر پر جو چادر ہے، اسے کئی پیوند لگے ہوئے ہیں۔ سلمان حیرانگی کے ساتھ اس چادر کو دیکھتے ہیں اور غمگین ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا پیشوائے عرب کی بیٹی اور رسول خداؐ کے چچا زاد بھائی کی زوجہ نہیں ہیں؟ مسلمان ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ایران کے شاہزادوں کی زندگیاں اور ان کا شکوہ و جلال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لیے جب فاطمہ زہرا رسول اللہ سے ملنے گئیں تو آپؐ سے عرض کی:

> بابا جان! سلمان نے میری پھٹی ہوئی چادر دیکھ کر اظہار تعجب کیا ہے. خدا کی قسم! علیؑ کے گھر میں آئے ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس ایک بھیڑ کی کھال ہے، جس پر دن کو اونٹ کو چارہ ڈالتے ہیں اور رات کو اسی پر ہم سوتے ہیں۔(۴)

وہ نہ صرف لباس اور خوراک میں کم سے کم پر قناعت کرتیں اور مشکلات کو برداشت

---

(۱) حلیۃ الاولیاء ج ص ۴۲ نیز رجوع کیجئے: بحار ج ۴۳ ص ۳۷ اور مناقب ابن شہر آشوب ج ۳ ص ۳۲۳۔ الاستیعاب ص ۷۵۔

(۲) الاصابہ ج ۵ ص ۲۶۔ الاعلام زرکلی ج ۵ ص ۲۳۲

(۳) حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء ج ۲ ص ۳۹۔ (۴) بحار ج ۸۸

کرتی تھیں بلکہ گھر کا کام کاج بھی کسی دوسرے سے نہیں کراتی تھیں۔ پانی لانے سے لے کر گھر کی صفائی، مکئی یا گیہوں پیسنے اور بچوں کی دیکھ بھال تک سب کچھ خود کرتی تھیں۔ کبھی کبھار ایک ہاتھ سے چکی چلاتی تھیں اور دوسرے ہاتھ سے بچے کو تھپکیاں دے کر سلاتی تھیں۔ ابن سعد اپنی روایت میں حضرت علیؑ سے نقل کرتے ہیں:

جب فاطمہؑ سے شادی کی تو ہمارے پاس بھیڑ کی ایک کھال تھی جسے رات کو ہم بچھونا بنا کر سوتے اور دن کو پانی نکالنے والے اونٹ کو چارہ ڈالتے اور اس اونٹ کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور خدمت گزار نہ تھا(۱)

اتنی خود داری اور اتنے زہد کے باوجود، جب ایک دن رسول اکرمؐ حضرت زہرا کے گھر تشریف لے گئے تو جناب زہرا کی گردن میں ایک گلوبند دیکھا جسے حضرت علیؑ نے اپنے حصے (فئی) سے خریدا تھا۔ آپؐ فرماتے ہیں:

میری بیٹی کیا دنیا پر فریفتہ ہو گئی ہو! لوگ کیا کہیں گے کہ محمدؐ کی بیٹی ہو اور جباروں جیسا لباس پہنتی ہو۔ حضرت فاطمہ (س) نے گلوبند بیچ دیا اور اس کی قیمت سے ایک غلام کو آزاد کرادیا۔(۲)

علی علیہ السلام بنی سعد کے ایک شخص سے فرماتے ہیں:

کیا تم چاہتے ہو میں اپنا اور فاطمہ (س) کا قصہ سناؤں؟ فاطمہ زہرا (س) اپنے باپ کی نظروں میں سب سے محبوب ترین شخصیت تھیں، لیکن وہ میرے گھر میں اس قدر مشکیزہ کے ذریعے پانی لائیں کہ مشکیزہ کے داغ ان کے سینہ پر پڑ گئے۔ انہوں نے اتنی چکی چلائی کہ ان کے ہاتھوں پر گٹے پڑ گئے اور گھر میں اتنی جھاڑو دی کہ ان کے لباس کا رنگ خاک آلود ہو گیا.

اور اسقدر۔۔۔۔(۳)

ایک دن میں نے ان سے کہا کہ کیا ہو گا اگر آپ اپنے والد سے ایک خادم کا تقاضا کریں تاکہ وہ کاموں میں آپ کا ہاتھ بٹا سکے اور آپ کی مدد کر سکے؟ سیدہ زہرا (س) اپنے بابا کی خدمت میں تشریف لے گئیں، لیکن بابا سے کچھ مانگنے سے شرم محسوس کی اور بغیر کچھ کہے گھر واپس

---

(۱) طبقات ج ۸ ص ۱۴

(۲) بحار ج ۴۳ ص ۲۷

(۳) مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۹

آ گئیں۔ پیغمبرؐ اکرم سمجھ گئے کہ ان کی لخت جگر کسی کام سے آپؐ کے پاس آئی تھیں۔ دوسرے دن رسول خداؐ ہمارے گھر تشریف لائے۔ آپؐ نے سلام کیا۔ ہم خاموش رہے۔ آنحضرتؐ کا معمول یہ تھا کہ تین مرتبہ سلام کرتے، اگر جواب نہ ملتا تو واپس چلے جاتے۔ ہم نے آپؐ کے دوسرے سلام کا جواب دیا اور آپؐ سے گزارش کی کہ اندر تشریف لے آئیں۔ آپؐ گھر میں تشریف فرما ہوئے اور فرمایا: فاطمہ (س) کل باپ سے تمہیں کیا کام تھا؟ مجھے خوف لاحق ہوا کہ جو کچھ میں نے ان سے کہا ہے وہ اپنے باپ سے نہ کہیں۔ میں نے عرض کی فاطمہؑ کی صورتحال یہ ہے کہ گھر کے کام کاج کی سختی سے انہیں اذیت ہوتی ہے اور اس تکلیف کے اثرات ان کے جسم پر نمایاں ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپؐ کے پاس جا کر ایک خادمہ کا مطالبہ کریں۔ آپؐ نے فرمایا کیا میں آپ کو ایسی چیز نہ بتاؤں جو ایک خادم سے بہتر ہے؟ جب آپ سونے لگیں تو تینتیس مرتبہ خدا کی تسبیح "سبحان اللہ" تینتیس (۳۳) مرتبہ خدا کی حمد "الحمد اللہ" اور تینتیس مرتبہ "اللہ اکبر" پڑھیں۔ فاطمہ زہرا (س) نے سر اوپر اٹھایا اور تین مرتبہ کہا میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے راضی ہوں۔ (۱)

ابن سعد نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب فاطمہ زہراء (س) نے اپنے والد گرامی سے خادم کا تقاضا کیا تو آپؐ نے جواب میں فرمایا:

خدا کی قسم جب تک اصحاب صفہ بھوک کی حالت میں ہیں۔ میں آپ کو خادم نہیں دوں گا. (۲)

شیخ صدوق امالی میں ذکر کرتے ہیں کہ جب پیغمبر اکرمؐ کسی سفر سے واپس آتے سب سے پہلے فاطمہ زہرا (س) سے ملنے جاتے اور کافی دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہتے۔ پیغمبر اکرمؐ کے ایک سفر کے دوران حضرت فاطمہ (س) نے اپنے لئے چاندی کے گوشوارے، گلوبند اور کنگن بنوا لئے اور گھر کے دروازے پر ایک پردہ لٹکا دیا۔ حسب معمول سفر سے واپسی پر آپؐ اپنی بیٹی کے گھر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد ناراضگی کے تاثرات لئے وہاں سے آگئے اور مسجد نبوی کا رخ کیا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ فاطمہ (س) کی طرف سے ایک شخص، گلوبند، گوشوارے، کنگن اور پردہ

---

(۱) بحار ص ۸۲ ۔ مسند احمد ج ۲ ص ۳۹ و ۱۰۵

(۲) طبقات ج ۸ ص ۱۶

لے کر آنحضرتؐ کی خدمت میں آپہنچا اور کہا کہ فاطمہ (س) کہہ رہی ہیں کہ ان چیزوں کو فروخت کردیں اور راہ خدا میں استعمال کریں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: اس پر باپ قربان ہو جو اسے کرنا چاہیے تھا اس نے کر دیا۔ دنیا محمدؐ و آل محمدؐ کے لئے نہیں ہے۔(۱)

جب رسالتمابؐ ان میں اعلی انسانی صفات دیکھتے اور اسلامی تربیت کے اثرات کا مشاہدہ ان کے کردار اور گفتار میں کرتے تو خوش ہوتے۔ ان کی تعریف کرتے۔ ان کے لیے دعائے خیر فرماتے۔ مسلمانوں کو ان کی شان و منزلت اور اعلیٰ مرتبے کی پہچان کرانے کے لئے فرماتے تھے:

> فاطمہ (س) میرا ٹکڑا ہے جس نے اسے تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی۔(۲)

آنحضرتؐ جناب فاطمہ(س) سے اپنی محبت کا اظہار کبھی ان کے آنے پر کھڑے ہو کر کرتے اور کبھی ان کے سر اور ہاتھوں کے بوسے لے کر فرماتے۔(۳) جب بھی آپ سفر سے واپس لوٹتے سب سے پہلے مسجد میں دو رکعت نماز ادا فرماتے، پھر فاطمہ زہرا(س) سے ملنے جاتے، پھر اپنی زوجات کے پاس تشریف لے جاتے۔(۴)

دوسروں کو آگاہ کرنے کے لئے آپؐ مختلف مواقع پر اہم ارشادات فرماتے رہے کہ اس محبت کا سرچشمہ پدری جذبات و احساسات نہیں بلکہ آپؐ فاطمہ(س) کو ان صفات کی حامل ہونے کی بناء پر چاہتے ہیں جو ان جیسی بلند مرتبہ خاتون میں ہونی چاہیے تھیں۔ جہاں تک ان کی سنگین ذمہ داری کا تقاضا تھا، آپؐ حضرت فاطمہ کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہتے اور اجر کے حوالے سے اخروی پاداش اور اللہ تعالیٰ کے لطف کا یقین دلاتے رہتے۔

ایک دن آنحضرتؐ جناب زہرا(س) کے گھر تشریف لائے. دیکھا کہ ایک ہاتھ سے چکی چلا رہی ہیں اور دوسرے ہاتھ سے بچے کو دودھ پلا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے فرمایا:

> بیٹی دنیا کی تلخی برداشت کرو تا کہ آخرت کی شیرینی تمہارا مقدر بن سکے۔

جناب زہرا(س) نے جواب میں فرمایا:

> خدا کی نعمتوں پر اس کی حمد کرتی ہوں۔

---

(۱) بحار ج ۴۳ ص ۲۰ نیز ملاحظہ فرمائیں مناقب ج ۲ ص ۱۷۴۔ مسند احمد حدیث ۲۲۷۴

(۲) بحار ص ۸۱۔ بلاذری ص ۴۰۳ اور صحیح بخاری باب فضائل اصحاب النبی ج ۵ ص ۲۶ و دیگر مآخذ

(۳) مناقب ج ۳ ص ۳۳۲ن و دیگر مآخذ

(۴) الاستیعاب ص ۷۵۰

آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

اللہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے اتنا عطا فرمائے گا کہ میں راضی ہو جاؤں گا۔(۱)

آنحضرتؐ نے گھر کے کام کاج کی ذمہ داری جناب زہرا کے سپرد کی تھی اور گھر سے باہر کے کاموں کی ذمہ داری علی علیہ السلام کے کاندھوں پر ڈالی تھی۔

☆☆☆☆☆

---

(۱) تفسیر مجمع البیان ج ۵ ص ۵۰۱۵

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا... (بقرہ۔۱۰)
ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے سو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھادی...

شیعہ و سنی روایات میں چند ایسی احادیث سے بھی ہمیں واسطہ پڑتا ہے جو یہ بیان کرتی ہیں کہ کبھی کبھی جناب فاطمہ (س) اور ان کے شوہر کے درمیان کدورت پیدا ہو جاتی۔ یہاں تک کہ فیصلے کے لئے حضور اکرمؐ کی خدمت میں چلے جاتے تھے۔

ابن سعد نے لکھا ہے کہ ایک دن علیؑ فاطمہ (س) کے ساتھ سختی سے پیش آئے۔(۱) جناب فاطمہ (س) نے کہا خدا کی قسم تمہاری شکایت آنحضرتؐ سے کروں گی۔ یہ کہہ کر وہ رسول اللہؐ کے پاس چلی گئیں۔ علیؑ بھی ان کے پیچھے پیغمبرؐ کے گھر چلے گئے اور ایسی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے جہاں سے فاطمہ (س) کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

سیدہ فاطمہ (س) نے اپنے باپ سے علیؑ کی سختی اور زیادتی کی شکایت کی۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان کے جواب میں کہا:

> میری پیاری بیٹی! ایک عورت کو یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ شوہر اسے جو کام کہے، وہ انجام نہ دے اور پھر اس کی نافرمانی کے بدلے شوہر خاموش رہے۔

علی علیہ السلام نے کہا: میں نے زہرا (س) سے کہا ہے کہ خدا کی قسم آج کے بعد ایسی بات آپ سے نہیں کہوں گا جو آپ کو اچھی نہ لگے۔(۲)

ابن حجر نے لکھا ہے:

---

(۱) کان فی علی علیٰ فاطمة شدة

(۲) طبقات ج ۳ ص ۱۶

علیؑ اور فاطمہ (س) کے درمیان سخت گفتگو ہوئی۔ رسول خدا اصلاح کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ جب باہر آئے تو لوگوں نے آپؐ سے پوچھا کہ جب آپ اندر تشریف لے گئے تو اداس و پریشان تھے لیکن جب باہر آئے ہیں تو خوش و خرم ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے دو شخصیات کے درمیان صلح کرادی ہے جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔(۱)

اس قسم کی روایات کے برعکس علی بن عیسی اربلی حضرت علی علیہ السلام کے قول کو یوں نقل کرتے ہیں:

پیغمبر اکرمؐ نے شادی کی رات مجھے فرمایا کہ اپنی زوجہ کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آنا اور ان سے اچھا سلوک کرنا کیونکہ وہ میرا ٹکڑا ہے۔ جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔ اس کے بعد فرمایا: میں آپ دونوں کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ خدا کی قسم جب تک فاطمہ (س) زندہ رہیں میں نے کبھی انہیں ناراض نہیں کیا۔ انہوں نے بھی ساری زندگی ایسا کوئی کام نہ کیا جو میری ناراضگی کا باعث بنتا۔ جب بھی میں ان کی طرف نظر کرتا میرا غم اور پریشانی دور ہو جاتی تھی۔(۲)

اگرچہ یہ ایک فطری امر ہے کہ کبھی کبھار قریبی دوستوں کے درمیان بھی تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن شیعہ عقائد کے مطابق علی علیہ السلام اور فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا مقام عصمت پر فائز ہیں۔ لہذا ان کے درمیان اختلاف کی نسبت اور وہ بھی اس حد تک کہ معاملہ فیصلے کے لئے نبی کریمؐ تک جا پہنچے، ان کے اس مقام و منزلت کے سازگار نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ مجلسی نے شیخ صدوق کے قول کے بارے میں یوں لکھا ہے:

یہ روایت میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے آپس میں تعلقات اس طرح نہیں تھے کہ ان میں ناچاقی پیدا ہو جائے اور معاملہ ثالثی تک جا پہنچے۔(۳)

جناب فاطمہ (س) کی علی علیہ السلام سے ناراضگی کے ان واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بیان

---

(۱) الاصابہ ج ۸ ص ۱۶۰۔ بحار ص ۱۴۶

(۲) کشف الغمہ ج ۱ ص ۳۶۳۔ بحار ص ۱۳۳۔ ۱۳۴ ج ۴۳

(۳) بحار ص ۱۴۶۔ ۱۴۷

کیا گیا ہے کہ علی علیہ السلام نے ابو جہل کی بیٹی جویریہ سے خواستگاری کی۔ جس پر جناب فاطمہ (س) رنجیدہ خاطر ہوئیں۔

مِسْوَرْ بِنْ مَخْرَمَہ کے بقول یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

> علیؑ نے ابو جہل کی بیٹی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ جب فاطمہ (س) نے سنا تو پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں چلی گئیں اور کہا آپؐ کے رشتے دار یہ سمجھتے ہیں کہ آپؐ اپنی بیٹی کا خیال نہیں رکھتے اور ان کی طرفداری نہیں کرتے۔ علیؑ نے ابو جہل کی لڑکی سے خواستگاری کی ہے۔ رسول اللہؐ اٹھ کھڑے ہوئے، مسجد تشریف لے گئے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے سنا، آپؐ فرما رہے تھے کہ فاطمہ میرا ٹکڑا ہے۔ جو بات اسے رنجیدہ کرے میں اسے پسند نہیں کرتا۔ خدا کی قسم! رسول خدا کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی ایک گھر میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس کے بعد علیؑ نے شادی کا ارادہ ترک کر دیا۔(۱)

اس بات کو بخاری اور مسلم کے علاوہ دیگر راویوں میں سے ایک یا دو نے نقل کیا ہے۔ بلاشک و شبہ یہ روایت جھوٹی ہے۔ سند کے ضعف کے علاوہ حدیث کے الفاظ اس مضمون اور مفہوم کی تکذیب کرتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ روایت بیان کرتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ رسول خداؐ کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی ایک فرد کے ہاں جمع نہیں ہو سکتیں۔ عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ابو جہل زندہ تھا۔ حالانکہ ہجرت کے دوسرے سال رمضان میں جنگ بدر میں مارا گیا تھا اور جیسا کہ ہم بیان کریں گے مسور ماہ ذولحجہ سنہ ۲ ہجری میں پیدا ہوا ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ یہ واقعہ جنگ بدر اور ابو جہل کے مارے جانے کے کئی سال بعد ہوا ہے تو اس وقت یہ عبارت ''دختر رسول اور دشمن خدا کی بیٹی ایک مرد کے ہاں اکھٹی نہیں ہو سکتیں'' بے معنی اور بے مقصد رہ جائے گی۔ کیونکہ مشرک ابو جہل سالہا سال پہلے اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا۔ اسلامی فقہ کی رو سے اس کا شرک اس کی بیٹی کے معاملات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ کہ اتنا اہم واقعہ رونما ہوا کہ حضور اکرمؐ اس کا شکوہ مسجد میں اصحاب کے سامنے کرتے ہیں تو پھر یہ متعدد طریقوں سے منقول ہونا چاہیے تھا اور حد تواتر یا کم از کم شہرت کی حد کو پہنچتا، نہ یہ کہ اس کا راوی صرف مِسْوَرْ بِن مَخْرَمَہ ہوتا۔

---

(۱) صحیح بخاری ج ۵ باب ذکر اصھار النبی ص ۲۸ نیز ملاحظہ فرمائیں۔ نسب قریش ص ۳۱۲ اور الاصابہ ص ۴۳ جزء ہشتم و ص ۷۳ جزء ۵

چوتھی بات یہ کہ مِسْوَرْ پیغمبر اکرمؐ کی مدینہ ہجرت کے دو سال بعد مکے میں پیدا ہوا۔ آٹھ ہجری میں ماہ ذوالحجہ کے بعد اپنے والد کے ساتھ مدینے آیا اور نبی کریمؐ کی رحلت کے وقت اس کی عمر آٹھ سال تھی۔ سن چونسٹھ ہجری ماہ ربیع الاول میں حصین بن نمیر کی طرف سے محاصرہ مکہ کے دوران منجنیق کے ذریعے پھینکے گئے، پتھر کے لگنے سے یہ فوت ہوا(۱) ابن ہجر نے بھی اس کی پیدائش کو ہجرت کے دو سال بعد لکھا ہے اور وہ بیان کرتا ہے کہ سب اس امر پر متفق ہیں۔ اس کے بعد اس کی اس حدیث (پیغمبر اکرمؐ سے میں نے سنا جبکہ میں مُحتلم تھا) کے بارے میں لکھتا ہے کہ بعض کے نظریے کے مطابق یہ صیغہ مادہ علم سے ہے یعنی میں عاقل تھا اور حدیث کو سنتا اور محفوظ کرتا تھا۔ (۲) پس یہ بات اس کے بچہ ہونے سے تضاد نہیں رکھتی ہے۔

اسی طرح اس کے پتھر اٹھانے اور اور اس دوران اس کی شلوار گرنے کا جو واقعہ نقل کیا گیا ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں بچہ تھا اور پتھر اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اس بناء پر اس کا ابو جہل کی لڑکی سے حضرت علیؑ کی خواستگاری والی روایت نقل کرنا اعتبار سے خالی ہے۔ یعنی اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اس پر اس جملے کا اضافہ کیا جانا چاہیے کہ سابقہ علمائے اخبار اور روایات کی تحقیق میں زیادہ تر ان کی نقل کی طرف توجہ دیتے تھے اور درایت کے لحاظ سے بہت کم تنقیدی جائزہ لیتے تھے۔ اگر انہوں نے کہیں پر حدیث پر تنقید کی ہے تو یہ جاننے کے لیے کی ہے کہ گزشتہ علماء نے ان راویوں کو سچا اور نیک کردار کہا ہے یا نہیں۔ اگر انہوں نے ان راویوں کو سچا سمجھا ہے تو جو کچھ انہوں نے روایت کیا ہے، سب قبول کر لیتے۔ لیکن ایک نکتے کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ افراد جو حدیثیں گھڑتے اور لوگوں کے درمیان پھیلاتے ہیں، وہ ان تمام پہلوؤں کا خیال رکھتے ہیں تا کہ ان کی جعلی حدیثیں قابل قبول ہوں۔ اس مقام پر علم حدیث کے ساتھ دوسرے خارجی قرائن کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ حدیث کی جعل سازی پہلی صدی ہجری کے دوسرے چوتھائی حصے میں ہو گئی تھی اور تقریباً دو صدیوں تک یہ کام جاری رہا۔ بنی امیہ کی ستر سالہ حکومت اور بنی عباس کی حکومت میں سو سال سے زیادہ عرصہ تک (یعنی روایات و احادیث کو تحریری صورت میں لانے تک) دشمنان علیؑ سے جہاں تک بن پڑا انہوں نے ان کی مذمت میں جعلی حدیثیں بیان کیں۔ قدرتی امر ہے کہ انہیں ایسی روایات بھی بنانی چاہیے تھیں جو اس بات کی نشاندہی کرتیں کہ نہ صرف گھر سے باہر لوگ علیؑ سے نالاں تھے بلکہ گھر کے اندر اور ان کے قریب ترین افراد بھی ان سے خوش نہ تھے۔ بالفرض اگر یہ

---

(۱) الاستیعاب ص ۲۶۱ ج ۱

(۲) الاصابہ ص ۹۹ جزء ششم

روایات صحیح بھی ہوں پھر بھی ان کی شان و عظمت میں کوئی نقص یا کمی پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ بھی انسان تھے اور ہر انسان مختلف حالات سے گزرتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، یہ جعلی حدیثیں سادہ دل محدثین کی کتب میں لکھی گئیں اور ان کتابوں سے ان افراد کی کتب میں منتقل ہوئی ہیں جو اپنے خیال میں "تاریخ اسلام" کو سائنسی بنیادوں پر لکھنا چاہتے ہیں۔ اس بناء پر اگر ہم "امیل ڈور منگم" کی کتاب میں پڑھتے ہیں کہ فاطمہ سے جھگڑے کے بعد علیؑ مسجد میں جا کر پناہ لیتے اور وہیں پر سوتے ہیں. ان کے چچازاد بھائی ان کے پاس جاتے، انہیں نصیحت کرتے اور ان کی بیوی سے صلح کرادیتے ہیں تو یہ قدرتی بات ہے۔(۱)

بہر حال اس قسم کی روایات ایسے مؤرخین کے لئے ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے لکھا ہے ان روایات کی بنیاد نہیں ہے اور اگر ان میں سے بعض کو ہم درست مان بھی لیں تو ان سے صرف میاں بیوی کے درمیان قدرتی نوک جھونک کا پتہ چلتا ہے اور یہ کسی لحاظ سے بھی ان عظیم ہستیوں کے اعلی اور بلند اخلاق کے دامن کو گرد آلود نہیں کر سکتا۔

☆☆☆☆☆

---

(۱) حیات محمد (ترجمہ عربی) ص ۱۹۹۔ الغدیر ج ۳ ص ۱۷

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا (الفرقان ۶۴)
اور جو اپنے پروردگار کے حضور سجدے اور قیام کی حالت میں رات گزارتے ہیں۔

دختر رسول جس طرح ازدواجی زندگی میں نمونہ تھیں اسی طرح اطاعت الٰہی کا بھی اعلیٰ مظہر تھیں۔ اگر ازدواجی زندگی کی بنیاد تقویٰ اور حسن سلوک پر ہو تو یہ بھی اطاعت خداوندی ہے۔ لیکن یہاں پر اطاعت الٰہی سے مراد نماز کا قیام اور خدا کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ جب حضرت زہرا(س) گھریلو کام کاج سے فارغ ہو جاتیں تو عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاتیں۔ نماز تضرع اور خدا کی بارگاہ میں دعا، دعا بھی دوسروں کے لئے، نہ اپنے لئے (ان کا روزانہ کا معمول تھا)۔

امام صادق علیہ السلام اپنے والد اور آنجناب اپنے والد محترم سے اور آنجناب اپنے چچا حسن بن علی (علیہا السلام) سے روایت کرتے ہیں:
والدہ گرامی جمعہ کی راتوں میں اول شب سے لے کر صبح تک محراب عبادت میں مصروف رہتیں اور جب دست دعا بلند کرتیں تو سب مومن مرد اور مومنہ عورتوں کے لئے دعا فرماتیں، لیکن اپنے لئے دعا نہ کرتیں۔ ایک دن میں نے ان سے عرض کیا: اماں جان! آپ دوسروں کی طرح اپنے لئے دعائے خیر کیوں نہیں کرتیں؟ انہوں نے فرمایا: بیٹا! ہمسائے کا حق زیادہ ہے۔(۱)

آپ کی تسبیحات جو تسبیحات زہرا(س) کے نام سے مشہور ہیں، شیعہ و سنی کی تمام معتبر کتب اور احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔(۲) یہ تسبیحات سب کے نزدیک معروف ہیں۔ سنّت کے پابند افراد ان تسبیحات کو ہر نماز کے بعد پڑھتے ہیں: چونتیس مرتبہ اللہ اکبر، تینتیس مرتبہ سبحان اللہ اور تینتیس مرتبہ الحمد اللہ۔

---

(۱) کشف الغمۃ ج ۱ ص ۴۶۸

(۲) بحار ج ۴۳ ص ۸۲ نیز رجوع کیجئے مسند احمد ج ۲ ص ۳۹ اور ۱۰۵

نیز سید ابن طاؤس نے دعاؤں کے قبول ہونے کے بارے میں ان سے ایسی دعائیں روایت کی ہیں جو آپ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی نمازوں کے بعد باقاعد گی سے پڑھتی تھیں۔ اسی طرح آپ سے اور بھی دعائیں منقول ہیں جن میں سے کچھ مشکلات کے وقت پڑھی جاتی ہیں۔ جو افراد دعائیں پڑھنے اور مستحبات ادا کرنے کے پابند ہیں وہ ان دعاؤں سے واقف ہیں۔

☆☆☆☆☆

وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهُ (الروم ۳۸)
پس تم قرابتدار کو اس کا حق دے دو۔

دین خدا، حکومت اسلام اور مدینہ والوں کے خلاف مکہ والوں کی آخری کوشش جنگ خندق تھی۔ ابو سفیان نے بہت زیادہ بھاگ دوڑ کر کے منتشر قبائل کو اکٹھا کیا۔ یہاں تک کہ وہ یہودیوں کو بھی اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ دس ہزار کے لشکر نے مدینے کا محاصرہ کر لیا۔ دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی لیکن اگر ایمان کی قوت بروئے کار لائی جائے تو لشکر شیطان کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔ حملہ آوروں نے کچھ حاصل کئے بغیر مکے کی جانب عقب نشینی کی۔

اس کے بعد قریش مکہ کو تقریباً یقین ہو گیا کہ اسلامی طاقت کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ابو سفیان اور ایک دو دوسرے تاجروں نے جب اپنی ذلت و رسوائی کو سامنے دیکھا تو اپنے آپ سے انہوں نے عہد کیا کہ آئندہ سال وہ اس شکست کا بدلہ لیں گے۔

ادھر جب مدینے کو چھوڑ کر حملہ آور واپس چلے گئے تو پیغمبر اکرمؐ نے فوراً عہد شکنی کرنے والوں کی خبر لی۔ بنی قریظہ کے یہودیوں نے مسلمانوں سے دغابازی اور مشرکین کا ساتھ دینے کی سزا پالی۔(۱) ایک سال بعد رسول اللہؐ پندرہ سو مسلمانوں کے ہمراہ عازم مکہ ہوئے۔ قریش نے حرم کے نزدیک آنحضرت کا راستہ روک لیا اور آپؐ کو مکہ جانے سے منع کر دیا۔ دونوں طرف سے مذاکرات ہوئے اور آخر کار فریقین کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا جس کی رو سے (طے پایا کہ) پیغمبر اکرمؐ اس سال مکے نہیں جائیں گے۔ لیکن آئندہ سال مشرکین تین دن تک شہر مکہ کو رسول اکرمؐ اور ان اصحاب کے اختیار میں دے دیں گے تا کہ وہ خانہ کعبہ کی زیارت کر سکیں۔ پیغمبرؐ کے چند اصحاب جن کی نظریں فقط ظاہر امر پر تھیں، غصے میں آ گئے اور اس معاہدہ پر برہم ہوئے۔ کیونکہ اس معاہدہ کی اہمیت جسے قرآن نے فتح مبین کہا ہے، اس وقت ان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھی۔ لیکن قریش

---

(۱) تحلیلی از تاریخ اسلام حصہ اول ص ۷۳ و بہ بعد

کے سیاسی ماہروں نے جان لیا کہ اس کے بعد عربوں کی سیادت اب مدینے کے پاس آجائے گی اور قریش اسلام اور پیغمبر کا بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے۔ اسی لئے عمرو بن عاص اور خالد بن ولید فتح مکہ سے پہلے مدینہ آئے اور اسلام قبول کر لیا۔ چونکہ مشرکین مکہ نے جس مقام پر آنخضرتؐ کا راستہ روکا تھا اور پھر وہیں پر معاہدہ صلح طے پا گیا اس کا نام حدیبیہ تھا، اس لیے یہ معاہدہ صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہوا۔

صلح حدیبیہ کے ایک سال کے بعد حضرت محمدؐ مسلمانوں کے ساتھ خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ اس دوران شہر کے لوگوں نے مسلمانوں کے نزدیک پیغمبر اکرمؐ کی عظمت و احترام کو قریب سے دیکھا۔

اس معاہدہ کے بعد ہی مختلف قبائل کے سرداروں نے سمجھا کہ اب قریش کی خیالی قدرت و طاقت میں دم خم نہیں رہا۔ خصوصاً جب انہوں نے یہ سنا کہ یہودیوں کی مزاحمت کا آخری مرکز (خیبر) بھی چند روز کے محاصرے کے بعد مسلمانوں کے زیر تسلط آ گیا ہے اور ان کی زمینیں قانون اسلام کے مطابق مجاہدین جنگ کے درمیان تقسیم ہو چکی ہیں۔ ہجرت کا ساتواں سال اسلام کی جنگی اور دفاعی تاریخ میں تقدیر ساز تھا۔ غیر مسلموں کی نظروں میں فتح خیبر کا اثر خود فتح سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا

خیبر کے نزدیک ایک سرسبز دیہات تھا. جس کا نام فدک تھا۔ اس آبادی کے لوگوں نے جب قلعہ خیبر کے انجام کو دیکھا تو پیغمبر اکرمؐ سے اس شرط پر صلح کر لی(۱) کہ اس دیہات کا نصف حصہ آنخضرت کو دے دیا جائے گا اور وہ خود اپنی زمینوں پر باقی رہیں گے۔ چونکہ اس فتح میں مجاہدین اسلام شریک نہ تھے اس لئے قرآن (حشر.۵۹) کی رو سے فدک خالصتاً پیغمبر اکرمؐ کی ملکیت قرار پایا۔ آنخضرتؐ اس زمین کی آمدن بنی ہاشم کے ضرورت مندوں کو دیا کرتے تھے۔ بعد میں آپؐ نے اسے اپنی بیٹی فاطمہ (س) کو ہبہ دیا۔

محدثین اور مفسرین کی ایک جماعت نے آیت: وَآتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ (روم:۳۸) کے ذیل میں لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسولؐ اللہ نے فدک فاطمہ زہرا(س) کو ہبہ کر دیا۔ (۲)

حدیبیہ کے مقام پر نبی اکرمؐ اور قریش کے مابین طے پانے والے معاہدہ کی رو سے تمام عرب قبائل میں سے ہر قبیلے کو اختیار تھا کہ وہ چاہے تو مکہ والوں کا ساتھ دے اور چاہے تو مدینہ والوں کے ساتھ ہو جائے۔ قدرتی طور پر دونوں فریق اس بات کے پابند تھے کہ اپنے ہم پیمان قبائل کی حمایت اور

---

(۱) یاقوت۔ معجم البلدان۔ ذیل فدک

(۲) در المنثور ج ۴ ص ۱۷۷۔ تفسیر تبیان ج ۸ ص ۲۲۸ نیز ملاحظہ فرمائیں مناقب ج ۱ ص ۴۷۶

مدد کریں۔ قبیلہ بکر قریش کے ساتھ ہو گیا اور قبیلہ خزاعہ پیغمبر اکرمؐ کا طرفدار بن گیا۔ جنگ موتہ کے بعد آنحضرتؐ جمادی الاول سے رجب تک مدینہ میں رہے۔ اس دوران میں یہ خبر پہنچی کہ قبیلہ بنی بکر نے قبیلہ خزاعہ پر حملہ کر دیا ہے اور قریش نے اپنے ہم پیمان قبیلے کی مدد کی ہے۔ اس امر سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ عملی طور پر ٹوٹ گیا۔ ابو سفیان نے سمجھ لیا کہ قریش نے بنی بکر کی مدد کر کے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ وہ فوراً مدینے آیا تا کہ اس معاہدہ کی ایک لمبی مدت تک تجدید کرا سکے۔ مدینے پہنچنے کے بعد وہ سب سے پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہ جو رسول خداؐ کی زوجہ تھیں کے گھر گیا اور مسند پیغمبر پر بیٹھنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے مسند لپیٹ دی۔ ابو سفیان نے کہا: تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ جواب ملا: تم کافر اور ناپاک ہو۔ لہذا پیغمبرؐ کی مسند پر تمہیں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ابو سفیان نے کہا: میری عدم موجودگی میں تم بداخلاق ہو گئی ہو۔

اس کے بعد وہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے پاس گیا تا کہ وہ اس کی سفارش کریں لیکن ان سے بھی اسے منفی جواب ملا۔

آخر کار وہ حضرت علیؑ کے گھر گیا۔ فاطمہ (س) گھر میں موجود تھیں حسن علیہ السلام بچے تھے اور ان کے سامنے چل رہے تھے۔ پہلے اس نے حضرت علیؑ سے کہا کہ وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں اس کے بارے میں بات کریں۔ علی علیہ السلام نے فرمایا: خدا نے فیصلہ کر لیا ہے۔ لہذا میں ان کی مرضی کے خلاف ان سے بات نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد ابو سفیان نے جناب زہرا(س) کو مخاطب کر کے کہا:

> محمد کی بیٹی! کیا اپنے اس بیٹے سے کہے گی کہ وہ لوگوں کے درمیان ثالث بنے تا کہ آخر زمانہ میں عربوں کا سردار بنے؟

جناب زہرا نے جواب دیا:

> خدا کی قسم میرا بیٹا ابھی اس قابل نہیں ہوا ہے کہ وہ ایسے کاموں میں اور وہ بھی پیغمبرؐ کی مرضی کے خلاف مداخلت کرے۔(۱)

اس بات کا مطلب یہ تھا کہ میرے باپ جو کچھ کہتے ہیں یا کرتے ہیں وہ سب حکم خدا ہے۔ وہ اپنی خواہشات اور ارادے سے کچھ انجام نہیں دیتے اور جب حکم خدا درمیان میں ہو تو باپ اور اولاد کی محبت کو آڑے نہیں آنا چاہیے۔ ابو سفیان مایوس اور نامراد مکہ واپس چلا گیا۔

☆☆☆☆☆

---

(۱) ابن ہشام ج ۴ ص ۱۳ نیز رجوع فرمایئے: طبری ج ۳ ص ۴۴ ـ ۱۶۲۳

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (الاسراء۔ ۸۲)
اور کہہ دیجئے: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔

فتح خیبر کو ایک سال بیت گیا۔ اب قریش اور مکہ والوں کو اسلام کی عظمت و ہیبت دکھانے کا وقت آ پہنچا تھا۔ قریش کے لوگ بڑے تجربہ کار اور بابصیرت تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر مزاحمت کے بغیر تسلیم ہو جائیں اور اسلام قبول کر لیں تو اسلام کا مستقبل ان کے ہاتھوں میں ہو گا۔

پیغمبر اکرمؐ ماہ رمضان سن آٹھ ہجری میں مجاہدین کے بڑے لشکر کے ساتھ جس کی تعداد مؤرخین نے دس ہزار لکھی ہے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن اس خدشہ کے پیش نظر کہ جاسوس قریش تک یہ خبر پہنچا نہ دیں، آپؐ نے اپنا پروگرام خفیہ رکھا مَرّ الظّهران کے مقام پر آنحضرتؐ کے چچا حضرت عباس کو علم ہوا کہ یہ لشکر مکہ کی طرف جا رہا ہے۔ انہوں نے اپنے تئیں خیال کیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے قریش سے اس قدر دکھ اور تکلیفیں اٹھائی ہیں، اب آپؐ انتقام لینے جا رہے ہیں اور اتنا بڑا لشکر حملہ کر کے شہر مکہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

رات کے سناٹے میں حضرت عباس خیمے سے باہر نکلے تا کہ شہر کا کوئی آدمی مل جائے تو اس سے شہر کے حالات معلوم کیے جائیں۔ اتفاق سے ابو سفیان لشکر کے بارے میں اطلاع حاصل کرنے کے لئے شہر سے باہر آیا ہوا تھا۔ حضرت عباس اس سے ملے اور حقیقت حال اسے بتائی۔ اسے اپنی پناہ میں رسول اللہ کی خدمت میں لے آئے۔ دوسرے دن لشکر اسلام مکہ میں داخل ہوا۔ آنحضرتؐ کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ جو بھی مسجد الحرام یا ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا امان میں ہے۔ بیس سال کی دشمنی و مخالفت اور جنگ و جدال کے بعد مکہ مغلوب ہو گیا۔

قریش کے سردار اس خوف سے لرز رہے تھے کہ ان سب اذیتوں، تکلیفوں اور مسلمانوں کی قتل وغارت کی سزا کیسے بھگتیں گے۔ لیکن سراپا رحمت پیغمبرؐ سے عفو و درگزر کے سوا کیا امید کی جا سکتی تھی؟

جاؤ! تم سب کو میں نے آزاد کیا

اس دن کے بعد سے ان خود غرضوں کو طلقاء (آزاد شدہ) کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ مکہ کی فوجی طاقت اور مالی قوت جس نے سالوں تک عرب قبائل پر رعب جمائے رکھا، چکنا چور ہو گئی۔ وہ تمام رعب و دبدبہ اور ہیبت وجلال افسانہ بن کر رہ گیا۔

اس عظیم الشان کامیابی کے بعد ہر قبیلے کے سردار نے یہ کوشش کی کہ وہ جلد اپنے آپ کو مدینہ پہنچائے اور حضرت محمدؐ سے اپنی تابعداری کا جلد اعلان کرے۔

تاریخ اسلام میں نویں ہجری کو سنة الوفود (نمایندوں یا وفود کے آنے کا سال) کہا گیا ہے یعنی وہ سال جس میں قبائل کے نمائندے اسلام قبول کرنے کے لئے رسول اللہؐ کے پاس آئے۔ اس عرصہ میں عوام کی ضروریات کے مطابق سیاسی، معاشرتی اقتصادی اور جزا و سزا کے احکامات کی تشریح کی گئی۔ اب ایک مرتبہ پھر قریش کو مسلمانوں کی قدرت و توانائی کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ فریضہ حج کی ادائیگی بھی لوگوں کو بتا دی جائے وہ آخری امتیازات جو اسلام سے پہلے قریش نے اپنے لئے مختص کئے ہوئے تھے، ختم ہو جائیں اور اس سے اہم تر یہ کہ اسلام کے مستقبل کا تعین ہو جائے.

بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (المائدہ: ٦٧)
جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دیجئے۔

ہجرت کے دسویں سال رسول اکرمؐ مسلمانوں کے جمع غفیر کے ساتھ مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں مسلمانوں کی تعداد نوے ہزار سے لے کر ایک لاکھ چوبیس ہزار تک بیان کی گئی ہے۔ اس دوران میں آنحضرتؐ نے حج کے احکام اور آداب لوگوں کو سکھائے۔ جو کچھ بت پرست قربانی، طوائف اور حج کے حوالے سے مراسم انجام دیتے تھے، اسے منسوخ فرمایا۔ اس عبادت میں قریش نے جو خود ساختہ امتیازات اپنے لئے مخصوص کر لیے تھے، پیغمبر اکرمؐ نے انہیں ختم کر دیا۔ آپؐ نے مسلمانوں کو بتایا کہ بیت اللہ میں صرف خدا کی عبادت کرو اور خدا کے نزدیک سب لوگ برابر ہیں۔ کسی کو دوسرے پر کوئی برتری نہیں ہے۔ آپؐ نے اپنے مشہور خطبے میں ارشاد فرمایا:

اے لوگو! اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو. تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے ہیں پس خواہ قریش ہوں یا غیر قریش کسی کو بھی دوسرے پر فضیلت اور برتری حاصل نہیں ہے۔ لوگو! تمہارا خون اور مال ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ یہاں تک کہ تم اپنے پروردگار سے ملاقات کرو۔

واپسی کے موقع پر جحفه (۱) کے مقام پر جہاں سے تمام قافلے ایک دوسرے سے جدا ہوتے تھے اپنی آخری ذمہ داری کو انجام دیا۔ ارشاد فرمایا:

لوگو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں. اگر تم نے ان

---

(۱) مدینہ سے چار منزل کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ مصر اور شام کے لوگوں کے لیے یہ میقات گاہ تھا۔ یہاں کارواں ایک دوسرے سے جدا ہوتے اور ہر کوئی ایک ایک طرف چلا جاتا۔

دونوں کا دامن تھامے رکھا تو میرے بعد ہر گز گمراہ نہ ہو گے۔ یہ دو
چیزیں کتاب الٰہی یعنی قرآن اور میرے اہل بیت ہیں۔ لوگو! جس کا میں
مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔

اس قصہ کو سو سے زیادہ اصحاب رسول نے نقل کیا ہے اور تابعین، محدثین اور مختلف اسلامی مکاتب کے بزرگ علماء میں سے سینکڑوں نے روایات اور کتب میں اسے بیان کیا ہے۔

ان کی اسناد کی تفصیل الغدیر کی پہلی جلد اور میر حامد حسین کی کتاب **عبقات الانوار** کے دوسرے منہج کے پہلے حصے نیز دیگر کتب میں موجود ہے۔ کتابوں کے سلسلے میں اس بارے میں بحث اپنے مقام پر آئے گی۔

رسول اللہؐ اس سفر سے واپس آتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد اپنی بیٹی کو ناخوشگوار خبر سناتے ہیں:

میری بیٹی! پہلے جبرائیل علیہ السلام سال میں ایک مرتبہ مکمل قرآن مجھ پر
پڑھتے تھے لیکن اس سال انہوں نے دو مرتبہ پڑھا ہے۔جناب فاطمہ (س)
نے پوچھا: بابا! اس کا کیا مطلب ہے؟آپؐ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ یہ
میری زندگی کا آخری سال ہے۔جناب زہرا (س) کو جھٹکا لگا۔ وہ افسردہ ہو
گئیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔آنحضرتؐ نے اپنی
گفتگو کو اس جملے پر ختم کیا: اور تم میری بیٹی! خاندان میں سے پہلی فرد ہو
گی جو سب سے پہلے مجھ سے ملو گی۔ یہ سن کر حضرت زہرا(س) کے
چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حاضرین نے آنسوؤں اور پھر مسکراہٹ کا
سبب پوچھا۔ لیکن فاطمہ زہرا(س) نے جواب کچھ عرصے بعد دیا۔(۱)

باپ کی وفات کے بعد حضرت زہرا(س) پر زندگی کس قدر دشوار تھی کہ اپنی موت کی خبر سن کر مسکرادیں۔ہاں! فاطمہ زہرا (س) میں باپ کی جدائی برداشت کرنے کی سکت نہ تھی۔

گویا یہی ایام تھے جب آنحضرتؐ تک یہ الٰہی پیغام پہنچا کہ ''آپؐ بھی فوت ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ بھی مر جائیں گے۔ (الزمر:۳۰)

لوگو! حضرت محمدؐ بھی دوسرے پیغمبروں کی طرح ہیں۔ جو ان سے پہلے آئے اور چلے گئے۔ آپؐ قبرستان بقیع جا کر مرحومین کے لیے خدا سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں اس بات کی علامت ہیں کہ کوئی افسوس ناک واقعہ ہونے والا ہے۔ آخر کار وہ نحس دن بھی آ پہنچا جب یہ

---

(۱) طبقات ج ۸ ص ۷، طبری ج ۳ ص ۱۱۴۔ بحار از کشف الغمۃ ص ۵۱

اندوہناک واقعہ رونما ہوا۔ پیغمبر خداؐ حضرت عائشہ کے گھر جاتے ہیں۔ آپؐ سخت تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ شدت درد سے کراہ رہے ہوتے ہیں۔ آپؐ ایسے پر تلاطم سمندر کی مانند تھے، جس میں تیئس سال کے عرصے میں کبھی آرام نہ آیا۔ وہ کس طرح رک جائے؟ ابھی کئی سبق باقی ہیں جو لوگوں نے نہیں سیکھے۔ آپؐ نے ایک ہاتھ فضل بن عباس اور ایک ہاتھ علی ابن ابی طالبؑ کی گردن میں ڈالا۔ اس حالت میں آپ پیروں کو گھسیٹتے (آہستہ آہستہ) مسجد میں پہنچے۔ آپؐ نے شہدائے احد کی مغفرت کے لئے دعا مانگی۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

> خدا نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو دنیا اور آخرت میں سے ایک کو اپنانے کا اختیار دیا اور اس نے آخرت کو منتخب کیا۔ لشکر اسامہ جتنی جلدی ممکن ہو اپنے مشن پر جائے۔ اے لوگو! جس کا بھی مجھ پر حق ہے وہ اس وقت وصول کر لے۔ اگر میں نے کسی کی پشت پر تازیانہ لگایا ہے تو میری پشت حاضر ہے۔ وہ آئے اور اپنا بدلہ لے۔ میں نے کسی سے بغض و عداوت کو اپنا شیوہ نہیں بنایا۔ جان لو کہ تم میں سے سب سے زیادہ میرے نزدیک وہ ہے جو حق مجھ سے لے یا مجھے معاف کردے تاکہ جب میں خدا سے ملاقات کروں تو آسودہ خاطر ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایک دفعہ کہنا کافی نہیں ہے مجھے چند مرتبہ تکرار کرنا چاہیے۔ آپؐ منبر سے نیچے تشریف لاتے ہیں۔ نماز ظہر لوگوں کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ دوبارہ منبر پر تشریف لے جاتے ہیں اور اسی تقاضے کو دہراتے ہیں۔ ایک شخص کھڑا ہو جاتا ہے۔ یا رسول اللہؐ! میں نے آپؐ سے تین درہم لینے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: فضل! تین درہم اس شخص کو دے دیں۔

> اے لوگو! اگر کسی کا حق کسی کے پاس ہو تو وہ اسے ادا کرے۔ یہ نہ کہے کہ یہ میری رسوائی ہے۔ وہاں (قیامت) کی ذلت و رسوائی سے یہاں (دنیا) کی ذلت آسان ہے۔ ایک شخص کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہؐ: میں نے مال خدا میں تین درہم کی خیانت کی ہے۔ رسول اللہؐ: کیوں ایسا کیا؟ شخص: اس کی ضرورت تھی۔ رسول اللہؐ: فضل! اس سے تین درہم وصول کر لو۔ لوگو! جو بھی خیال کرتا ہے کہ دوسرا اس پر حق رکھتا ہے، کھڑے ہو کر بیان کرے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ میں جھوٹا، بدزبان اور زیادہ سونے والا ہوں۔ رسول خداؐ نے اس کے حق میں دعا فرمائی: پروردگار! راستگوئی اور ایمان اسے نصیب فرما اور اس کی نیند کو اس کے اختیار میں قرار دے۔ ایک اور شخص کھڑا ہو جاتا

ہے: اے اللہ کے رسولؐ! میں منافق اور جھوٹا انسان ہوں۔ کوئی بھی برا
کام ایسا نہیں ہے جو میں نے نہ کیا ہو۔ حضرت عمر نے کہا: تم نے اپنے
آپ کو ذلیل کر دیا۔ پیغمبر اکرمؐ عمر سے کہتے ہیں: اے خطاب کے بیٹے!
دنیا کی ذلت آخرت کی ذلت و رسوائی سے زیادہ آسان ہے۔(۱)

آپؐ مسجد سے واپس گھر تشریف لاتے ہیں اور بستر پر لیٹ جاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۰۰۰ جناب رسولؐ اور بستر خواب۰۰۰؟ فاطمہ (س) نے ہمیشہ اپنے باپ کو راتوں کے وقت خدا کی بارگاہ میں کھڑے پایا ہے۔ یہ شب بیداری اور راز و نیاز اللہ نے آپؐ سے چاہا تھا قُمِ اللَّیْلَ اِلاَّ قَلِیْلاً (المزمل ۲) آپؐ کو آرام کم اور قیام زیادہ کرنا چاہیے۔ عام آدمیوں کے لئے رات آرام و سکون کا باعث ہے، لیکن آپؐ کے لیے نہیں۔ تقدیر ساز انسانوں کو ہمیشہ حالت قیام میں رہنا چاہیے۔ یہ دنیا ان کے آرام کی جگہ نہیں:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ O (القصص ۸۳)

آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے بنا دیتے ہیں جو زمین میں بالادستی اور فساد پھیلانا نہیں چاہتے اور (نیک) انجام تو تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

حضرت محمدؐ جیسے انسانوں کو دن رات سمندر کی موجوں کی طرح متحرک رہنا چاہیے۔ آپؐ نے اس ریاضت کو اتنا بڑھا لیا کہ پھر کلام الٰہی ان کی دلجوئی اور ہمدردی کے لیے نازل ہوا مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰى (طہٰ ۲)

وہ انسان جو حرکت، سعی و کوشش اور جہد مسلسل کا نمونہ ہے وہ کیوں بستر پر جائے؟ سب پریشان ہیں۔ سب یہ چاہتے ہیں کہ ان کے محبوب پیغمبرؐ ہمیشہ کی طرح مسجد میں آئیں۔ ان کے ساتھ نماز پڑھیں، احکام اسلامی کی تعلیم دیں اور انہیں وعظ و نصیحت کریں۔ دس سال سے مدینہ اور اس کے لوگ رسول خداؐ سے مانوس ہیں۔ ان کی ذات بابرکت نے مدینہ سے دشمنی اور کینہ و عداوت کی جڑیں اکھاڑ دیں۔ انہی کے فیض سے وہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ آپؐ ہی نے مدینہ والوں کو عربوں اور اس سے بڑھ کر قریش اور اہل مکہ کی نظروں میں محترم بنا دیا۔ آپؐ اٹھیں اور اسی طرح دست شفقت اس شہر کے بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کے سر پر پھیریں۔

☆☆☆☆☆

---

(۱) طبری ج ۴ ص ۱۸۰۱۔ ۱۸۰۳

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلاَّ رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ

(آل عمران: ۱۴۴)

اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو بس رسول ہی ہیں۔ ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں۔

اچانک حضرت عائشہ کے گھر سے نالہ و شیون بلند ہوا۔ رسول اللہؐ، خدا کے دیدار کے لئے چلے گئے۔ یہ خبر بجلی بن کر لوگوں پر گری کہ آنحضرتؐ رحلت فرما گئے۔ غم واندوہ کے ان لمحات میں آہ وبکا اور گریہ وزاری کی آوازوں میں ایک خوفناک آواز کانوں سے ٹکرائی:

نہیں! ہرگز نہیں! یہ جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ محمد نہیں مرے۔ وہ نہیں مر سکتے۔ جو ایسی بات کرے گا، وہ منافق ہے۔ آپؐ خدا سے ملاقات کرنے کے لئے گئے ہیں۔ آپؐ حضرت عیسیٰ مسیح کی طرح ہیں جو آسمان پر چلے گئے تھے۔ آپؐ حضرت موسیٰؑ بن عمران کی طرح ہیں جنہوں نے چالیس راتیں کوہ طور پر گزاریں۔ خدا کی قسم جو بھی کہے گا کہ محمدؐ مر گئے ہیں، میں اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا۔(۱)

اے عمر کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ اے ابو بکر! کیا تم بھی یہ کہنا چاہتے ہو کہ محمدؐ فوت ہو گئے ہیں؟ ہاں! آپؐ رحلت فرما چکے ہیں۔ کیا تم کلام الٰہی کو بھول گئے ہو۔ جس میں آپؐ سے خطاب ہوا ہے: ''تم بھی فوت ہو جاؤ گے اور دوسرے بھی'' (الزمر ۳۰) ایسا لگ رہا ہے جیسے پہلی مرتبہ یہ آیت سن رہا ہوں اب کیا کرنا چاہیے؟

معن بن عدی اور عویم بن ساعدہ کہہ رہے ہیں کہ سعد بن عبادہ اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ

---

(۱) طبری ج ۴ ص ۱۸۱۵۔۱۸۱۶ نیز رجوع فرمایئے ابن کثیر ج ۵ ص ۲۴۲

رسول اللہؐ کا خلیفہ منتخب کرنے کے لئے سقیفہ کی طرف گئے ہیں۔ ممکن ہے انصار سعد کی بیعت کرلیں اور ہم سے سبقت لے جائیں۔ معن کہتے ہیں فتنے کا آغاز ہو چکا ہے اور شاید خداوند اسے میرے وسیلے سے خاموش کردے (۱) جتنی جلدی ہو ہمیں سقیفہ پہنچنا چاہیے.

لوگو! جو بھی محمد پر ایمان رکھتا ہے، وہ جان لے کہ آپؐ رحلت فرما گئے ہیں اور دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے! جو محمدؐ کے خدا پر عقیدہ رکھتا ہے، وہ جان لے کہ وہ زندہ ہیں اور انہیں ہرگز موت نہیں آئے گی۔

سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف

سقیفہ بنی ساعدہ میں کیا ہوا؟ یہ ایک داستان ہے جس کا ذکر کتاب ''زندگانی علیؑ ''میں آئے گا۔ اس واقعہ کو آپ نے بہت دفعہ پڑھا ہو گا یا سنا ہو گا۔ یہ عجیب کہانی ہے۔ اس چھت کے نیچے جمع ہونے والوں نے کیا کہا اور کیا سنا۔ اسے تاریخ سے واقف تمام لوگ جانتے ہیں۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس کے اثرات چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی عالم اسلام پر موجود ہیں۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟آپ نے بارہا سنا یا مطالعہ کیا ہو گا کہ مسلمانوں میں افتراق کے خوف کے پیش نظر ایسا کیا گیا۔ اس واقعہ کے سرکردہ افراد کا کہنا تھا کہ فتنے کی آگ بھڑک اٹھی ہے اور ممکن ہے خدا ان کے توسط سے اسے ٹھنڈا کردے۔ لیکن اگر وہ چند گھڑیاں یا ایک دن صبر کر لیتے اور حضرت عائشہ کے گھر رونے والوں کو بھی اجتماع میں بلا لیتے تو کیا ہو جاتا؟ کیا فتنہ اس قدر شدید تھا کہ ایک دن صبر نہیں کیا جا سکتا تھا؟ واللہ اعلم۔ شاید تاریخ بھی اس بات کو جانتی ہو۔

---

(۱)عقد الفرید ج ۵ ص۱۰

وَاِنَّهُ لَيَعْلَمُ اَنَّ مَحَلِّي مِنهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحَى (حضرت علیؑ)
اور وہ ضرور جانتا ہے کہ میرا مقام اس میں چکی کی کیل کی طرح ہے۔

حضرت عائشہ کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ علیؑ فاطمہ (س) عباسؓ زبیرؓ حسنؑ حسینؑ اور ام کلثوم آنسو بہا رہے ہیں۔ علی علیہ السلام اسماء بنت عمیسؓ کی مدد سے پیغمبر اکرمؐ کو غسل دینے میں مصروف ہیں۔ اللہ جانے اس غمناک اور پر درد لمحات میں ان چند افراد پر کیا گزری؟ پیغمبر اکرمؐ کو غسل دینے کا مرحلہ ابھی تمام ہوا تھا یا نہیں کہ "اللہ اکبر" کی آواز آتی ہے۔

علی علیہ السلام نے حضرت عباسؓ سے پوچھا: چچا عباس اس تکبیر کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہو چکا ہے۔(۱)

ابھی تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ حضرت عائشہ کے گھر کے باہر سے آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ہر لحہ یہ آوازیں نزدیک ہوتی گئیں: باہر آؤ، باہر آؤ! ورنہ سب کو آگ لگا دیں گے۔

دختر نبی حجرے کے دروازے پر آتی ہیں، وہاں پر ان کا حضرت عمر سے سامنا ہوتا ہے۔ جن کے ہاتھ میں آگ ہوتی ہے۔

اے عمر کیا ہوا ہے؟

علیؑ عباسؓ اور بنی ہاشم مسجد میں آئیں اور خلیفہ رسول کی بیعت کریں۔

کونسا خلیفہ؟ امام مسلمین تو اس وقت عائشہ کے حجرے میں رسول خداؐ کے جسد اطہر کے سرہانے بیٹھے ہیں۔

اس وقت کے بعد سے مسلمانوں کے امام ابو بکر ہیں۔ لوگوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں ان کی

---

(۱) انساب الاشراف ص ۵۸۲

بیعت کرلی ہے۔ لہذا اب بنی ہاشم کو بھی ان کی بیعت کرنی چاہیے۔

اگر وہ نہ آئیں تو؟

پھر اس گھر میں موجود تمام افراد سمیت اسے جلا دیں گے۔ مگر یہ کہ جو لوگوں نے قبول کیا تم بھی وہی قبول کر لو۔

عمر! کیا تم گھر کو آگ لگانا چاہتے ہو؟

ہاں۔(۱)

رسول خداؐ کی بیٹی اور اسلام میں پہل، ہجرت کرنے والے بزرگ صحابی کے درمیان یہ مکالمہ اسی صورت میں ہوا یا نہیں۔ اب اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس وقت جب میں یہ واقعہ لکھنے میں مشغول ہوں تو ابن عبد ربہ اندلسی کی کتاب **عقد الفرید** اور بلاذری کی **انساب الاشراف** میرے سامنے موجود ہیں۔ مذکورہ واقعہ میں نے ان دو کتابوں سے نقل کیا ہے۔ یہ بات انتہائی بعید بلکہ ناممکن نظر آتی ہے کہ اس واقعہ کو مذکورہ صورت میں شیعوں یا ان کے حامی سیاسی گروہوں نے گھڑا ہو۔ کیونکہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں شیعہ یا ان کے طرفدار کمزور، سیاسی طاقت سے محروم اور اقلیت میں تھے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہی واقعہ مغرب کی اسلامی اسناد و کتب میں بیان ہوا ہے۔ اس لحاظ سے اس کے جعلی ہونے کا احتمال نہیں ہے۔ دوسری کتابوں میں بھی اسی قسم کی باتیں نرم یا سخت انداز میں موجود ہیں طبری لکھتے ہیں:

> انصار نے کہا ہم علیؑ کے علاوہ کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔ عمر ابن خطاب علیؑ کے گھر گئے، طلحہ اور زبیر اور مہاجرین میں سے کچھ افراد بھی وہاں پر تھے۔ عمر نے کہا: خدا کی قسم! اگر ابو بکر کی بیعت کرنے کے لئے باہر نہ آئے تو اس گھر کو جلا کے راکھ کر دوں گا۔ زبیر تلوار کھینچ کر باہر نکلے تو ان کا پاؤں پھسلا اور گر پڑے۔ لوگوں نے ان پر دھاوا بول دیا۔ انہیں پکڑ لیا۔(۲)

جی ہاں اس دن اصحاب رسولؐ کے درمیان اس قسم کی باتیں کیوں ہوئیں؟ یہی افراد تھے جنہوں نے انتہائی مشکل اور کٹھن حالات میں دین خدا کی نصرت کی تھی۔ کئی بار اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمنوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ آخر کیا ہوا کہ اتنی جلدی ایک دوسرے کی جانوں کے درپے ہو گئے؟

---

(۱) عقد الفرید ج ۵ ص ۱۲۔ انساب الاشراف ص ۵۸۶

(۲) طبری ج ۴ ص ۱۸۱۸

علی علیہ السلام اور خاندان رسالت نے کیا گناہ کیا تھا کہ انہیں آگ میں جلایا جاتا۔ فرض کریں کہ واقعہ غدیر صحیح نہیں ہے۔ فرض کریں کہ رسول اللہؐ نے اپنا جانشین کسی کو مقرر نہیں فرمایا تھا۔ فرض کریں کہ انتخاب سقیفہ پر کسی قسم کا اعتراض قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن بیعت سے انکار کی اسلام میں پہلے مثال موجود تھی۔ خلیفہ کی بیعت نہ کرنا گناہ کبیرہ نہ تھا۔ یہ ایک فقہی حکم تھا اور فقہی حکم کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے حکم کی دلیل کیا تھی؟ کیا انہوں نے اسامہ سے منقول اس حدیث کو اجتہاد کا منبع قرار دیا:

لَيَنتَهِيَنَّ رِجَالٌ عَن تَركِ الجَمَاعَةِ اَوْلَاُ حرِقَنَّ بُيُوتَهُم (۱)

یا لوگ ترک جماعت سے باز آئیں یا ان کے گھروں کو جلا دیا جائے

بالفرض یہ حدیث متن اور سند کے لحاظ سے درست ہے۔ لیکن کیا یہ حدیث علی علیہ السلام اور ان کے گھر والوں پر تطبیق کرتی ہے؟ اس حدیث کو محدثین نے باب صلوۃ میں ذکر کیا ہے۔

پس اس حدیث سے مراد نماز جماعت کا ترک کرنا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ آخر خلیفہ بنانے میں اتنی جلدی کیا تھی؟ اور اس سے زیادہ حیران کن وہ بحث اور جھگڑا ہے جو مہاجرین اور انصار کے درمیان ہوا کیوں؟ کیا انصار غدیر کا واقعہ بھول گئے یا اس سے انکاری تھے؟ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خم غدیر کے میدان (جحفه) میں ایک لاکھ یا اس سے بیشتر جمع تھے۔ ان سب نے حدیث غدیر سنی۔ ان میں مدینے کا کوئی آدمی نہیں تھا اور علیؑ کی خلافت کا اعلان اوس اور خزرج کے قبائل تک نہیں پہنچا تھا؟ واقعہ غدیر(جحفه) کو گزرے تین ماہ کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا کہ قبیلہ خزرج کا سردار، جس نے اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ رسول خداؐ اور اسلام کی خلوص سے مدد کی تھی، خلافت کا دعویدار بن جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ اور وہ کیوں قریش سے مصالحت کی خاطر کہنے لگے: ایک امیر آپ سے اور ایک امیر ہم سے؟ کیا انہوں نے مسلمانوں کی امارت کو قبیلے کی سرداری سمجھ لیا تھا؟

امت اور دین کے غم خوار ان مسلمانوں نے سب سے پہلے اپنے پیغمبر کے کفن دفن کا بندوبست کیوں نہ کیا؟ جیسا کہ ہم نے لکھا ہے، انہیں ڈر تھا کہ کہیں فتنہ کھڑا نہ ہو جائے۔ کیونکہ ابو سفیان موقع کی تلاش میں تھا۔ لیکن بنی ہاشم میں سے کسی کو وہاں کیوں نہیں بلایا گیا؟ کیا ابو سفیان اور اس کی سازش اسلام کے لئے اس قدر خطرناک تھی کہ ذرا بھی دیر نہیں کی جا سکتی تھی؟ ابو سفیان کی ان دنوں کیا پوزیشن تھی؟ ایک چھوٹے سے دیہات نجران کا حکمران تھا۔ اگر اوس، خزرج، بنی ھاشم، بنی تمیم، بنی عدی، کے مہاجرین اور دوسرے مسلمان اکٹھے ہو جاتے تو بنی امیہ کا چھوٹا سا قبیلہ کیا کر سکتا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔

---

(۱) کنز العمال۔ صلوۃ حدیث ۲۶۷۲

کیا اس بات کا خطرہ تھا کہ اگر مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ کا انتخاب جلدی نہ کیا گیا تو کوئی بہت بڑا واقعہ پیش آ جاتا؟

ان چودہ صدیوں میں کئی مرتبہ یہ سوالات اٹھائے گئے ہیں اور ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقامات پر لکھا ہے کہ یہ جوابات زیادہ تر میدان مناظرہ میں حریف کو زیر کرنے کے لئے ہیں نہ کہ حقیقت کو واضح کرنے کے لئے۔

یوں لگتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد وہ لوگ زیادہ تر اس فکر میں تھے کہ جتنا جلدی ہو سکے حاکم کا انتخاب عمل میں لایا جائے اور اس بارے میں انہیں کم خیال تھا کہ حکومت چلائی کیسے جائے۔(۱) باالفاظ دیگر اسلام جن دو بنیادوں (دین و حکومت) پر استوار ہے ان کا زیادہ دارومدار حکومت پر تھا۔ گویا انہوں نے اپنے تئیں یہ سمجھ لیا تھا کہ جب مرکزی حکومت قائم ہو جائے گی اور حاکم برسر اقتدار آ جائے گا تو دوسرے کام خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ بات درست ہے اور ہم نے دیکھا بھی کہ مدینہ نے اپنی وحدت برقرار رکھتے ہوئے مرتدوں کے مقابلے میں قیام کیا اور انہیں ٹھکانے لگایا۔ اندرونی خلفشار ختم کرنے کے بعد مدینے کی حکومت کشور کشائی کے لئے تیار ہو گئی۔ لیکن اصول حکومت اور حکمران کے انتخاب کو دین سے جدا کیا جا سکتا ہے؟ خصوصاً جب شارع اسلام نے خود اس اصول اور بنیاد کو قائم کیا ہو؟ بہر حال اس واقعہ کو چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ نبی کریمؐ کی رحلت کے بعد جنہوں نے یہ اقدام کیا اور آئندہ کے لئے بنیاد رکھی وہ دین کے ہمدرد تھے یا انہیں حکومت کے چھن جانے کا خوف لاحق تھا۔

شائد انہیں دونوں چیزوں کا خیال ہو اور انہوں نے سوچا ہو کہ اگر ایسی قدآور شخصیت جو عالم بھی ہو، متقی و پرہیز گار بھی ہو، خاندان رسولؐ میں سے ہو اور موقع ملنے پر بہت سے افراد کو اپنا حامی بھی بنا سکتی ہو، اس اجتماع میں آ جائے تو ممکن ہے حاکم کی طاقت وقدرت کو متزلزل کر دے۔ تاریخ طبری میں مذکور یہ چھوٹا سا اشارہ اسی حقیقت کی نشاندہی کر رہا ہے:

> رسول اللہؐ کی بیٹی کی رحلت کے بعد حضرت علیؑ نے دیکھا کہ لوگوں نے ان سے منہ پھیر لیا ہے۔(۲)
>
> ہاں ایسا ہی ہوا کہ علیؑ کے بیٹے نے کہا:
>
> **الناس عبید الدنیا ... فاذا مُحِّصو بالبلاء قل الدیانون**
>
> لوگ دنیا کے بندے ہیں.... جب آزمائے جاتے ہیں تو دینداروں کی

---

(۱) تحلیلی از تاریخ اسلام حصہ اول ص ۹۱

(۲) طبری ج ۴ ص ۱۸۲۵

تعداد کم ہوتی ہے۔

میں نے یہ بات دوسری جگہ پر لکھی ہے کہ میں کسی مسلمان کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا اور میں اپنے آپ کو ایسے کام میں ملوث نہیں کرنا چاہتا جس میں بعض مسلمانوں نے دین یا دنیا کی خاطر اپنے آپ کو ملوث کیا ہے۔(۱) وہ اپنے پروردگار کے پاس جا چکے ہیں۔ وہ اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں۔ اگر انہوں نے یہ سب دین کی خاطر کیا تھا تو اللہ تعالی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ البتہ اس مقام پر **شہر ستانی** کی بات بڑی معنی خیز ہے. وہ لکھتے ہیں:

> اسلام میں کسی زمانے میں بھی دین کی بنیاد پر اتنی تلوار نہیں اٹھائی گئی جتنی حکومت و قیادت کے مسئلے پر اٹھائی گئی ہے۔ (۲)

اس کے باوجود میں نے ایک اور کتاب میں لکھا ہے کہ اگر مسلمانوں کی بعد والی نسلیں مہاجرین اور انصار کے خلوص اور ایثار کے جذبوں سے سرشار ہوتیں تو آج مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

☆☆☆☆☆

---

(۱) پس از پنجاہ سال ص ۳۰ طبع دوم

(۲) الملل والنحل ج ۱ ص ۱۶۔

بَلٰی کَانَت فِی اَیدِینا فَدَك مِن کُلِّ مااَظَلَّتهُ السَّماء (۱)
ہاں ان سب چیزوں میں سے جن پر آسمان نے اپنا سایہ ڈالا،
صرف فدک ہمارے ہاتھ میں تھا۔

اس واقعہ کو ابھی چندروز نہ گزرے تھے کہ ایک اور سانحہ رونما ہوا۔ فدک کی سرزمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ لہذا اسے رسولؐ کی بیٹی کے پاس نہیں رہنا چاہیے۔ خلیفہ مسلمین نے اپنی رائے اور نظر کے مطابق فیصلہ کیا۔ جو کچھ (فئی) پیغمبر اکرمؐ کے اختیار میں تھا وہ مسلمانوں کے بیت المال کا حصہ ہے اور اب وہ خلیفہ کے کنٹرول میں ہونا چاہیے۔ اس لئے حاکم کے حکم پر فدک کے علاقے سے فاطمہ زہرا(س) کے کارندوں کو بے دخل کر دیا گیا۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ چونکہ فدک فوجی طاقت سے حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے رسول اکرمؐ سے صلح کرلی تھی۔ اس لیے یہ علاقہ آپؐ سے ہی متعلق تھا۔(یعنی آپؐ ہی سے مختص تھا) پہلے پہل آپؐ اس کی آمدن بنی ہاشم کے ضرورت مندوں پر خرچ کرتے تھے۔ مثلاً لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی بیاہ اور دوسرے امور میں صرف کرتے تھے۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ قطعہ اپنی بیٹی فاطمہ سلام اللہ علیہا کو بخش دیا(۲) اب خلیفہ نے یہ فیصلہ دیا کہ پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں کے حکمران کی حیثیت سے اس میں تصرف کرتے تھے نہ کہ مالک کی حیثیت سے۔ لہذا اب بھی اسے حاکم کے کنٹرول میں ہونا چاہیے اور یہ اختیار حاکم کو حاصل ہے نہ کہ رسول اللہ کی بیٹی کو۔ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا مجبوراً حضرت ابو بکر کے دربار میں گئیں۔ ان دونوں کے درمیان یہ مکالمہ ہوا:

فاطمہ (س): ابو بکر! جب تم مرو گے تو تمہاری میراث کس کو ملے گی؟

ابو بکر: میرے بیوی بچوں کو۔

---

(۱) عثمان بن حنیف کے نام امیر المومنین علی علیہ السلام کے خط سے اقتباس

(۲) تفسیر در المنثور ج ۴ ص ۱۷۷۔ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۶ و ص ۹۷

فاطمہ (س): لیکن ہماری بجائے تم رسول اللہؐ کے وارث کیسے بن گئے ہو؟

ابو بکر: رسول کی بیٹی! تمہارے باپ نے درہم و دینار اور سونا چاندی نہیں چھوڑا کہ تم اس کی وارث بنو۔

فاطمہ (س): لیکن خیبر اور فدک کا ہمارا حصّہ کہاں گیا؟

ابو بکر: میں نے تمہارے باپ سے سنا ہے: میں جب تک زندہ ہوں، اس زمین سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ جب فوت ہو جاؤں تو یہ تمام مسلمانوں کا مال ہے۔(۱)

فاطمہ (س): لیکن رسول اللہ نے اپنی زندگی میں اس زرعی زمین کو مجھے بخش دیا تھا۔

ابو بکر: کیا تمہارے پاس کوئی گواہ ہے؟

فاطمہ (س): ہاں علیؑ اور ام ایمنؓ اس کے گواہ ہیں۔

ابو بکر: نبی کی بیٹی! تم جانتی ہو کہ ام ایمنؓ عورت ہے، اس کی گواہی مکمل نہیں ہے۔ ایک اور عورت کو ساتھ گواہ ہونا چاہیے یا مرد گواہ ہونا چاہیے۔

اس طرح فدک حکومت کے قبضے میں آ گیا۔

کیا یہ معاملہ اسی طرح ختم ہو گیا؟ کیا پیغمبر اکرمؐ نے فدک اپنی بیٹی کو نہیں بخشا تھا؟ کیا بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں راویوں اور دیگر گروہوں سے جہاں تک بن پڑا اس واقعہ کو بڑھایا چڑھایا نہیں ہے۔ حدیثوں کو گھڑا اور حدیثوں کی عبارتوں کو کم و زیادہ نہیں کیا۔ ہم نے کئی بار تکرار کی ہے کہ ان ادوار میں حدیث سازی اور حدیث کی عبارتوں کو تبدیل کرنا ایک معمول بن گیا تھا۔

ناقدین حدیث نے جعلی حدیثوں کی تعداد چار لاکھ سے بھی زیادہ بیان کی ہے۔(۲) اس مقام پر حقیقت کی پہچان کے لئے خارجی قرائن و علامات سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد دو سال کے دوران فدک مختلف ہاتھوں میں رہا ہے۔ مختلف افراد کی تحویل میں دیا جاتا رہا ہے۔ حضرت عثمان نے اسے مروان بن حکم کی ملکیت میں دے دیا(۳) اور ایک قول کے مطابق معاویہ نے مروان کو دیا۔(۴) اموی حکومت کے اختتام تک فدک اس

---

(۱) فتوح البلدان ج ۱ ص ۳۶۔ انساب الاشراف ص ۵۱۹۔

(۲) الغدیر ص ۲۹۰ ج ۵

(۳) المعارف ص ۸۴۔ تاریخ ابو الفدا ج ۱ ص ۱۶۸۔ سنن بیہقی ج ۶ ص ۳۰۱۔ العقد الفرید ج ۵ ص ۳۳۔ شرح نہج البلاغۃ ج ۱ ص ۱۹۸ نقل از الغدیر ج ۸ ص ۲۳۶۔ ۲۳۸

(۴) فتوح البلدان ج ۱ ص ۳۷

طرح مروانیوں کے قبضے میں رہا۔

جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ بنے توانہوں نے کہا:

فدک پیغمبرؐ کی ملکیت تھا۔ آپؐ اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لے لیتے، باقی بنی ہاشم کے ضرورتمندوں کو بخش دیتے تھے یا ان کے شادی بیاہ کے معاملات میں خرچ کرتے تھے. رسولؐ اللہ کی رحلت کے بعد جناب فاطمہ (س) نے ابو بکر سے کہا کہ فدک ہمیں لوٹا دے لیکن وہ نہ مانے۔ عمر نے بھی ابو بکر کا طرز عمل اختیار کیا۔ گواہ رہنامیں فدک کی پیداوار کو انہی مصارف میں خرچ کروں گا جس میں وہ پہلے خرچ ہوتی تھی۔(۱)

مامون کا فدک کوفرزندان فاطمہ کے حوالے کر دینا

سنہ ۲۱۰ ہجری میں خلیفہ مامون نے فدک اولاد زہرا (س) کو واپس کردیا۔ اس کی طرف سے مدینے کے گورنر قثم بن جعفر کو جو حکمنامہ جاری کیا گیااس کی عبارت یوں ہے:

امیر المؤمنین دینداری، منصب خلافت اور رسولؐ خدا سے رشتہ داری کی بناء پر سنت نبویؐ کی پیروی، رسولؐ کے احکام کے اجراء کرنے، مستحقوں غریبوں اور مسکینوں کو صدقات اور عطیات دینے کے باقی مسلمانوں سے زیادہ سزاوار ہیں۔ اللہ امیر المومنین کو اس کی توفیق عنایت فرمائے اور اسے غلطیوں سے دور رکھے اور اسے ایسا کام کرنے کی ہمت دے جو اس کی رضا اور قربت کا باعث ہے۔

رسول اللہؐ نے فدک اپنی بیٹی فاطمہ زہرا(س) کو بخش دیا تھا۔ ہبہ کر دینے کا مسئلہ خود رسول اکرمؐ کے زمانے میں واضح اور روشن امر تھا۔ خاندان رسولؐ میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ فاطمہ(س) جب تک زندہ رہیں اپنا حق مانگتیں رہیں۔ اب امیر المومنین نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ فدک فاطمہ (س) کے وارثوں کو لوٹا دیا جائے اور ان کی تحویل میں دے دیا جائے اور حق عدالت کو قائم کریں۔ رسول اللہؐ کے حکم کو نافذ اور صدقہ کو جاری کرکے وہ پیغمبرؐ کے قرب کے خواہاں ہیں۔ امیر المومنین نے حکم دیا ہے کہ اس حکم کو عدالتی فیصلوں میں درج کریں اور دوسرے شہروں میں حکومت کے نمائندوں تک یہ بات پہنچا دیں۔ رسول اللہؐ کی

---

(۱) فتوح البلدان ج ۱ ص ۳۶

وفات کے بعد ایام حج کے دوران یہ رسم بن گئی تھی کہ ان ایام میں مسلمانوں میں اعلان کیا جاتا کہ جو کوئی کسی پر دعوی کرے اور گواہ بھی پیش کرے اس کی بات کو سنو اور اسے مان لو۔ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اس بات کی زیادہ حقدار ہیں کہ رسول خداؐ نے انہیں جو کچھ دیا، اس دعوئی میں ان کی تصدیق کی جائے۔ امیر المومنین اپنے غلام مبارک طبری کو لکھتے ہیں فدک کو، جو کچھ ہے، ان تمام حقوق کے ساتھ جو اس سے منسوب ہیں، اس میں کام کرنے والے تمام غلاموں اور جس قدر غلہ اس میں پیدا ہوتا ہے اور دوسری متعلقہ چیزوں کے ساتھ رسول خدا کی بیٹی فاطمہ (س) کے ورثاء کی تحویل میں دے دیا جائے۔

امیر المومنین نے فدک کی تولیت (سرپرستی اور تمام امور کی ذمہ داری) محمد بن یحی بن حسین بن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالبؑ کو سونپی ہے. تاکہ وہ اس آمدن کو اس کے مستحقوں تک پہنچائیں۔ اے قثم بن جعفر! امیر المومنین کے اس حکم اور خدا کی اطاعت سے جو اس نے اس پر واجب کی ہے اور اپنے رسولؐ کے تقرب کے حصول کی جو توفیق اسے نصیب ہوئی ہے، تم بھی آگاہ ہو جاؤ اور دوسروں کو بھی آگاہ کردو۔ تم مبارک طبری کی جگہ پر محمد بن یحی اور محمد بن عبد اللہ کو منصوب کردو اور فدک کی پیداوار بڑھانے اور اسے مزید آباد کرنے کے لئے تم ان کی مدد کرو. انشاء اللہ چہار شنبہ دوم ذوالقعدہ سنہ ۲۱۰ھ۔(۱)

دوسری اور تیسری صدی ہجری کے اوائل کے شیعہ شاعر دعبل خزاعی نے اس بارے میں کہا ہے:

اَصبحَ وَجهُ الزَّمانِ قَد ضَحِکا بِرَدِّ مامُونِ هاشِمَ فَدَکَا (۲)

زمانے کا چہرہ متبسم ہو گیا جب مامون نے فدک ہاشم کو واپس کر دیا

مامون کے حکمنامے میں ایک جملہ نہایت اہمیت کا حامل ہے:

فاطمہ کو فدک بخشنے کا مسئلہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں نہایت واضح تھا اور

---

(۱) بلاذری فتوح البلدان ج ۱ ص ۳۷۔۳۸

(۲) دیوان دعبل ص ۲۴۷

اس کے بارے میں خاندان رسالت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

یہ فرمان تیسری صدی ہجری کے آغاز میں اور طبری کی وفات سے ایک سال اور بلاذری کی وفات سے ایک سو تیس سال پہلے جاری کیا گیا اور لکھا گیا ہے: یہ خلیفہ کا فرمان ہے اپنے ملازم کی طرف۔ یعنی یہ حکومتی سند اور باقاعدہ حکم تھا۔ اس حکم کے مذکورہ جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد ابتدائی ایام میں جو کچھ رونما ہوا، وہ سیاسی مصلحت کے پیش نظر تھا اور اب سیاسی مصلحت نے سابقہ روش کو تبدیل کر دیا۔ اگر مامون کا مقصد خاندان علیؑ کی دلجوئی اور شیعوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھا تو عمر بن عبد العزیز کی روش اپناتا اور صرف فدک کی پیداوار اور آمدن اولاد فاطمہ (س) پر خرچ کرتا۔ اسے سابقہ خلفاء کے کردار پر خط بطلان کھینچنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس کے علاوہ اگر فدک ایک صدقہ تھا جسے رسول اللہؐ مسلمانوں کے امیر ہونے کی وجہ سے اپنے مصرف میں لاتے تھے تو پھر رسول خداؐ کی رحلت کے صرف پچیس سال بعد خلیفہ اسے کیوں اپنے رشتہ داروں کو بخش دیتا ہے۔ بالفرض عمر بن عبدالعزیز کی تشخیص صحیح ہو (جو کچھ بلاذری نے لکھا ہے وہ درست ہو) کہ نبی کی بیٹی (س) کی اس زرعی زمین پر ملکیت مسلم نہ ہو اور یہ ایک صدقہ ہو جس کی آمدن جناب فاطمہ (س) اور ان کے بعد ان کی اولاد کے لئے ہونی چاہیے تھی، جیسا کہ اس بارے میں صادر ہونے والے اپنے فرمان میں خود اس نے لکھا ہے۔

جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے آغاز میں ذکر کیا ہے کہ دوران تاریخ اس مسئلے پر جتنی بحث کی گئی ہے یا کلامی، تاریخی اور سیرت کی کتب میں فصول اور ابواب اس سے مختص کیے گئے ہیں یہ سب اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ گاؤں جناب فاطمہ (س) اور ان کی اولاد کے ہاتھوں یا حکومت وقت کے قبضے میں رہے اور اگر فاطمہ (س) خلیفۂ وقت کے دربار میں گئیں اور اس سے اپنا حق مانگا تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ اپنے اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کی خاطر یہ سب کچھ کر رہی تھیں بلکہ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ نص کے مقابلے میں یہ پہلا اور آخری اجتہاد نہیں ہے۔ کیونکہ کل ایک اور اجتہاد کیا جائے گا اور اسی طرح یہ سلسلہ چل نکلے گا۔ اس وقت اس کی ضمانت کون دے گا کہ ایک اور خلیفہ آ کر اپنے اجتہاد کے بل بوتے پر دین میں بنیادی تبدیلیاں نہیں کرے گا؟ جیسا کہ اجتہاد کے طرفداروں نے بھی اس بات کا اقرار کیا ہے کہ آج اگر فاطمہ (س) کے دعویٰ اور ان کے گواہوں کی بناء پر فدک انہیں لوٹا دیا جائے تو کل کو دوسرے حقوق کا مطالبہ کریں گی۔ فاطمہ زہرا (س) کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ اس واقعہ کے چالیس سال بعد حکومت میں ایسی بنیادی تبدیلیاں لائی گئیں جو نہ صرف سنت رسولؐ کے خلاف تھیں بلکہ خلفاء راشدین کے زمانے میں جاری سیرت کے بھی خلاف تھیں۔

رسول خداؐ کے مدعا علیہان کے کردار کے بارے میں نتائج اخذ کرتے ہوئے ابن ابی

ابن ابی الحدید معتزلی اپنی طنز آمیز ظرافت کے ساتھ ایک نکتہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

میں نے مغربی بغداد کے مدرس علی بن فاروقی سے پوچھا: کیا فاطمہ (س) سچ کہتی تھیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں! پھر اس نے مسکرا کر کہا: اگر اس دن فدک انہیں دے دیتے، تو دوسرے دن اپنے شوہر کی خلافت کی دعویدار بن جاتیں اور خلیفہ ان کی بات ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ وہ پہلے مان چکا ہے کہ رسولؐ کی بیٹی فاطمہ (س) جو کچھ کہتی ہیں سچ کہتی ہیں۔(۱)

ہاں! جب فاطمہ زہرا (س) نے دیکھ لیا کہ خلیفہ اپنے اجتہاد اور رائے سے باز نہیں آئے گا اور اسے پہلے سے جاری سنت پر ترجیح دے گا تو انہوں نے مسلمانوں کے عام اجتماع میں اپنی شکایت پیش کرنے کا ارادہ کر لیا۔

---

(۱) شرح نہج البلاغۃ ج ۱۶ ص ۲۸۴

اَطْلَعَ الشَّيْطَانُ رَاسَهُ، مِنْ مَغْرِزِهِ صَارِخاً لَكُمْ فَوَجَدَكُمْ لِدُعَائِهِ مُسْتَجِيبِيْنَ

شیطان نے اپنی کمین گاہ سے سر نکالا اور تمہیں چلا کر پکارا اور تمہیں اس کی دعوت پر لبیک کہنے والا پایا

(اقتباس از خطبہ زہراؑ)

رسول اکرمؐ اور صدر اسلام کے زمانے میں عدل وانصاف اور دادرسی کا مرکز صرف مسجد تھی۔ جس کسی کو کسی بڑے سے شکایت ہوتی، جس کسی کا حق چھن جاتا، جس کسی کے ساتھ حاکم یا افسر ظلم کرتا، جو بھی حاکم یا افسر کا رویہ اور عمل سنت نبویؐ سے ہٹ کر دیکھتا وہ اپنی شکایت، اپنی فریاد، اپنا نقطہ نظر مسلمانوں کے سامنے پیش کرتا اور سب مسلمانوں کا فرض ہوتا کہ وہ ممکنہ حد تک اس کی مدد کریں اور اس کے حق کی بازیابی کے لئے کوشش کریں۔

رسول اللہؐ کی بیٹی کا بھی حق چھین لیا گیا اور حق چھین کر سنت نبیؐ کو بھی پامال کیا گیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ بہت جلد حکومت اسلامی پر قوم وقبیلہ کا رنگ چڑھ جائے گا۔ (یہ بات تیس سال بعد پوری ہو گئیں) انہوں نے دیکھا کہ مہاجرین جو قبیلہ قریش سے تھے، انہوں نے انصار کو سیاسی میدان سے خارج کردیا اور انصار جو پیغمبر اکرمؐ کے مددگاروں میں سے تھے آپ کے بعد خلافت کے دعویدار بن گئے۔(۱) اسلام سے پہلے دور میں قریش اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور ممتاز خیال کرتے تھے اور انہوں نے اپنے لئے خاص امتیازات بنا لیے تھے۔ اسلام کے آنے سے وہ سب امتیاز ختم ہو گئے۔ اب پھر ان لوگوں نے سر اٹھایا ہے اور خلافت مسلمین کو اپنا حق سمجھ رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس منصب کا اہل کسی فضیلت اور معنوی امتیاز، جیسے علم، تقویٰ اور عدالت کی بنیاد پر نہیں سمجھ رہے تھے۔ بلکہ صرف اور صرف قریش سے ہونے کی بنیاد پر وہ ایسا کر رہے تھے۔

بلاغات النساء طبع بیروت ص ۲۳۔۲۴

رسول اللہؐ کی بیٹی ان اجتہادات بلکہ بہتر الفاظ میں ان جدید افکار کے سامنے خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ انہیں مسلمانوں کو اس سنت شکنی کے عواقب سے خبردار کرنا چاہیے تھا۔ اگر یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں آ گئی اور وہ باز آ گئے تو بہت ہی بہتر، لیکن اگر انہوں نے جناب فاطمہ(س) کی باتوں کو نہ مانا تو وہ پروردگار عالم کے ہاں جوابدہ نہ ہوں گی۔

ان وجوہات کی بنا پر جناب فاطمہؑ نے شکایت کو عوامی اجتماع میں بیان کرنے کا فیصلہ کیا۔ جناب زھراء(س) اپنی رشتہ دار خواتین کے گھیرے میں مسجد کی طرف روانہ ہوئیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب وہ مسجد کی طرف جا رہی تھیں تو ان کا طریقہ اپنے والد گرامی حضرت محمد (ص) وژ طرح بہت باوقار اور قدم اٹھانے کا انداز بھی والد گرامی کی طرح تھا۔ حضرت ابو بکر چند مہاجرین و انصار کے ساتھ مسجد میں بیٹھے تھے۔ حضرت فاطمہ (س) اور حاضرین کے مابین ایک پردہ لٹکایا گیا۔ رسول خداؐ کی بیٹی نے پہلے آہ و فریاد کر کے حاضرین مجلس کو لرزا دیا اور سب رونے لگے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئیں۔ جب لوگوں نے رونا بند کیا اور خاموش ہو گئے تو انہوں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

ان کا یہ خطبہ، تاریخی، خوبصورت، بلیغ، رسا، شکایت آمیز، خوف دلانے والا اور آتشیں ہے۔

اس خطبے کی سب سے قدیم سند جو مصنف کی دسترس میں ہے وہ ابوالفضل احمد ابی طاہر مروزی (پیدائش ۲۰۴، وفات ۲۸۰ ہجری) کی کتاب بلاغات النساء ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب اسلامی دور کی عرب عورتوں کے خطبات، اقوال اور اشعار کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا آغاز جناب عائشہ بنت ابو بکر کے ملامت آمیز خطبے سے ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا خطبہ جناب زہرا سلام اللہ علیہا کے بیان پر مشتمل ہے۔

احمد بن ابی طاہر نے اس خطبے کو دو صورتوں اور دو روایتوں کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن اس کے بعد کی کتب میں دونوں روایتیں آپس میں مخلوط ہو گئیں ہیں اور خطبہ ایک شکل میں ذکر ہوا ہے جو دونوں صورتوں پر مشتمل ہے۔

مصنف نے احمد بن ابی طاہر کی تحریر کے الفاظ اور عبارت کی ترتیب کے لحاظ سے علی بن عیسیٰ اربلی (وفات ۶۹۳ ہجری) کی کتاب کشف الغمہ کی پیروی کی ہے۔ اس خطبے کی سند اور متن کے بارے میں احمد ابن ابی طاہر سے کئی سال پہلے بحث و گفتگو انجام پا چکی ہے۔ احمد بن ابی طاہر کہتے ہیں:

> میں نے ابو الحسن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالبؑ سے کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ یہ خطبہ جناب فاطمہ(س) کا نہیں ہے۔ بلکہ ابو العیناء نے اسے گھڑا ہے۔
>
> انہوں نے جواب دیا: میں نے آل ابو طالبؑ کے بوڑھوں کو دیکھا ہے کہ

وہ اپنے آباء سے اسے نقل کرتے ہیں اور اپنے بیٹوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس خطبے کو میرے باپ نے میرے دادا سے اور انہوں نے جناب فاطمہ(س) سے روایت کیا ہے۔بزرگان شیعہ نے ابو العیناء کے دادا کی پیدائش سے بھی پہلے اسے نقل کیا ہے اور ایک دوسرے کو اس کی تعلیم دی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا:لوگ کس طرح فاطمہ زھراء(س) کے خطبے کا انکار کرتے ہیں۔ جبکہ وہ حضرت عائشہ کے والد کی موت پر حضرت عائشہ کے خطبے کو قبول کرتے ہیں۔(۱)

اس گفتگو کو اسی شکل و صورت میں ابن ابی الحدید نے سید مرتضٰی سے اور انہوں نے مرزبانی اور اس نے اپنی اسناد کے ساتھ احمد بن ابی طاہر کے بیٹے عبیداللہ سے نقل کیا ہے۔(۲)

ہم نے دیکھا کہ بلاغات النساء(اس کے تینوں نسخوں میں یہ بات نقل ہوئی ہے اور یہ تینوں مصنف کے پاس ہیں) کے مؤلف کے بقول یہ گفتگو اس کے اور ابو الحسن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالبؑ کے درمیان ہوئی ہے۔(۳)

لیکن اس روایت کو اس سند کے ساتھ قبول کرنا مشکل ،بلکہ نا قابل قبول ہے۔ کیونکہ زید بن علی بن حسین سن ۱۲۲ ہجری میں شہید ہوگئے تھے اور احمد بن ابی طاہر جیسا کہ ہم نے لکھا ہے ۲۰۴ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اس بناء پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے یہ سوال زید بن علی بن حسین سے کیا ہے۔

مسلّم ہے کہ حدیث بیان کرنے والوں سے حدیث کی سند میں بھول ہوئی ہے۔ جہاں تک میری تحقیق ہے، صرف علم رجال کے معاصر عالم جناب شیخ محمد تقی شوشتری نے اس غلطی کو پالیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ گفتگو احمد بن طاہر اور زید بن علی بن حسین بن زید کے درمیان ہوئی ہے۔(۴) اور اس نظریے کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بلاغات النساء کے مؤلف نے اپنی کتاب میں دوسری جگہ پر ایک حدیث زیدبن علی بن حسین بن زیدعلوی سے نقل کی ہے اور یہ دونوں زید ایک ہی ہیں۔(۵)

---

(۱) بلاغات النساء ص ۲۳

(۲) شرح نہج البلاغۃ ج۱۶ ص ۲۵۲

(۳) طبع بیروت ص ۲۳ ۔ طبع نجف ص ۱۲ ۔ طبع قم ص ۱۲

(۴) قاموس الرجال ج ۴ ص ۲۵۹

(۵) ص ۱۷۵ طبع قم

حیران کن بات یہ ہے کہ یہ غلطی بلاغات النساء کی دونوں اشاعتوں میں برقرار رہی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یہی غلطی ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ میں سرایت کر گئی۔

بہرحال اس قدیمی سند کے علاوہ یہ خطبہ اہل سنت اور شیعہ کی معتبر کتابوں میں بھی نقل ہوا ہے۔

میرا گمان ہے کہ بعض سیرت نگاروں اور محدثین اہل سنت کی اس خطبے کو جعلی قرار دینے کی وجہ (اگر خدانخواستہ وہ نفس پرستی کا شکار نہ ہوئے ہوں تو) یہ ہے کہ خطبہ لفظی اور معنوی لحاظ سے بہت زیادہ آراستہ ہے۔ خصوصاً اس میں مسجع عبارات موجود ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب کوئی مقرر عمومی اجتماع میں تقریر کرے گا تو اس کی گفتگو نثر مرسل ہو گی۔ خصوصاً جب متکلم شکایت اور دادخواہی کے مقام پر ہو۔

اگر تو ہم کا موجب یہی امر ہے اور ان کا معترض ہونا حسد و کینہ کی وجہ سے نہیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ رسول زادی کے خطبے میں، تشبیہ، استعارہ اور کنایہ استعمال ہوا ہے۔ان لفظی اور معنوی صنائع کی مثالیں صحابہ کرام اور صدر اسلام کے لوگوں کے مختصر کلاموں میں بہت زیادہ ملتی ہیں چہ جائیکہ خاندان پیغمبرؐ میں۔ لفظی صنائع میں سے موازنہ، ترصیع، تضاد اور ان سب سے زیادہ مسجع عبارات ،اس خطبے میں موجود ہیں۔

مسجع گوئی کا ہنر خاندان پیغمبرؐ میں ایک فطری امر تھا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام سے پہلے مکہ میں مسجع کلام کہنے کا عام رواج تھا۔ قرآن کریم کی ابتدائی مکی آیات اس صنعت سے بھری پڑی ہیں۔

رسول اکرمؐ کی بیٹی فاطمہ(س)، ان کے شوہر علی ابن ابی طالبؑ اور ان کے بچے قانون وراثت کے لحاظ سے اور قرآنی آیات کے اثرات کی وجہ سے مسجع گفتگو کرنے کے عادی بن گئے تھے۔ علیؑ کے خطبات میں بہت کم ایسے جملے ملیں گے جو مسجع نہ ہوں۔ ان کی اولاد بھی ایسی ہی تھی۔ جب حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے ابن زیاد کے دربار میں اس کی دل آزار باتوں کا جواب دینا چاہا تو یوں گویا ہوئیں:

> لَقَدْ قَتَلْتَ کَهْلِي.وأَبَرْتَ اَهْلِي. وَ قَطَعْتَ فَرْعِي وَ اجْتَثَثْتَ اَصْلِي. فَاِنْ یَشْفِکَ هٰذٰا فَقَدْ اِشْتَفَیْتَ. (طبری ج ۷ ص ۳۷۲)
>
> ہمارے سردار کو تو نے مارا، ہمارا سارا خاندان تو نے اجاڑا۔ہمارے درختوں کو تو نے کاٹا ہماری جڑوں کو تو نے اکھاڑا، اگر تیرا کلیجہ اس سے ٹھنڈا ہوتا ہے تو ٹھنڈا کرلے۔

ابن زیاد نے کہا: کیا مسجع گفتگو کر رہی ہو۔ تیرا باپ بھی مسجع کلام کہتا تھا۔

خاندان بنی ہاشم کے علاوہ عبد مناف کے قبیلے کے اکثر مرد و زن اس ہنر کے حامل تھے۔ جس دن معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ نامزد کرنا چاہا تو اس نے عبداللہ ابن زبیر سے کوئی رائے معلوم کی تو اُس نے جواب دیا:

اِنّی اُنادِیْکَ وَ لاٰ اُناجِیْکَ.اَنَّ اَخاکَ مَنْ صَدَقَکَ . فَانْظُرْ قَبْلَ اَنْ تَتَقَدَّمَ وَ تَفَکَّرْ قَبْلَ اَنْ تَنْدَمَ. فَاِنَّ النَّظَرَ قَبْلَ التَقَدُّمِ وَالتَّفَکُّرَ قَبْلَ التَّنَدُّمِ.

بات کروں میں صاف صاف۔ نہ کوئی پردہ نہ کوئی راز۔ سن لے اپنے بھائی کی تو سچی بات۔ ندامت سے پہلے تو سوچ لے۔ قدم اٹھانے سے پہلے تو کرلے ذرا غور۔ کیونکہ قدم اٹھانے سے پہلے دیکھ بھال لینا اچھا اور پشیماں ہونے سے غور و فکر کرنا اچھا۔

معاویہ ہنسا اور کہا:

اے مکار لومڑی! بڑھاپے میں قافیہ گوئی سیکھ لی ہے۔ اتنی لمبی مسجع عبارت کی ضرورت نہیں ہے۔(۱)

مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ اس خطبے کو نثر میں منتقل کرنے میں جہاں تک ممکن ہو لفظی اور معنوی صنائع کو محفوظ رکھا جائے۔ خصوصاً قافیہ گوئی کا تاحد امکان خیال رکھا جائے اور اگر ان جملوں کے ترجمے میں کسی لفظ کو جا بجا کیا گیا تو صرف اسی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے کیا گیا ہے۔ خطبے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی مااَنْعَمَ .وَلَهُ الشُّکْرُ عَلٰی مااَلْهَمَ .وَالثَّناءُ بِما قَدَّمَ مِنْ عُمُومِ نِعْمَةٍ اِبْتَداها.وَسُبُوغِ آلاٰءٍ اَسْداها.وَاحْسانٍ مِنَنٍ والاٰها.جَمَّ عَنِ اْلاِحْصاءِ عَدَدُها . وَنَایٰ عَنِ لْمُجازاتِ اَمَدُها. و تَفاوَتَ عَنِ اْلاِدْراکِ اَبَدُها

حمد و ستائش ہے پروردگار کی اس کی نعمات پر شکر ہے اس کا ان افکار و معارف پر جو اس نے الہام کئے، اس کے چشمہ لطف سے پھوٹنے والی بیشمار نعمتوں پر حمد و ثنا ہے اور اس کی بے پناہ بخشش پر جو اس نے عطا فرمائی۔ اس کے پے درپے احسانات پر قربان جاؤں۔ اس کی مسلسل نعمات جو شمار نہیں کی جاسکتیں، ان کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا، اس کی نعمات کی گہرائیوں اور رازوں تک پہنچنا ہماری عقلوں کی دسترس سے باہر ہے۔

وَاسْتَتَنَ الشُکْرَ بِفَضائِلِها.وَاسْتَحْمَدَ اِلَی الْخَلاٰئِقِ باءِ جْزالِهَا.وَثَنّیٰ بِالنَّدْبِ اِلَیٰ اَمْثالِها. و اَشْهَدُ اَنْ لاٰ اِلٰهَ اِلاَّ اَللّٰهُ. کَلِمَةٌ جَعَلَ اْلاِخْلاٰصَ تَاْوِیلَها . وَضَمَّنَ الْقُلُوبَ مَوْصُولَها.

اس نے شکر کو نعمات میں اضافے کا سبب بنایا۔ حمد کو ثواب میں زیادتی کا موجب قرار دیا۔ دعاؤں کے کرنے سے اپنی عطاء و بخشش میں اضافہ کیا۔ میں گواہی دیتی ہوں کہ خدا یکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس گواہی کا ترجمان حد درجہ خلوص ہے اور اس عقیدے کی بنیاد بابصیرت قلوب ہیں۔

وَاَنارَ فِی الْفِکْرَةِ مَعْقُولَها .و اَلْمُمْتَنِعُ مِنَ اْلاَبْصارِ رُؤْیَتُهُ . وَمِنَ اْلاَوْهامِ اْلاِحاطَةُ بِهِ

اس تک پہنچنے کے لئے چراغ دانش ہے۔ وہ خدا جسے آنکھیں دیکھ نہیں سکتی اور انسانی افکار اور تصورات اس کا احاطہ نہیں کرسکتے۔

---

(۱)عقد الفرید ج ۵ ص ۱۱۰ ـ ۱۱۱

إِبْتَدَعَ الأشياءَ لا مِنْ شَيْءٍ قَبْلَها . وَاحْتَذاها بلاامثالٍ . لِغَيْرِ فائِدَةٍ زادَتْهُ إلاّ إظْهاراً لِقُدْرَتِهِ . وَتَعَبُّداً لِبَرِيَّتِهِ .وَ إعْزازاً لِدَعْوَتِهِ .ثُمَّ جَعَلَ الثَّوابَ عَلىٰ طاعَتِهِ . وَالْعِقابَ عَلىٰ مَعْصِيَتِهِ . زِيادَةً لِعِبادِهِ عَنْ نِقْمَتِهِ . وَحِياشاً لَهُمْ اِلىٰ جَنَّتِهِ .

وَاَشْهَدُ اَنَّ اَبي مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ .إِخْتارَهُ قَبْلَ اَنْ يَجْتَبِلَهُ . وَاصْطَفاهُ قَبْلَ اَنِ ابْتَعَثَهُ . وَسَمّاهُ قَبْلَ اَنْ اسْتَنْجَبَهُ . اِذِ الْخَلائِقُ بِالْغُيُوبِ مَكْنُونَةٌ . وَبِسِتْرِ الأهاوِيلِ مَصُونَةٌ . وَبِنِهايَةِ الْعَدَمِ مَقْرُونَةٌ عِلْماً مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ بِمآيِلِ الأُمُورِ. وَ إحاطَةً بِحَوادِثِ الدُّهُورِ. وَمَعْرِفَةً بِمَواضِعِ الْمَقْدُورِ. إِبْتَعَثَهُ اللّٰهُ تَعالىٰ عَزَّوَجَلَّ إِتْماماً لِأَمْرِه . وَعَزِيمَةً عَلىٰ إِمْضاءِ حُكْمِهِ . فَرَأىٰ (ص) الأُمَمَ فِرَقًا فِي أدْيانِها . عُكَّفًا عَلىٰ نِيرانِها . عابِدَةً لِأَوْثانِها .مُنْكِرَةً لِلّٰهِ مَعَ عِرْفانِها .

فَأَنارَاللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ ظُلَمَها. وَفَرَّجَ عَنِ الْقُلُوبِ بُهَمَها . وَجَلىٰ عَنِ الأَبْصارِ غُمَمَها . ثُمَّ قَبَضَ اللّٰهُ نَبِيَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ قَبْضَ رَأْفَةٍ وَاخْتِيارٍ . رَغْبَةً بِأَبي صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَنْ هٰذِهِ الدّارِ . مَوْضُوعًا عَنْهُ الْعِبْءُ وَالأَوْزارُمُحَفَّفٌ بِالْمَلائِكَةِ الأَبْرارِ وَمُجاوَرَةِ الْمَلِكِ الْجَبّارِ وَ رِضْوانِ الرَّبِّ الْغَفّارِ. صَلَّى اللّٰهُ عَلىٰ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ. وَأَمِينِهِ عَلىٰ وَحْيِهِ وَصَفِيِّهِ مِنَ الْخَلائِقِ . وَرَضِيِّهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكاتُه .

اس نے سب کچھ عدم سے خلق کیا۔ جن کا نمونہ پہلے موجود نہ تھا۔ خلقت اشیاء کی اسے ضرورت نہ تھی اور نہ ان کی خلقت سے اسے کچھ فائدہ ہوا۔ مگر یہ کہ اس نے اپنی قدرت کو آشکار کرنا چاہا اور اپنی مخلوقات پر بندہ نوازی کرتے ہوئے انہیں نوازنا چاہا۔ اپنی دعوت کو پورے عالم میں پھیلانا چاہا۔ اس نے اجر وثواب کو فرمانبرداری میں گروی رکھا اور نافرمانوں کو عذاب سے ڈرایا تاکہ بندوں کو انجام بد سے بچائے اور بہشت کی طرف انہیں لے جائے۔

میں گواہی دیتی ہوں کہ میرے باپ محمدؐ خدا کے بندے اور رسول ہیں ۔ ان کی خلقت سے پہلے خدا نے انہیں چن لیا' رسالت سے پہلے انہیں منتخب کرلیا اور ان کا ایسا نام رکھا جو انہیں سجتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب مخلوقات پردۂ غیب میں تھیں' آنکھوں سے اوجھل تھیں ۔ میدان عدم میں سرگرداں تھیں ۔ بزرگ و برتر خدا سب کاموں کے انجام سے آگاہ تھا ۔ حالات اور زمانے میں تغیر و تبدل سے باخبر اور ان پر حاوی تھا۔ وہ ہر چیز کے انجام سے مطلع تھا۔ خدا نے جناب محمدؐ کو مبعوث فرمایا تاکہ اپنے امر کو اختتام تک پہنچائے اور جو اس نے مقدر کیا ہے اسے انجام تک پہنچائے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے دیکھا کہ تمام لوگ فرقوں میں تقسیم مختلف مذاہب کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ہر گروہ اپنے مذہب پر گامزن ہے۔ ہر گروہ کسی نہ کسی بت کی پرستش کررہا ہے اور سب نے اللہ کو جانتے ہوئے فراموش کردیا ہے۔

پس خدا بزرگ و برتر نے تاریکیوں میں نور محمدؐ سے اجالا کردیا ۔ اللہ نے آنحضرتؐ کی برکت سے دلوں سے غبار کفر کو دھو ڈالا۔ آنکھوں پر پڑے پردوں کو ہٹادیا۔ پھر اپنے لطف ومہربانی سے اپنی رضا وخوشنودی سے آپؐ کو نوازا۔ اس دنیا کے رنج والم کو جسے وہ پسند نہیں کرتا تھا آپ کے دل سے دور کردیا۔ آنحضرتؐ کو فرشتوں کے عالم میں مقرب فرمایا۔ آپؐ کی حکومت کو اپنے قرب و جوار میں قائم کیا' اور مغفرت و رضوان کو آپ کے نام دائم کردیا۔ اللہ تعالیٰ کا درود و سلام ہو نبیؐ رحمت پر۔ امین وحی پر۔ تمام لوگوں سے برگزیدہ ہستی پر۔ اللہ تعالیٰ آپؐ سے راضی ہو۔ خدا کی رحمتیں اور برکتیں آپؐ پر نازل ہوں۔

ثُمَّ اَنْتُمْ عِبادَاللّٰهِ (تُرِيدُ اَهْلَ الْمَجْلِسِ)

نُصُبُ أمرِ اللّٰهِ وَنَهْيِهِ . وَحَمَلَةُ دِينِهِ وَ وَحْيِهِ.
وَاُمَناءُ اللّٰهِ عَلىٰ اَنْفُسِكُمْ وَبُلَغاؤُهُ اِلَى الْاُمَمِ .
زَعَمْتُم حَقّاً لَكُم لِلّٰهِ فِيكُمْ عَهْدٌ ، قَدَّمَهُ اِلَيْكُمْ .
وَنَحْنُ بَقِيَّةٌ اسْتَخْلَفَنا عَلَيْكُمْ . وَمَعَنا كِتابُ اللّٰهِ،
بَيِّنَةٌ بَصائِرُهُ. وَآيٌ فِينا مُنْكَشِفَةٌ سَرائِرُه .
وَبُرهانٌ مُنْجَلِيَةٌ ظَواهِرُهُ . مُدِيمُ الْبَرِيَّةِ اسْماعُهُ .
قائِدٌ اِلَى الرِّضْوانِ اتِّباعُهُ مُؤَدٍّ اِلَى النَّجاةِ
اسْتِماعُهُ .

فِيهِ بَيانُ حُجَجِ اللّٰهِ الْمُنَوَّرَةِ . وَعَزائِمُهُ الْمُفَسَّرَةِ
وَمَحارِمِهِ الْمُحَذَّرَةِ وَتِبْيانُهُ الجالِيَة. وَجُمَلُه
الْكافِيَه . وَفَضائِلُهُ الْمَنْدُوبَة وَرُخَصُهُ الْمَوْهُوبَةُ.
وَشَرائِعُهُ الْمَكْتُوبَةُ. فَفَرَضَ اللّٰهُ الْايمانَ تَطْهِيراً
لَكُمْ مِنَ الشِّرْكِ .

وَالصَّلاةَ تَنْزِيهاً عَنِ الْكِبر.وَالصِّيامَ تَثْبِيتاً
لِلْاَخْلاصِ.وَالزَّكاةَ تَزْيِيداً فِي الرِّزْقِ.وَالْحَجَّ
تَسْلِيَةً لِلدِّينِ. وَالْعَدْلَ تَنَسُّكاً لِلْقُلُوبِ.وَطاعَتَنا
نِظاماً.وَاِمامَتَنا اَمْناًمِنَ الْفُرْقَةِ وَحُبَّنا عِزّاً
لِلْاَسْلامِ .وَالصَّبْرَ مَنْجاةً . وَالْقِصاصَ حِقْناً
لِلدِّماءِ .
وَالْوَفاءَ بِالنَّذْرِتَعَرُّضاً لِلْمَغْفِرَةِ. وَتَوْفِيَةَ
الْمَكايِيلِ وَالْمَوازِينِ تَغْيِيراً لِلْبَخْسَةِ.
وَالنَّهْيَ عَنْ شُرْبِ الْخَمْرِ تَنْزِيهاً عَنِ الرِّجْسِ .

(اس کے بعد جناب فاطمہؑ نے اہل مجلس کو مخاطب کرکے فرمایا):
تم خدا کے بندے ہو، اس کے حلال و حرام اور اوامر و نواہی سے وابستہ ہو۔ اس کے دین اور احکام کے محافظ ہو۔ تم حق کے امین ہو اور اسے دوسری قوموں تک پہنچانے والے ہو۔ تم سمجھتے ہو تمہارا خدا پر حق ہے؟ تم خدا سے عہد وپیمان کے پابند ہو۔ ہمارے خاندان کو تمہارے درمیان اس نے خلافت کے لیے مقرر فرمایا اور کتاب اللہ کی تاویل کی ذمہ داری ہم پر ڈالی۔ قرآن کی ادلہ وبراہین آشکار ہیں اور جو کچھ ہمارے بارے میں ہے۔ وہ روشن ہے۔ اس کی ادلہ واضح اور تاریکی میں روشنی کی مانند ہیں ۔ اس کی آواز کانوں میں رس گھولتی ہے۔ اپنے پیروکار کو باغ رحمت الٰہی کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ اس کا سننے والا دونوں جہانوں میں کامیاب ہے۔
اللہ کی روشن دلیلوں کو اس کی آیات کے پرتو میں دیکھا جاسکتا ہے۔ احکام واجب کی تفسیر کو قرآن کے مفہوم سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بیان کردہ محارم الٰہی روکنے والے ہیں اور اس کے حلال کفایت کرنے والے ہیں۔ اس کے مستحبات اس کے فضائل ہیں ۔ شریعت کے لئے راہ گشاہ ہے۔ ان سب کو آسان ترین عبارت میں بیان کیا او رواضح ترین شکل میں پیش کیا۔
اس کے بعد اس نے ایمان تم پر واجب کیا تاکہ شرک کے زنگ تمہارے دلوں سے اتار پھینکے۔
اس نے نماز کے ذریعے تمہارے غرور و تکبر کو ختم کیا۔ روزے کو خلوص کی علامت قرار دیا۔ زکوٰۃ کو تمہارے رزق میں اضافہ کا سبب قرار دیا۔ حج کو تمہارے دین میں درجات کی آزمائش کا وسیلہ بنایا۔ عدالت کو یقین قلوب کی نشانی قرار دیا۔ ہماری پیروی کو وحدت کا سرمایہ قرار دیا۔ ہماری امامت کو مانع افتراق، ہماری محبت اور دوستی (۱) کو مسلمانوں کی عزت بنایا۔ صبر کو کامیابی اور نجات کا موجب بنایا۔اور قصاص کو بقائے زندگی کا سبب قرار دیا۔(سورہ بقرہ: ۱۷۹ کی طرف اشارہ ہے)
نذر کی ادائیگی کو مغفرت و بخشش کا وسیلہ بنایا۔ پورا تولنے کو کم فروشی اور وزن میں کمی کا مانع قرار دیا۔
اس نے شراب پینے سے منع فرمایا تاکہ اپنے آپ کو رجس اور پلیدی سے پاک رکھیں۔

---
(۱) بعض متاخر مآخذ میں حب = دوستی کی جگہ جہاد آیا ہے اور یہ زیادہ مناسب لگتا ہے۔

وَقَذْفَ الْمُحْصَناتِ إجْتِناباً لِلَّعنَةِ.وَتَرْكَ السَّرَقِ اِيجاباً لِلْعِفَّةِ . وَحَرَّمَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ الشِّرْكَ اِخْلاصاً لَهُ بِالرُّبُوبِيَّةِ . " فَاتَّقُو اللّٰهَ حَقَّ تُقاتِهِ وَلاٰ تَمُوتُنَّ إلاّ وَاَنْتُمْ مُسْلِمُونَ . (آيه ۱۰۱ آل عمران) وَأطيعُوهُ فِيما اَمَرَكُمْ بِهِ وَنَهاكُمْ عَنْهُ فَاِنَّهُ "اِنَّمايَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبادِهِ الْعُلَماء " (فاطر:آيه ۲۸) .

ثُمَّ قالَتْ : . اَيُّهَا النّاسُ. أنا فاطِمَةُ وَأبى مُحَمَّدٌ . اَقُولُها عَوْداً عَلى بَدْء ." لَقَدْ جاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ اَنْفُسِكُمْ عَزيزٌ عَلَيْهِ ما عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَحِيمٌ ".(توبه : ۱۲۹) فَاِنْ تَعْرِفُوهُ تَجِدُوهُ اَبِى دُونَ آبائِكُمْ . وَاَخابْنِ عَمّي دُونَ رِجالِكُمْ . فَبَلَغَ النِّذارَةَ . صادِعًا بِالرِّسالَةِ . مائِلاً عَنْ مَدْرَجَةِ الْمُشْرِكِينَ . ضارِباً لِثَبَجِهِمْ ، آخِذاً بِكَظْمِهِمْ . يَهْشِمُ الاَصْنامَ وَيَنْكُتُ الْهامَ. حَتّى هَزَمَ الْجَمْعَ وَوَلُّو الدُّبُرَ . وَتَفَرَّى اللَّيْلُ عَنْ صُبْحِهِ .وَاَسْفَرَ الْحَقُ عَنْ مَحْضِهِ .وَنَطَقَ زَعيمُ الدِّينِ . وَخَرَسَتْ شَقاشِقُ الشَّياطِينِ .

وَكُنْتُمْ عَلى شَفا حُفْرَةٍ مِنَ النّار . مُذْقَةَ الشّارِبِ . وَنُهْزَةَ الطّامِعِ وَقَبْسَةَ الْعَجْلانِ . وَمَوْطَأَ الْأَقْدامِ . تَشْرَبُونَ الطَّرْقَ وَتَقْتاتُونَ الْوَرَقِ . اَذِلَّةً خاسِئِينَ .

تَخافُونَ اَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النّاسُ مِنْ حَوْلِكُمْ . فَاَنْقَذَكُمُ اللّٰه بِرَسُولِه (ص) بَعْدَ اللُّتَيّا وَالَّتِى . وَبَعْدَ ما مُنِىَ بِبُهَمِ الرِّجالِ ، وَذُؤْبانِ الْعَرَبِ ، وَ مَرَدَةِ اَهْلِ الْكِتابِ .

اس نے پاکدامن عورتوں پر تہمتیں لگانے سے منع فرمایا تا کہ اپنے آپ کو لعنت کا مستحق قرار نہ دیں۔ (سورہ نور: ۲۳ کی طرف اشارہ ہے) چوری سے روکا تا کہ عفت کا راستہ اختیار کریں۔ شرک کو حرام قرار دیا تا کہ اخلاص کے ساتھ توحید کی عبادت و بندگی کریں۔ پس اللہ سے ایسے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے اور مروتو مسلمان ہو کر مرو۔ (آل عمران : ۱۰۱)۔ جن چیزوں سے اس نے منع فرمایا ہے ان سے باز آجاؤ۔ بیشک اللہ سے صرف دانا و عالم بندے ڈرتے ہیں۔ (فاطر ۲۸)

اس کے بعد فرمایا: لوگو! جس طرح میں نے شروع میں کہا ہے: میں فاطمہ (س) ہوں اور میرے باپ محمدؐ ہیں۔ تحقیق تمہارے پاس ایسا رسول آیا ہے جو تم میں سے ہے جس پر تمہارا غم اور رنج بہت گراں ہے۔ اور تمہاری نجات پر حریص ہے اور مومنین پر مہربان اور ان کا ہمدرد ہے اگر تم انہیں پہچانتے ہو تو جان لو کہ وہ میرا باپ تھا نہ کہ تمہاری عورتوں کا۔ وہ تمہارے مردوں میں سے صرف میرے شوہر کے بھائی تھے۔ انہوں نے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا ہے اور لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا ہے۔ انہوں نے شرک کی پیشانی اور کمر کو توحید کے تازیانے سے توڑ دیا ہے۔ بتوں اور بت پرستوں کی شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا ہے۔

یہاں تک کہ کافر متفرق ہوگئے اور پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ کفر کی کالی رات کا خاتمہ ہوا اور ایمان کی صبح نمودار ہوئی۔ حق و حقیقت نے چہرے سے نقاب الٹا دیا۔ دین کی رہبری کا چرچا بر سر عام ہوا۔ شیاطین کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔

اس دوران میں تم جہنم کے دروازے پر تھے۔ ہر پیاسے کی نظر تم پر تھی۔ ہر دیکھنے والے کی نظروں میں تم حقیر و پست تھے۔ ہر طمع کار کا لقمہ اور ہر درندے کا شکار تم تھے۔ لوگ تمہیں اپنے پاؤں سے کچلتے، تم بدبودار اور گندا پانی پیتے اور پتے چباتے تھے۔ تمہاری غذا جانوروں کی کھال اور مردار تھی۔ تمہارا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ تمہیں گھیر کر ہلاک نہ کردیں۔ یہاں تک کہ خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو بھیج کر تمہیں خاک مذلت سے اٹھایا اور تمہیں رفعت و بلندی کے کمال تک پہنچادیا۔ ان باتوں کے علاوہ جب پیغمبرؐ جانور جیسے انسانوں اور بھیڑیے جیسے عربوں میں گھر گئے، جن میں سرکش قسم کے اہل

کتاب بھی تھے۔ جن کی آتش فساد کو اللہ نے بجھا دیا۔

كُلَّمٰا حَشَوا ناراً لِلْحَرْبِ اُطْفَاَها .اَوْنَجَمَ قَرْنُ الضَّلاٰلِ وَفَغَرَتْ فاٰغِرَةٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ قَذَفَ بِاَخِيهِ فِي لَهَوٰاتِها. فَلاٰيَنْكَفِئُ حَتّٰى يطاٰصِمَاخَها بِاَخْمُصِهِ . وِيُخمِدَ لَهَبَها بِحَدِّهِ . مَكْدوداً فِي ذاٰتِ اللّٰهِ . قَرِيباً مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ . سَيِّداً فِي اَوْلِياءِ اللّٰهِ . وَاَنْتُمْ فِي بُلَهْنِيَةٍ واٰدِعُونَ آمِنُونَ .

جب کبھی شیطان نے سر اٹھایا، یا مشرکین نے کوئی بے ادبی کی تو پیغمبرؐ نے اپنے بھائی کو سینہ سپر کر دیا۔ جس کی شان یہ تھی کہ جب تک فتنوں کے کان نہ بند کر دے اور آتش فساد کو اپنی تلوار کے پانی سے بجھا نہ دے میدان سے پلٹتا نہ تھا۔ وہ ذات خدا میں کوشاں، (امر الٰہی میں جدوجہد کرنے والا) رسول اللہؐ سے قریب، اولیاء خدا کا سردار، امت کا ناصح، عمل کے لیے کمربستہ، اسلام کے لیے ساعی اور ترویج دین کے لیے جفاکش تھا۔ ان تمام سختیوں میں تم فارغ البال اور مطمئن تھے۔ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا

حَتّٰى إذاٰاخْتاٰرَا اللّٰهُ لِنَبِيِّهِ داٰرَاَنْبِيائِهِ ، ظَهَرَتْ خَلَّةُ النِّفاٰقِ . وَسَمِلَ جِلْباٰبُ الدِّينِ . وَنَطَقَ كاٰظِمُ الْغاٰوِينَ. وَنَبَغَ خاٰمِلُ الآفِلِينَ .وَ هَدَرَ فَنِيقُ الْمُبْطِلِينَ . فَخَطَرَ فِي عَرَصاٰتِكُمْ وَاَطْلَعَ الشَّيْطاٰنُ رَاْسَهُ مِنْ مَغْرِزِهِ ، صاٰرِخاً بِكُمْ . فَوَجَدَكُمْ لِدُعاٰئِهِ مُسْتَجِيبِينَ . وَلِلْغِرَّةِ فِيهِ مُلاٰحِظِينَ . فَاسْتَنْهَضَكُمْ فَوَجَدَكُمْ خِفاٰفاً . وَاَحْمَشَكُمْ فَاَلفاٰكُمْ غِضاٰباً . فَوَسَمْتُمْ غَيْرَ إبِلِكُمْ وَ اَوْرَدْتُموهاٰ غَيْرَشِرْبِكُمْ هٰذاٰ وَالْعَهْدُ قَرِيبٌ . وَالْكَلْمُ رَحِيبٌ . وَالْجُرْحُ لَمّاٰيَنْدَمِلْ .

زَعَمْتُمْ خَوْفَ الْفِتْنَةِ " اَلاٰ فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا وَإنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكاٰفِرِينَ " (توبہ۔ ۴۹)

جب اللہ نے اپنے پیارے رسولؐ کو اپنے پاس بلا لیا تو نفاق اور دو روئی ظاہر ہو گئی۔ دین کی اہمیت جاتی رہی۔ ہر گمراہ خلافت کا دعویدار بن گیا اور ہر گمنام سردار بن گیا اور ہر فضول بکنے والا گلی کوچے میں بات اچھالنے لگا۔ شیطان نے اپنی کمین گاہ سے سر باہر نکالا اور تمہیں اپنی طرف بلایا۔ اس نے دیکھا کہ تم لوگوں نے کتنی جلدی اس کی آواز پر لبیک کہا اور کتنی تیزی سے اس کی طرف لپک پڑے اور اس کے دام فریب میں آ گئے اور اس کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ ابھی تمہارے رسولؐ کو دنیا سے گئے ہوئے دو دن بھی نہ گزرے تھے اور ہمارے غم کا بوجھ ہلکا بھی نہ ہوا تھا کہ جو نہیں کرنا چاہیے تھا وہ تم نے کر دکھایا۔ جو تمہارا حق نہ تھا اس پر قابض ہو گئے۔ تم نے بہت بڑی بدعت ایجاد کی ہے۔

تم نے اپنے طور پر یہ خیال کیا کہ فتنہ نہ اٹھنے پائے اور خون نہ بہنے پائے لیکن تم خود فتنے کی آگ میں کود گئے۔ تم نے جو کچھ اگایا اسے ضائع کر دیا۔ جان لو کہ دوزخ کافروں کا ٹھکانا (توبہ: ۱۱) اور بدکاروں کی جگہ ہے۔

فَهَيْهاٰتَ مِنْكُمْ ، وَاَنّٰى بِكُمْ ، وَاَنّٰى تُؤفَكُونَ . وَهٰذاٰكِتاٰبُ اللّٰهِ بِيْنَ اَظْهُرِكُمْ . زَواٰجِرُهُ بَيِّنَةٌ . وَشَواٰهِدُهُ لاٰئِحَةٌ .وَاَواٰمِرُهُ واٰضِحَةٌ اَرَغْبَةً عَنْهُ تُرِيدُونَ . اَمْ بِغَيْرِهِ تَحْكُمُونَ ؟بِئْسَ لِلظّٰالِمِينَ بَدَلاً .(وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ اْلاَسْلاٰمِ دِيناً فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِيِي اْلآخِرَةِ مِنَ الْخاٰسِرِينَ) آلعمران : ۸۵

تم کہاں اور فتنے کو ختم کرنا کہاں؟ جھوٹ بولتے ہو اور فریب دیتے ہو۔ تم نے حق کے علاوہ راستے کو اختیار کیا حالانکہ کتاب الٰہی تمہارے درمیان موجود ہے۔ اس کی نشانیاں بغیر کسی کمی اور اضافے کے ظاہر ہیں۔ قرآن کے اوامر و نواہی روشن اور آشکار ہیں۔ کیا تم قرآن کے علاوہ کسی اور کے فیصلے پر عمل کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم شیطان کے حکم کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہو؟ "اور جو کوئی دین اسلام کے علاوہ دین کو اختیار کرے اللہ اس سے ہرگز کوئی عمل قبول نہیں کرے گا اور جہان آخرت میں وہ خسارہ اٹھانے والوں میں ہو گا۔

ثُمَّ لَمْ تَرَيَّثُوا إلاَّ رَيْثَ أنْ تَسْكُنَ نَغْرَتُها. تَشْرَبُونَ حَسْواً، وَتُسِرُّونَ فِي ارتغاء. وَنَصْبِرُمِنْكُمْ عَلى مِثْلِ حَزِّ الْمُدَى. وَأنْتُمُ الآنَ تَزْعُمُونَ اَنْ لاَ اِرْثَ لَنا. اَفَحُكْمُ الْجاهِلِيَّةِ تَبْغُونَ، (وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ حُكْماً لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ.) (المائده: ۵۰)

تم نے ذرا بھی صبر نہ کیا کہ تمہارے پہلے لگائے گئے زخم مندمل ہو جاتے اور تمہارا پہلا کام پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا۔ تم نے ایک اور چال چلی۔ ایک نئے مسئلہ کا آغاز کردیا جو کچھ تمہارے دلوں میں تھا اسے عملی جامہ پہنانا شروع کردیا۔ تمہارا خیال ہے کہ ہماری کوئی میراث نہیں ہے۔ ہم تمہارے اس ظلم پر بھی صبر کریں گے اور ان زخموں کو بھی برداشت کرلیں گے۔ مگر تم جاہلیت کے دستور پر عمل پیرا ہو اور گمراہی کے راستے پر گامزن ہو۔ ایمان داروں کے لئے پروردگار عالم سے بہتر کس کا حکم ہو سکتا ہے؟ (المائدہ۔ ۵۰)

وَيْهاً مَعْشَر الْمُهاجِرِينَ. أ اُبْتَزُّ اِرْثَ أبِي؟ يابْنَ أبي قُحافَةَ ! أفِي الْكِتابِ أنْ تَرِثَ أباكَ وَلاَ أرِثَ أبِي؟ لَقَدْ جِئتَ شَيْئاً فَرِيّا

اے مہاجرین! کیا یہ حکم خدا ہے کہ میری میراث لوٹ لی جائے اور حرمت کا ذرا بھی خیال نہ کیا جائے؟ اے فرزند ابو قحافہ! یہ خدا نے کہا ہے کہ تم تو اپنے باپ کی میراث پاؤ اور میں اپنے باپ کی میراث سے محروم کردی جاؤں؟ یہ کونسی بدعت دین میں پھیلا رہے ہو؟

فَدُونَكَها مَخْطومَةً مَرْحُولَةً.تَلْقاكَ يَوْمَ حَشْرِكَ. فَنِعْمَ الْحَكَمُ . اللهُ. وَالزَّعِيمُ مُحَمَّدٌ. وَالْمَوْعِدُ الْقِيامَةُ. وَعِنْدَ السَّاعَةِ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُونَ. وَ لِكُلِّ نَبَأٍ مُسْتَقَرٌّ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ" (انعام:۶۷) ثُمَّ انْحَرَفَتْ إلىٰ قَبْرِ النَّبِيِّ (ص) وَهِيَ تَقُولُ:

کیا تم روز قیامت کے حساب و کتاب سے بے خبر ہو؟ موت بہت جلد تمہیں آلے گی۔ قیامت کا وعدہ قریب ہے۔ تم بہت جلد حشر کے میدان میں وارد ہو گے۔ وہاں بہترین انصاف کرنے والا خدا ہے۔ مدعی جناب محمدؐ ہیں۔ اس دن ظالم و ستمگر ذلیل و رسوا اور نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔ اس دن مظلوم کو اس کا حق مل جائے گا۔ تم جلدی جان لو گے کہ ہر خبر کا اپنا مقام اور ہر مظلوم کی دادرسی ہے۔ (انعام: ۶۷) اس کے بعد جناب فاطمہ (س) نے بابا کی قبر کی طرف منہ کرکے فرمایا:

قَدْ كانَ بَعْدَكَ أنْباءٌ وَهَنْبَثَةٌ لَوْ كُنْتَ شاهِدَ هالَمْ تَكْثُرِ الْخَطْبُ
انّا فَقَدْناكَ فَقْدَ الأرْضِ وابِلَها وَاخْتَلَّ قَوْمُكَ فَاشْهَدْهُمْ وَلاَ تَغِبْ

آپ چلے گئے آپ کے بعد فتنہ برپا ہوا دلوں میں چھپا ہوا کینہ آشکار ہوا آپ کو کیا کھویا کہ ہم سے دنیا نے منہ پھیر لیا۔ آپ کی امت لڑ پڑی اور ہمیں تنہا چھوڑ دیا گیا۔

مَعْشَرَ الْبَقِيَّةِ . وَأعْضادَ الْمِلَّةِ . وَحُصُونَ الأسْلامِ . ماهٰذِهِ الْغَمِيزَةُ فِي حَقِّي ؟ وَالسِّنَةُ عَنْ ظُلامَتِي. أما قالَ رَسُولُ اللهِ (ص) الْمَرءُ يُحْفَظُ فِي وُلْدِه ؟ سَرْعانَ ماأجْدَبْتُمْ فَاكْدَيْتُم . وَعَجْلانَ ذا إهالَةٍ تَقُولُونَ ماتَ رَسُولُ اللهِ (ص) فَخَطْبٌ جَلِيلٌ . إسْتَوْسَعَ وَهْيُهُ . وَاسْتَنْهَرَ فَتْقُهُ . وَفُقِدَ راتِقُهُ . وَأظْلَمَتِ الارْضُ لِغَيْبَتِهِ .

اے جماعت مومنین! اے دین کے مددگارو! اے اسلام کے طرفدارو! کیوں میرا حق نہیں لیتے ہو؟ کیوں تم نے آنکھیں چرالی ہیں اور مجھ پر ظلم و ستم ہوتا دیکھ رہے ہو؟ کیا میرے بابا نے نہیں فرمایا تھا کہ اولاد کا احترام ان کے باپ کا احترام ہے؟ تم کتنی جلدی بدل گئے ہو۔ کتنی جلدی تمہارا خون سرد ہو گیا ہے اور غفلت کے پردوں میں جاپڑے ہو۔ اپنے آپ سے کہتے ہو محمدؐ رحلت فرماگئے۔ ہاں رحلت فرماگئے۔ مگر ان کی وفات بہت بڑا صدمہ تھا اور ناقابل برداشت غم۔ ان کی وفات سے ایسی

وَاكْتَأَبَتْ خِيرَةُ اللّٰهِ لِمُصيبَتِهِ . وَخَشَعَتِ الْجِبالُ . وَاَكْدَتِ الْآمالُ . وَاُضيعَ الْحَريمُ . وَاُذيلَتِ الْحُرْمَةُ عِندَ مَماتِهِ . وَتِلْكَ نازِلَةٌ عَلَيْنا. بِها كِتابُ اللّٰهِ فِي اَفْنِيَتِكُمْ فِي مُمْساكُمْ وَمُصْبِحِكُمْ يَهْتِفُ بِها فِي اَسْماعِكُمْ . وَقَبْلَهُ حَلَّتْ بِأَنْبِياءِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَرُسُلِهِ .

دراز پڑی جو کبھی پر نہ ہو گی۔ انؐ کے فقدان سے زمین تاریک ہو گئی اور برگزیدگان الٰہی سوگوار ہو گئے۔ امیدوں کے چشمے خشک ہو گئے اور پہاڑوں میں زلزلہ آ گیا۔ تمام حرمتیں تباہ ہو گئیں اور اہل حرمت بے پناہ ہو گئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ تم تقدیر الٰہی سے ناواقف ہو اور اس کی تمہیں خبر نہیں۔ قرآن تمہارے ہاتھوں میں ہے، رات دن اسے پڑھتے ہو۔ کس طرح ہو سکتا ہے کہ تم اس کے معانی نہ جانتے ہو؟ تم اسے سمجھتے ہو کہ ان سے پہلے بھی پیغمبر آئے اور چلے گئے۔ آپ نے بھی اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی ہے۔

وَما مُحَمَّدٌ إِلَّارَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ ماتَ اَوْقُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللّٰهَ شَيْئاً وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّاكِرِينَ (آل عمران . ۱۴۴)

محمدؐ ایک رسولؐ اور پیامبرؐ تھے۔ ان سے پہلے بھی رسول آئے اور چلے گئے اگر وہ قتل ہو جائیں یا فوت ہو جائیں تو کیا تم واپس پلٹ جاؤ گے؟ جو ایسا کرے گا وہ اللہ کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو جزا دے گا۔ (آل عمران: ۱۴۴)

اِيهاً بَنِي قَيْلَةَ اُهْضَمُ تُراثَ اَبيه. (ہاء سکت کے لیے ہے) وَاَنْتُمْ بِمَرْأى وَمَسْمَعٍ تَلْبَسُكُمُ الدَّعْوةُ وَتَشْمُلُكُم الْحِيرَةُ وَفِيكُمْ الْعَدَدُ وَالْعُدَّةُ. وَلَكُمُ الدّارُ . وَعِنْدَكُمُ الْجُنَنُ .

اے قیلہ (۱) کے بیٹو! تمہارے سامنے میرے باپ کی میراث مجھ سے چھین لی گئی! اور میری عزت کا کچھ خیال نہ کیا گیا۔ کیا تم بھی ان مستوں کی طرح میری آواز نہیں سن رہے ہو؟ حالانکہ تمہارے پاس مجاہد ہیں۔ فراوان ساز و سامان اور آباد گھر ہیں۔

وَاَنْتُمُ الْآن نُخْبَةُ اللّٰهِ الَّتِي انْتُخِبَتْ لِدينِهِ . وَاَنْصارُ رَسُولِهِ وَاَهْلُ الْاسْلامِ . وَالْخِيرَةُ الَّتِي اخْتُيرَتْ لَنا اَهلَ الْبَيْتِ . فَبادَيْتُمُ الْعَرَبَ . وَ ناهَضْتُمُ الْاُمَمَ وَكافَحْتُمُ الْبُهَمَ .
لا نَبْرَحُ نَأْمُرُكُمْ و تَأْمُرونَ . حَتّٰى دارَتْ لَكُمْ بِنا رَحَى الْاسْلامِ وَ دَرَّحَلَبُ الْاَنامِ وَخَضَعَتْ نَعْرَةُ الشِّرْكِ . وَباخَتْ نِيرانُ الْحَرْبِ . وَ هَدَأَت دَعْوةُ الْهَرْجِ . وَاسْتَوسَقَ نِظامُ الدّينِ .

اس دور میں تم خدا کے برگزیدہ انسان ہو۔ دین کے حامی، رسول کے مددگار اور مومنین کے طرفدار ہو۔ تم اہل بیت اطہار کی حمایت کرنے والے ہو۔ یہ تم ہی تھے جنہوں نے بت پرست عربوں کے خلاف جنگیں کیں۔ یہ تم ہی تھے جن کے قدم بڑے بڑے لشکروں کے مقابلے پر نہ ڈگمگائے۔ اگرچہ فرمان دینے والا ہم میں سے تھا۔ لیکن تم نے راہ خدا میں ثابت قدمی دکھائی۔ اسلام کے نام کو بلند کیا۔ مسلمانوں کو اونچا مقام بخشا، مشرکوں کو تتر بتر کر دیا، نظام دین برقرار کیا، جنگ کے شعلوں کو

---

(۱) بعض عربی لغات اور فرہنگ ناموں میں لکھا گیا ہے کہ "قیلہ" ایک عورت کا نام ہے اور انصار اس کی نسل سے ہیں۔ ابوالفرج اصفہانی نے اوس و خزرج کے نسب کے ذکر میں لکھا ہے: ان کی ماں قیلہ بنت جفنۃ بنت عتبہ بنت عمرو ہے۔ قضاعہ کہتے ہیں: "قیلہ" کاھل بن عدرہ بن سعد کی بیٹی ہے (اغانی ج ۳ ص ۴۱) لیکن توجہ رہنی چاہیئے کہ "قیلہ" جنوبی عرب یعنی یمن کا لفظ ہے۔ جبکہ اہل یثرب (مدینہ) وہ مہاجرین ہیں جو جو سد مارب کی ویرانی یا بعض دیگر اسباب کی وجہ سے یثرب میں مقیم ہوئے۔ سبائیوں کی جنوب پر دوسری بار حکومت کے دوران، ان کے ہاں بادشاہوں کے سیاسی مشیر ہوا کرتے تھے جن کا انتخاب اشراف میں سے کیا جاتا تھا اور انہیں "قیل" کہا جاتا تھا۔ بنابرایں "قیلہ" بزرگ، اعیان اور بڑے کے معنی میں ہے

فَانّی حُرْتُمْ بَعْدَ الْبَیانِ وَنکَصْتُم بَعْدَ الأقْدامِ . وَأسْرَرْتُمْ بَعْدَ الاعلانِ .لِقَوْمٍ نَکَثُوا أیْمانَهُم (أتَخْشَوْنَهُمْ . فَااللّٰهُ أحَقُّ أنْ تَخْشَوْهُ إنْ کُنْتُم مُؤْمِنین) (توبه ۱۳۰)

اَلاٰ قَدْ أریٰ اَنْ اَخلَدْتُمْ اِلَی الْخَفْضِ . و رَکَنْتُمْ اِلَی الدَّعَةِ فَعُجْتُمْ عَنِ الدِّینِ . وَمَجَجْتُمْ الّذِی وَعَیْتُم وَ دَسَعْتُم الَّذی سَوَّغْتُم . " إنْ تَکْفُروا أنْتُمْ و مَنْ فِی الارْضِ جَمیعاً فَإنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیدٌ" (ابراهیم.۸)

بجھا دیا۔ تم نے کافروں کے گلے میں طوق غلامی ڈالا۔ پس ان سب کارناموں کے بعد تم بیٹھ گئے ہو۔ اتنا آگے جانے کے بعد عقب نشینی کر لی ہے اور وہ بھی ان لوگوں کے سامنے جنھوں نے اپنا عہد توڑ دیا اور حکم الٰہی کو پس پشت ڈال دیا۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ تمھیں اللہ سے ڈرنا چاہیے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔ (توبہ:۱۳)

کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم نے تن آسانی کو اپنی عادت بنا لیا اور امن و خاموشی کے سائے میں رہنے کا اپنے آپ کو عادی کرلیا ہے۔ کیا تم دین سے تھک چکے ہو اور راہ خدا میں جہاد سے منہ پھیر لیا ہے۔ جو کچھ تم نے سنا ہے، اسے ان سنا کردیا۔ یاد رکھو! اگر تم اور جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں، کافر ہو جائیں تو خدا کو ذرا بھی پرواہ نہیں کیونکہ وہ بے نیاز اور سزاوار حمد ہے۔ (ابراهیم:۸)

گر جملہ کائنات کافر گردند   بردامن کبریایش ننشیند گرد

اگر ساری کائنات بھی کافر ہو جائے تو اس کی شان کبریائی میں ذرہ برابر فرق نہیں آئے گا۔ (سعدی)

ألاٰ وَقَدْ قُلْتُ الَّذِی قُلْتُهُ عَلٰی مَعْرِفَةٍ مِنّی بِالْخِذْلانِ الَّذی خامَرَ صُدورَکُمْ . وَاسْتَشْعَرَتْهُ قُلُوبُکُمْ . وَلَکِنْ قُلْتُه فَیْضَةَ النَّفس . وَنَفْثَةَ الْغَیْظِ . وَبَثَّةَ الصَّدْرِ .وَ مَعْذِرَةَ الْحُجَّةِ. فَدُونَکُموها . فَاحْتَقِبوها مُدْبِرَةَ الظَّهْرِ . ناٰکِبَةَ الْحَقِّ باقِیَةَ الْعارِ . مَوْسُومَةً بِشَنارِ الأبَدِ مَوْصُولَةً بِنارِاللّٰهِ الْمُوقَدَةِ . الَّتِی تَطَّلِعُ عَلَی الأفئِدَةِ . فَبِعَیْنِ اللّٰهِ مَا تَفْعَلُونَ "وَسَیَعْلَمُ الَّذِینَ ظَلَمُوا أیَّ مُنْقَلَبٍ یَنْقَلِبُونَ " (الشعراء:۲۲۷) وَأنا ابْنَةُ نَذِیرٍ لَکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذابِ اللّٰهِ . فَاعْمَلُوا إنّا عامِلُونَ وَانْتَظِرُوا إنّا مُنْتَظِرُونَ .

میں نے اپنا پیغام پہنچانے کا حق ادا کردیا، لیکن میں جانتی ہوں تم ذلیل و خوار ہو اور ذلت کے ہاتھوں گرفتار ہو۔ کیا کروں؟ میرا دل خون خون ہے۔ زبان پر حرف شکایت نہ لاؤں، میری برداشت سے باہر ہے۔ ایک بار پھر کہتی ہوں کہ تم پست لوگوں پر میں نے حجت تمام کردی ہے۔ اب تمھیں یہ گلو گیر لقمہ نصیب ہو اور حق شکنی اور حقیقت پوشی کی ذلت کا طوق ہمیشہ کے لئے تمہاری گردنوں میں رہے۔ تمھیں کبھی بھی آرام و سکون میسر نہ آئے۔ یہاں تک کہ خدا تمھیں بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دے۔ وہ آگ جو ہر وقت جلتی رہے اور دل و جان کو جلائے۔ تم جو کر رہے ہو خدا دیکھ رہا ہے۔ ظالم و ستمگر جلد جان لے گا کہ اس کا ٹھکانا کہاں ہے۔ (الشعراء:۲۲۷) میں تمہاری عاقبت کے بارے میں پریشان ہوں اور اپنے باپ کی طرح تمھیں عذاب الٰہی سے ڈراتی ہوں۔ جو درخت تم نے لگایا ہے اس کا پھل کھانے کا انتظار کرو اور اپنے کیئے کی سزا پاؤ۔

☆☆☆☆☆

وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا

(آل عمران ۱۴۴)

جو اپنے پیچھے کی طرف پلٹ جائے وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اس اجتماع پر جس میں آدھے مرعوب اور آدھے مجذوب تھے، دکھی دل سے اٹھنے والی تند و تیز گفتگو نے کیا اثرات چھوڑے ہوں گے؟ خدا بہتر جانتا ہے۔ درجۂ اول کی روایات و اسناد اور تاریخ، مبہم اشاروں کے علاوہ کچھ نہیں بتاتی۔ اگر انہوں نے ان اثرات کو اپنے سینے میں محفوظ کیا بھی تو یار لوگوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ رہ سکے اور ہم تک نہ پہنچ سکے۔ مسلم ہے کہ رسول اللہؐ کی بیٹی ان کے شوہر اور رسول خداؐ کے چچازاد بھائی کی باتوں کا اس مجمع کے افراد پر ضرور اثر ہوا ہوگا اور اس کا ردعمل سامنے آیا ہوگا۔ (کیوں نہ اثر ہوتا) اس وقت تک لوگوں کے پاس جو کچھ تھا وہ سب رسول اللہؐ کی برکت اور صدقے میں تھا۔ اسی رسولؐ کی کل وفات ہوتی ہے اور آج اسی کی پیاری بیٹی کا حق چھین لیا جاتا ہے۔

اگر (مسجد نبوی میں) اس اجتماع میں موجود مہاجرین اپنی مصلحت کی خاطر خاموش رہے ہوں تو ٹھیک ہے لیکن انصار تو ایسے نہ تھے۔ انہوں نے سقیفہ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیا تھا اور ان کی تنقید ایک اچھا محرک تھی۔

بہر حال ہمیں معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا کہا اور کیا سنا۔ انہوں نے ہاں میں ہاں ملائی یا مخالفت کی؟ انہوں نے صرف افسوس اور اظہار ہمدردی کرنے پر اکتفا کیا یا کوئی عملی قدم بھی اٹھایا؟ اللہ جانتا ہے شاید انہوں نے کہا ہو کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب حکومت برسر اقتدار ہے۔ اس کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں۔ مسلمانوں کی مصلحت اسی میں ہے کہ اگر دلی طور پر ایک نہ ہوں تو یک زبان ضرور ہونا چاہیے، کیونکہ مدینے کے علاوہ سب جگہوں سے سرکشی و بغاوت کی بو آرہی ہے۔

جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے(۱) اس اجتماع میں ابو بکر نے جناب فاطمہ زہراء(س) کا جواب اس انداز سے دیا۔

اے رسول خداؐ کی بیٹی! تمہارے باپ مومنین کے غمخوار اور ان پر مہربان تھے۔ وہ کافروں کے دشمن اور ان پر قہر الٰہی کے مظہر تھے۔ اگر ہم نسب کو دیکھیں تو وہ تمہارے باپ تھے نہ کہ دوسری عورتوں کے۔ تمہارے شوہر کے وہ چچا زاد بھائی تھے نہ کہ دوسروں کے۔ پیغمبرؐ کی نظروں میں تمہارا شوہر سب رشتہ داروں سے برتر اور تمام بڑی مہمات اور امور میں رسولؐ کا مددگار رہا ہے۔ سعادت مند انسان کے سوا تمہیں کوئی دوست نہیں رکھتا ہے اور پست فطرت انسان کے سوا تم سے کوئی دشمنی نہیں کرتا۔

تم دنیا میں ہمارے رہبر اور بہشت کے راستوں کے راہنما ہو۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں تمہارے چچا زاد کو خلافت سے روکوں! فدک اور جو کچھ تمہارے باپ نے تمہیں دیا ہے اگر تمہارا حق ہے اور میں نے چھینا ہے تو میں ظالم اور ستم گر ہوں۔ لیکن میراث کے بارے میں جانتی ہو تمہارے باپ نے کیا کہا ہے: ہم پیغمبروں کی کوئی میراث نہیں ہوتی جو کچھ ہمارے بعد باقی بچے وہ صدقہ ہے۔

جناب فاطمہ(س) نے جواب دیا:

لیکن خداوند متعال قرآن میں دو نبیوں کے بارے میں فرماتا ہے: یَرِثُنی وَ یَرِثُ مِنۡ آلِ یَعۡقُوبَ (مریم ۷) مجھ سے اور آل یعقوب سے وہ ارث پائے گا ۔وَ وَرِثَ سُلَیۡمانُ دَاوُدَ(النمل ۱۷) اور سلیمان نے داؤد سے ارث پائی۔ یہ دو پیغمبر ہیں۔ انہوں نے ارث چھوڑی یا ارث پائی؟۔ جو چیز وراثت سے نہیں ملتی وہ رسالت اور نبوت ہے نہ کہ مال و جائیداد۔ میرے باپ کی ارث مجھ سے کیوں لیتے ہو۔ کیا کتاب الٰہی میں محمدؐ کی بیٹی فاطمہ (س) اس حکم سے خارج ہو گئی ہے؟ اگر ایسی آیت ہے تو بتاؤ تا کہ میں اسے قبول کر لوں۔

حضرت ابو بکر نے کہا:

---

(۱) بلاغات النساء

رسولؐ کی بیٹی آپ کی بات واضح اور روشن ہے۔آپ کی منطق زبان نبوت ہے۔ کسی کی کیا مجال کہ وہ آپ کی بات ٹھکرائے۔ میرے جیسا آپ پر کیا اعتراض کر سکتا ہے؟آپ کے اور میرے درمیان آپ کے شوہر ثالث ہیں وہ فیصلہ کریں گے۔(۱)

لیکن ابن ابی الحدید نے اس خطبے کا رد عمل دوسری طرح بیان کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جناب زہرا(س) کے خطبے کا حضرت ابو بکر نے یہ جواب دیا:

اے پیغمبر کی بیٹی! خدا کی قسم انسانوں میں آپ کے والد سے زیادہ کوئی مجھے محبوب نہیں ہے۔ جس دن آپ کے والد کی رحلت ہوئی میرا دل چاہتا تھا کہ آسمان زمین پر گر پڑے۔ بخدا میں پسند کرتا ہوں کہ عائشہ غریب ہو جائے لیکن تو محتاج نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں سب کو حق دوں اور تم پر ظلم روا رکھوں۔ تو رسول خداؐ کی بیٹی ہے۔ یہ رسول اللہؐ کی ذاتی ملکیت نہیں تھا بلکہ سارے مسلمانوں کا مال تھا۔آپ کے والد اسے راہ خدا میں خرچ فرماتے تھے اوراس ذریعے سے حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد میں بھی انہی کی سیرت پر چلوں گا۔

فاطمہ(س): خدا کی قسم! اب میں کبھی تم سے بات نہیں کروں گی۔خدا کی قسم! میں تمہیں ہر گز معاف نہیں کروں گی۔خدا کی قسم! تجھ پر نفرین کروں گی۔خدا کی قسم! تیرے حق میں کبھی دعا نہیں کروں گی۔(۲)

نیز ابن ابی الحدید محمد بن زکریا سے حدیث نقل کرتے ہیں کہ جب ابو بکر نے دختر رسولؐ کا خطبہ سنا تو انہیں بڑا غصہ آیا وہ منبر پر گئے اور کہا:

اے لوگو! کیوں تم ہر بات سن لیتے ہو؟ کیوں پیغمبرؐ کے زمانے میں یہ خواہشات نہ تھیں؟ جس کسی نے پیغمبراکرمؐ سے ایسی بات سنی ہے وہ بتائے۔ جس نے دیکھا ہے وہ گواہی دے۔ لومڑی کی گواہ اس کی دم ہے۔ یہ فتنے کی ٹھنڈی آگ کو پھر بھڑکانا چاہتے ہیں۔ بیچاروں سے مدد طلب کر رہے ہیں۔ عورتوں کا سہارا لے رہے ہیں۔ ان کی مثال

---

(۱) بلاغات النساء طبع بیروت ص ۳۱ ۔ ۳۲

(۲) شرح نہج البلاغۃ ص ۲۱۴

ام طحال (۱) جیسی ہے۔ اگر میں چاہوں تو بول سکتا ہوں اگر بولوں تو علی الاعلان کہوں گا لیکن وہ اگر مجھے چھوڑ دیں تو میں بھی منہ بند کر لوں گا۔

اے انصار! میں نے تمہاری بھی جاہلانہ باتیں سنی ہیں! تمہیں دوسروں سے زیادہ فرمان رسولؐ کا خیال رکھنا چاہیے! یہ تم ہی تھے جنہوں نے آنحضرتؐ کو پناہ دی اور ان کی نصرت کی۔ میں اپنی زبان اور ہاتھ کو اُن افراد کے بارے میں باز رکھوں گا جو سزا کے مستحق نہیں ہیں۔

ان باتوں کے بعد نبی زادی اپنے گھر واپس چلی گئیں۔

ابن ابی الحدید کہتے ہیں:

میں نے یہ گفتگو نقیب ابو یحییٰ، بن ابو زید بصری کو سنائی اور پوچھا: ابو بکر نے کنایہ سے کس طرف اشارہ کیا ہے؟

یحییٰ: اس نے کنایہ میں نہیں بلکہ واضح کہا ہے۔

اگر واضح ہوتا تو میں تم سے سوال نہ کرتا۔

وہ مسکرایا اور کہا: اس کی مراد علیؑ تھے۔

یہ سب سخت باتیں علیؑ کے لئے تھیں؟

ہاں! میرے بیٹے آخر حکومت ہے۔

میں نے پوچھا: انصار نے کیا کہا تھا؟

انہوں نے علیؑ کی حمایت کی تھی۔ لیکن علیؑ کو ڈر تھا کہ کہیں فتنہ دوبارہ نہ کھڑا ہو جائے اس لئے انہیں منع کیا۔(۲)

کیا یہ سچ ہے کہ اس دن خلیفہ نے ایسی باتیں کہی ہیں؟ کیا فاطمہ (س) مسجد میں موجود تھیں اور انہوں نے سنا کہ ان کے شوہر، پیغمبرؐ کے چچا زاد بھائی، مسلم اول کی یوں ہتک اور بے عزتی کی گئی؟ کیا مصلحت اندیشی اور تدبر اسے اس بات کی اجازت دیتا تھا کہ خلیفہ مسلمانوں کے اجتماع میں ایسی باتیں کرے گا؟ اگر یہ باتیں کی گئیں تو حاضرین کا ردعمل کیا تھا؟ کیا وہ خاموش رہے یا کھڑے ہو کر ٹوکا؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ الفاظ گھڑے گئے ہیں...؟ ابن ابی الحدید اور نقیب بصری شیعہ نہیں تھے۔ پس یہ باتیں صرف شیعہ ذرائع سے نقل نہیں ہوئیں۔ کیا یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ معتزلیوں نے

---

(۱) عصر جاہلیت کی ایک فاحشہ عورت تھی۔

(۲) شرح نہج البلاغہ ج ۱۶ ص ۲۱۴ ۔ ۲۱۵

یہ کہانی بنائی ہے اور اسے خلیفہ کی طرف منسوب کردیا ہے؟ یہ بات نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے سے انہیں کیا فائدہ حاصل ہوتا۔

البتہ اس کے رد عمل میں کچھ کہا گیا ہو، یہ ہرگز بعید نہیں ہے۔ کیا اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعد میں پیدا ہونے والی مخالفت سے ممانعت اس کا سبب بنی کہ مرکزی طاقت نے اپنے ہر مخالف کے ساتھ شدید رویہ اختیار کیا؟

اگر ان سب سوالوں کے قطعی جواب نہ بھی مل سکیں پھر بھی ایک نکتہ واضح ہے وہ یہ کہ پیغمبر اسلامؐ کی رحلت مسلمانوں کے لئے بہت بڑی آزمائش تھی۔ قرآن نے پہلے ہی مسلمانوں کی توجہ اس آزمائش کی طرف دلائی کہ اگر محمدؐ شہید یا فوت ہوجائیں تو کہیں تم دین سے پھر نہ جانا اور سابقہ دین کی طرف پلٹ نہ جانا۔

جو کچھ انہوں نے ان ایام میں کیا اور انجام دیا اس کے حق میں ان کے طرفداروں، حکومتی اداروں اور کارندوں نے ادلہ بیان کی ہیں اور کر رہے ہیں۔ وہ ان کے اقدامات کو مسلمانوں کی مصلحت سے سازگار بنانا چاہتے ہیں کہ کلمہ کی وحدت کی حفاظت ضروری ہے۔ اگر نئی حکومت کے خلاف چند گروہ اٹھ کھڑے ہوں تو مرکزی طاقت کمزور ہوجائے گی، جیسے بھی ممکن ہو انہیں مسلمانوں کی اکثریت کے ساتھ ملایا جائے۔ اسلام کا دیرینہ دشمن ابوسفیان موقع کی تلاش میں ہے اور اس نے سازش تیار کرلی ہے۔

وہ کبھی حضرت علیؑ کے پاس جاتا ہے کبھی عباس کے پاس۔ وہ رسولؐ کے ان دو قریبی رشتہ داروں کو خلیفہ کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ خلیفہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر ابوسفیان کامیاب ہوجائے اور مدینہ میں مسلمان دو گروہوں میں بٹ جائیں اور انصار مہاجرین کے مقابلے میں آجائیں تو بہت بڑی تباہی ہوگی۔ قبیلہ خزرج کا سردار سعد بن عبادہ خلافت پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اس نے ابھی تک خلیفہ کی بیعت نہیں کی ہے۔ مسلمانوں کی قیادت و رہبری کے لئے انصار اپنے آپ کو مہاجرین سے زیادہ اہل سمجھ رہے ہیں۔ اگر ابتداء میں حکومت سختی نہ کرے تو ہر روز ایک نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو۔(۱)

پہلے دن سے لے کر آج تک اس قسم کی سینکڑوں توجیہات اور تاویلات بارہا بیان کی جاچکی ہیں۔ ان کے الفاظ اور عبارتیں مختلف ہیں، لیکن مفہوم ایک ہی ہے۔ جو چیز مسلّم ہے، وہ یہ ہے کہ بہت کم افراد ایسے ہوں گے جو سیاسی اور اقتصادی حالات کے بدلنے سے اپنی منطق و گفتار کو تبدیل نہ کریں اور اسے حالات کے مطابق نہ ڈھالیں۔ جیسا کہ میں نے دیگر مقامات پر لکھا ہے (۱) کہ یہ کہا

---

(۱) فاطمة الزهراء۔ عباس عقاد ص ۵۷

جاسکتا ہے کہ اس وقت اس حکومتی گروہ نے ایسے سخت اقدامات کو مناسب سمجھا اور اپنے خیال میں انہیں مسلمانوں کی اصلاح اور بھلائی کی خاطر انجام دیا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مسلمانوں کے فائدے میں تھے یا نہیں؟ یہ خود ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔

انہوں نے اپنے طور پر یہ چاہا کہ اختلاف و انتشار پیدا نہ ہوں۔ فتنہ وفساد برپا نہ ہو یا کم از کم انہوں نے اپنے کردار کی یوں توجیہ کی۔ لیکن جیسا کہ ہم نے لکھا ہے اگر ایک معاشرے میں ایک مسلم اصول (خواہ جس نیت سے بھی ہو) تبدیل کردیا جائے تو آنے والوں کے لئے دیگر اصولوں سے انحراف اور ان میں تغیر و تبدل کے لئے مثال بن جاتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کی بعد میں آنے والی نسلیں پہلے مسلمانوں کی طرح ایثار وقربانی کا جذبہ نہیں رکھتی تھیں۔ اگر ان میں وہی جذبہ موجود ہوتا تو آج مسلمانوں کا رنگ کچھ اور ہوتا۔

کتابوں میں ملتا ہے کہ جب فاطمہ زہراء(س) نے اپنے دعویٰ کے جواب میں اس قسم کی باتیں سنیں تو وہ دل آزردہ اور غضبناک ہو کر گھر چلی گئیں اور اپنے شوہر سے یوں کہا:

يَابْنَ أبى طَالِب اشْتَمَلْتَ شَمْلَةَ الْجَنِينِ وَ قَعَدْتَ حُجْرَةَ الظَّنِين. نَقَضْتَ قَادِمَةَ الأجْدلِ . فَخَاتَكَ رِيشُ الأعْزَلِ.هَذَا ابْنُ أبِي قُحَافَةَ يَبْتَزُّنِى نِحْلَةَ أبِي. وَ بُلَيْغَةَ ابْنِى. لَقَدْ أجْهَرَ فِى خِصامِى. و ألْفَيْتُهُ الَّدِفِى كَلامِى.حَتَّى حَبَسَنِيى قَيْلَةُ نَصْرَهَا وَالْمُهَاجِرَةُ وَصْلَهَا. وَغَضَّتِ الْجَمَاعَةُ دُونى طَرْفَهَا فَلاَ دَ افِعَ وَلاَ مَانِع خَرَجْتُ كَاظِمَةً. وَعُدْتُ رَاغِمَةً. أضْرَعْتَ خَدَّكَ يَوْمَ أضَعْتَ حَدَّكَ.إفْتَرَسْتَ الذِّئَابَ وَاسْتَرَشْتَ التُرَابَ. مَا كَفَفْتُ قَائِلاً وَلاَ أغْنَيْتُ بَاطِلاً وَلاَ خِيَارَ لِى.

ابو طالبؑ کے بیٹے! آپ کب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے ملزموں اور تہمت زدوں کی طرح گھر میں بیٹھے رہیں گے؟ کیا آپ وہی جنگجو اور بہادر کمانڈر نہیں ہیں؟ کیاان کے ہاتھوں مجبور ہوگئے ہیں؟ابو قحافہ کے بیٹے نے میری بے حرمتی کی ہے میرے تقدس و احترام کو پامال کیا ہے۔ میرے بچوں کے منہ سے روٹی کا نوالہ چھین لیا ہے۔ اس نے کھلم کھلا مجھ سے دشمنی کی ہے۔ ضد اور ہٹ دھرمی میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی یہاں تک کہ مہاجرین و انصار نے میری حمایت نہیں کی اور میری مدد کے لئے انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے میرے حق سے چشم پوشی اختیار کر لی ہے۔ میرا نہ کوئی طرفدار ہے اور نہ کوئی حامی و مدد گار۔ میں جس ناراض حالت میں گئی تھی اسی طرح خوار واپس آئی ہوں۔ اس دن آپ کو نیچا دکھایا گیا جب آپ کے مقام و منصب سے گرایا گیا۔ کل تک آپ شیر خدا تھے۔ بڑے بڑے بہادروں کو آپ نے ناکوں چنے چبوائے ہیں۔ آج آپ کیوں گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے ہیں اور سب دروازے اپنے اوپر بند کرلئے ہیں؟ میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا، لیکن میں ان پر غالب نہیں آسکی۔

لَيْتَنِى مِتُّ قَبْلَ هُنَيَّتِى وَدُونَ ذِلَّتِى. عَذِيرِىَ اللّٰه مِنْكَ عَادِياً وَمِنْكَ حَامِياً وَ يَلاَىَ فِى كُلِّ

کاش میں اس ذلت وخواری سے پہلے مر گئی ہوتی اور خلیفہ کے ظالمانہ رویے کو نہ دیکھتی۔ اگر میں نے آپ سے کوئی سخت بات کہی ہو یا اس وجہ سے کہ آپ نے

شارِقٍ. وَيْلاىَ ماتَ الْعَمَدُ. وَ وَهَنَتِ الْعَضُدُ. وَشكْواىَ اِلىٰ اَبى وَعَدْواىَ اِلىٰ رَبّى. اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اَشَدُّ قُوَّةً. فاجابَها اَمِيْرُالْمُؤمِنِين:لاوَيْلَ لَکِ.بَلِ الْوَيْلُ لِشانِئِکِ.

نَهْنِهِى عَنْ وَجْدِکِ يَابْنَةَ الصَّفْوَةِ . وَ بَقِيَّةَ النُّبُوَّةِ فَما وَنَيْتُ عَنْ دِينى وَلاَ اَخْطَاْتُ مَقْدُورِى فَاِنْ كُنْتِ تُرِيدِينَ الْبُلْغَةَ فَرِزْقُکِ مَضْمُونٌ . وَكَفِيلُکِ مَاْمُونٌ وَما اُعِدَّلَکِ خَيْرٌ مِمّا قُطِعَ عَنْکِ. فَاحْتَسِبِى اللّٰهَ فَقالَتْ حَسْبِىَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ .

میری مدد نہیں کی اور میں نے آپ سے شکوہ کیا ہو تو میں خدا کی بارگاہ میں معافی کی طلب گار ہوں۔ افسوس کہ میری کمر ٹوٹ گئی، میرے ساتھی میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ خدا کی قسم میں اپنے بابا سے شکایت کروں گی اور خدا سے انصاف طلب کروں گی۔ اے میرے اللہ ! تیری قدرت و طاقت سب پر حاوی ہے۔ علیؑ نے ان کے جواب میں فرمایا:

اے مصطفیٰؐ کی لخت جگر ! سردار انبیاء کی نشانی ! پریشان اور غمزدہ نہ ہوں۔ وائے آپ کے دشمن پر ہے ، نہ کہ آپ پر۔ خاک آپ کے بد زبان دشمن کے منہ میں ہو۔ میں سستی ، کاہلی یا بزدلی کی وجہ سے گھر میں نہیں بیٹھ رہا بلکہ میں نے جو کچھ بہتر سمجھا وہی کیا ہے۔ اگر روٹی اور رزق کا مسئلہ ہے تو وہ محفوظ ہے۔ جس نے روزی دینے کا وعدہ کیا ہے وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا ہے۔ آپ اس مسئلے کو خدا پر چھوڑ دیں۔ سیدہ(س) نے فرمایا: میں نے خدا پر چھوڑدیا۔ وہی میرے لئے کافی اور وہ بہترین حمایت کرنے والا ہے۔

اس گفتگو کو ابن شہر آشوب نے سند کا ذکر کیے بغیر اپنی کتاب مناقب میں نقل کیا ہے۔(۱) اور یہی مکالمہ مختصر اختلاف کے ساتھ بحارالانوار(۲) میں بھی مذکور ہے ۔ کیا اس قسم کی گفتگو جناب فاطمہ(س) اور علیؑ کے درمیان واقع ہوئی؟ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ شیعہ تو ان دو ہستیوں کے بارے میں عصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں تو کیا یہ قبول کیا جاسکتا ہے کہ دختر رسولؐ اس طرح اپنے شوہر کی سرزنش کرے؟ اور وہ بھی بچوں کے روٹی پانی کے لئے؟ بدیہی ہے کہ اس کا جواب دیا جاسکتا ہے اور اس کلام کی تاویل کی جاسکتی ہے لیکن اگر ہم بحث میں الجھ گئے اور اعتراضات اور ان کے جوابات دینے لگ گئے تو منطقی و استدلالی بحث کا دامن بہت دور تک پھیل جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ فریقین میں کس کے دلائل زیادہ وزنی ہیں اور کون زیادہ بات کرنے کا ماہر ہے یا وہ کس طرح روایت کو اپنے حق میں موڑ سکتا ہے اور اپنے مطلب کی تائید میں ان کی کس طرح تاویل اور توجیہ کر سکتا ہے؟ یہ طریقہ کار تاریخ کے محققین کے دائرے سے باہر ہے۔

جو چیز ہمارے پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی بیٹی سے منسوب یہ کلام معنوی اور لفظی آرائش سے مزین ہے۔ استعارہ ، تشبیہ ، کنایہ ، مسجع عبارات کی بہتات ہے۔ اس کلام میں اگر خطبہ ان ادبی خوبیوں سے آراستہ ہو تو اس کا زیور ہے اور ایسی بات جو ایک مجمع میں کہی گئی ہو اسے واقعاً ایسا ہونا چاہیے کہ دلوں میں اتر جائے۔ اس قسم کے خطاب میں خطیب کو معنویت، مفہوم اور زیبائی پر توجہ رکھنے کے ساتھ لفظی زیبائش و زینت پر بھی متوجہ رہنا چاہیے۔ لیکن میاں بیوی کے درمیان گلہ شکوہ ایسا کیونکر ہونا چاہیے؟ کیا رسول اللہؐ کی بیٹی اپنی خطابت کی دھاک اپنے شوہر پر بٹھانا چاہتی تھیں

یا فن خطابت سے انہیں مرعوب کرنا چاہتی تھیں؟ بہرحال اس بارے میں اگر مگر ہو سکتا ہے لیکن حقیقت کا علم خدا ہی کے پاس ہے۔

☆☆☆☆☆

---

(۱) مناقب ابن شھر آشوب ج ۲ ص ۲۰۸

(۲) بحار ج ۴۳ ص ۱۴۸

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْاَنَّهَا صُبَّتْ عَلَی اَلاَیّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

(جناب زہرا(س))

مجھ پر ایسی مصیبتیں پڑی ہیں کہ اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو وہ راتیں بن جاتیں۔

باپ کی رحلت، شوہر کی مظلومیت، حق کا چھن جانا اور سب سے بڑھ کر رسول خداؐ کی رحلت کے چند ہی روز بعد سنت میں مسلمانوں کی تبدیلیاں اور رد و بدل جیسے عوامل نے حضرت فاطمہ(س) کے روح اور جسم کو سخت آزردہ اور کبیدہ خاطر کردیا۔ جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے کہ باپ کے انتقال سے پہلے انہیں کوئی جسمانی بیماری نہ تھی۔

کوئی کتاب یا تحریر بیان نہیں کرتی کہ جناب زہرا(س) اس وقت یعنی رسولؐ کی وفات سے پہلے بیمار تھیں۔(۱) بعض معاصرین نے یہ لکھا ہے کہ جناب فاطمہ(س) کا جسم بنیادی طور پر کمزور اور لاغر تھا۔(۲)

کتاب **فاطمة الزهرا** کے مؤلف کی تحریر اگرچہ ان دنوں میں جناب فاطمہ(س) کی بیماری کی تصریح نہیں کرتی لیکن اس میں اس بات کا اشارہ ضرور ملتا ہے۔ عقاد یوں رقم طراز ہیں:

زہرا(س) کا بدن کمزور اور لاغر تھا۔ ان کا رنگ گندمی اور اڑا ہوا تھا۔ باپ نے اپنی بیماری کی حالت میں انہیں دیکھا تو کہا کہ وہ رشتہ داروں میں سب سے پہلے مجھ سے ملحق ہوں گی۔(۳)

---

(۱) انساب الاشراف ص ۴۰۵

(۲) فاطمہ فاطمہ است ص ۱۱۷

(۳) فاطمة الزهراء ص ٦٦

ان دو مصنفین میں سے کسی نے بھی اپنی روایت کی سند بیان نہیں کی ہے۔

عقاد کی عبارت کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب رسول اکرمؐ نے اپنی بیٹی کو بیمار یا لاغر و نحیف دیکھا تو انہیں مذکورہ خبر دی۔ میں بعض قدماء کی طرح یہ نہیں کہتا کہ فاطمہ زہرا(س) دوسرے عام افراد کی نسبت سے ایک دن میں ایک مہینہ اور ایک مہینے میں ایک سال کے برابر نشوونما پاتی تھیں ۔(۱) لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اور مستند روایات بھی بتاتی ہیں کہ جناب زہرا نہ بیمار تھیں، نہ کمزور، نہ ان کا رنگ اڑا ہوا تھا اور نہ کوئی اور مسئلہ تھا ان کی بیماری واقعات اور سانحات کے بعد شروع ہوتی ہے۔

اپنے بابا کی وفات کے بعد جتنے دن وہ زندہ رہیں، غمزدہ، پریشان، پژمردہ اور اداس رہیں اور روتی رہیں۔ ان سے اپنے بابا کی جدائی برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے جب انہوں نے اپنے بابا سے اپنی موت کی خبر سنی تو مسکرانے لگیں ۔ وہ بابا کے بغیر زندہ رہنے کی بجائے مرجانے میں خوشی سمجھتی تھیں۔

ان لوگوں کے واقعات ہم نے بیان کردیے ہیں جو ان کے دروازے پر لکڑیاں لے کر آئے اور جو پورے گھر کو گھر والوں سمیت جلا دینا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے ملاحظہ کیا قدیم ترین متون میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ صرف یہ واقعہ ان کو اذیت و آزار پہنچانے کے لیے کافی تھا۔ چہ جائیکہ مزید دوسرے ظلم و ستم بھی ان پر توڑے گئے۔ کیا یہ درست ہے کہ نبی کی بیٹی کے بازو پر تازیانے مارے گئے اور ان کے بازو کو زخمی کردیا گیا؟ کیا وہ زبردستی اندر داخل ہونا چاہتے تھے۔ وہ تو دروازے کے پیچھے تھیں؟ کیا ان کو چوٹ لگی؟ اس ہنگامے اور ہلڑبازی میں ممکن ہے یہ سانحہ رونما ہوا ہو۔ اگر یہ حقیقت ہے تو انہوں نے کیوں اور کس لئے ایسی سختی کو روا رکھا؟ کس طرح اس واقعہ کو قبول کیا جائے اور اس کی کیا تاویل و توجیہ کی جائے؟

وہ مسلمان جنہوں نے راہ خدا میں اس کی رضا کے لئے اور اپنے دین و عقیدہ کی حفاظت کی خاطر سخت ترین تکالیف اور اذیتیں برداشت کیں۔ جنہوں نے اپنے مال کی پرواہ نہ کی۔ اپنے نزدیک ترین عزیزوں سے رشتے توڑ ڈالے۔ اپنا گھربار چھوڑ دیا۔ خدا کی خاطر اجنبی ملک اور بیگانے شہر میں ہجرت کی۔ اس کے بعد میدان جنگ میں بارہا اپنی جانیں شہادت کے لئے پیش کیں ۔ وہ کس طرح ان واقعات اور مظالم کو دیکھ کر خاموش بیٹھے رہے۔

سچی بات ہے کہ جناب فاطمہ زہرا(س) کے نور نظر حضرت حسینؑ کا کلام کتنا برحق اور سبق آموز ہے:

---

(۱) روضۃ الواعظین ص ۱۴۴

فَاِذَا مُحِصُّوا بِالْبَلاءِ قَلَّ الدَّيَّانُوْنَ

جب آزمائش کی گھڑی آتی ہے تو دیندار کم رہ جاتے ہیں۔

رسول اللہؐ کے اعلان نبوت سے لے کر اس تاریخ تک سال اور ہجرت کے بعد دس سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ان سالوں کے دوران بعض دنیا پرست جن کے پاس اسلام قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، اسلام کی پناہ میں آگئے تھے۔ ان میں سے بعض اشخاص تن آسان، جسم پرور، جاہ طلب اور دولت مندوں کی عادتیں رکھنے والے تھے۔ ان کے مزاج پر دین کی پابندیاں ناگوار تھیں۔ اگر انہوں نے اسلام قبول کیا تو صرف اس لیے کہ اس کے سوا ان کے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا۔

قریش جو ایک سرکش قبیلہ اور مکہ اور عرب پر حکومت کرنا اپنا حق سمجھتا تھا، فتح مکہ کے بعد جب اس نے اسلام کی بہت بڑی طاقت کے سامنے اپنے آپ کو سرنگوں پایا تو جان کے خوف اور جاہ و منصب کے لالچ میں مسلمان ہو گیا۔ اس کی یہی کوشش تھی کہ وہ اسلام کی قدرت و طاقت کو صرف اپنے قبضہ قدرت میں لے آئے۔ بہت زیادہ حسن ظن اور حقیقت پوشی کی ضرورت ہے کہ ہم یہ کہیں کہ چونکہ یہ افراد ایک یا دو مرتبہ پیغمبر اکرمؐ کی صحبت میں بیٹھے ہیں لہذا محدثین کی اصطلاح میں صحابیت کے درجے پر فائز ہو گئے ہیں۔ نفسانی خواہشات پر انہوں نے قابو پا لیا، متقی، پرہیز گار اور سچے مسلمان بن گئے تھے۔

اسلام سے پہلے کی صدیوں میں عربوں کی باہمی رقابت خصوصاً جنوبی اور شمالی عربوں کی آپس میں دشمنی و مخالفت سے ہم آگاہ ہیں۔(۱) حجاز کے لوگ اپنے صحرا نشینی کے مزاج کے پیش نظر یثرب کے لوگوں کو، جو قحطانی نسل سے اور کھیتی باڑی کرتے تھے، حقیر اور پست خیال کرتے تھے۔ قحطانیوں یا یثرب میں مقیم جنوبی عربوں نے پیغمبر اسلامؐ کو مکہ سے اپنے شہر مدینہ آنے کی دعوت دی وہ آپؐ پر ایمان لے آئے اور آپؐ سے عہد وپیمان باندھا۔ جنگ بدر، احد، خندق اور دوسرے غزوات میں قریش سے انہوں نے معرکے لڑے اور آخر کار ان کے شہر مکہ کو فتح کر لیا۔ قریش کے لیے اپنی یہ ذلت و شکست کسی صورت میں بھی قابل قبول نہ تھی۔ اس کے علاوہ مدینہ کے یہی لوگ سقیفہ میں خلافت پر نظریں جمائے ہوئے تھے (اور خلافت کے دعویدار تھے)۔ صرف ابو بکر کی اس یاددہانی پر کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ امام قریش سے ہونا چاہیے، وہ پیچھے ہٹ گئے (اور اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو گئے)۔ انصار جس طرح رسول اللہؐ کے گرد جمع ہو گئے تھے اگر ان کے اہل بیتؑ کے گرد بھی اس طرح جمع ہو جاتے اور ان کی حمایت کرتے اور اہل بیت کی عزت و احترام برقرار رہتا تو اس بات کی کون ضمانت دے سکتا تھا کہ ایک مرتبہ پھر قحطانی عدنانیوں کی پیشانی کو زمین پر ٹیک نہ دیتے۔ یہ ایسے

---

(۱) پس از پنجاہ سال اشاعت دوم ص ۳۱

حقائق تھے جنہیں اس وقت کے سیاستدان اور صاحبان اقتدار بخوبی جانتے تھے۔ اگر ہم ان حقائق کو تسلیم کرلیں یا اپنے آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھیں کہ سب اصحاب رسولؐ، ایثار و قربانی میں ایک ہی درجے پر ہیں اور اس قسم کے احتمالات ان کے بارے میں نہیں دیئے جاسکتے ہمارے اس رویے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔

مہاجرین و انصار کے درمیان پیمان اخوت و برادری (پیمان مواخات) کے بعد عرب کے شمال اور جنوب کے درمیان عداوت و دشمنی وقتی طور پر دب گئی تھی لیکن وفات پیغمبرؐ کے بعد اس دشمنی نے اپنے پر دوبارہ نکالنا شروع کردیئے تھے مزید آنے والے سالوں میں یہ عداوت اور ابھر کر سامنے آئی۔ چنانچہ تاریخ اسلام سے واقفیت رکھنے والے افراد جانتے ہیں کہ ان دو نسلوں (قحطانی اور عدنانی) کے درمیان پورے عالم اسلام میں کشمکش، معتصم عباسی کے دور تک، شد و مد کے ساتھ اپنی جگہ باقی رہی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ خدانخواستہ تمام اصحاب رسولؐ کی یہی سوچ اور فکر تھی۔ ان دونوں قبائل (حضری اور قریشی) میں ایسے افراد بھی موجود تھے جو اپنے کردار و گفتار میں خدا کو مدنظر رکھتے تھے نہ کہ دنیا ان کے سامنے تھی۔ ان کی یہ حالت تھی کہ کبھی کبھی حکم الہٰی کی فرمان برداری اور اطاعت میں اپنے بھائی اور بیٹے کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے لیکن ان کی تعداد کم تھی۔ کیا یہ بات آسانی سے قبول کی جاسکتی ہے کہ سہیل بن عمرو، عمرو بن عاص، ابو سفیان اور سعد بن عبداللہ بن ابی سرح دین کا درد رکھتے تھے؟ بہت زیادہ سادہ اندیشی ہے اگر ہم یہ کہیں کہ جس نے بھی ایک دن یا چند روز یا ایک مہینہ یا ایک سال پیغمبر اکرمؐ کی صحبت میں گزارا، وہ آنحضرتؐ سے منقول اس حدیث میں شامل ہو جاتا ہے: میرے یار و اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے کسی ایک کی بھی پیروی کرلو ہدایت پا جاؤ گے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ یہ حدیث سند اور متن کے لحاظ سے درست ہے یا نہیں، یہ کام محدثین کا ہے۔ جو چیز مسلم ہے وہ یہ ہے کہ ان دنوں میں یا کم از کم اس کے چند سال بعد اصحاب رسولؐ ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئے۔ یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ جنہوں نے علیؑ کی پیروی کی اور جو طلحہ وزبیر اور معاویہ کے نقش قدم پر چلے اور ان کی اقتداء کی سب راہ راست پر تھے۔

یہ جواب دیا جائے گا کہ خلیفہ اور اس کے یار و اصحاب ابتدائی مسلمانوں (سابقون) میں سے اور درجہ اول کے مہاجرین میں سے تھے۔ یہ بات درست ہے لیکن خلیفہ اور ایک دو اشخاص کو چھوڑ کر آپ دیکھیں کہ قریش کے علاوہ حکومت کے سرکردہ افراد کون تھے؟ کس قبیلے کے افراد کے کاندھوں پر حکومت کا بوجھ تھا؟ حکومت کی باگ ڈور کن لوگوں کے ہاتھ میں تھی؟ حکومت کے کرتا دھرتا افراد کا تعلق قریش کے سوا کس قبیلے سے تھا؟ ہاں! حکومت کی مضبوطی کے لئے تمام قوتیں مجتمع ہوں اور اس قوت و طاقت کے حصول اور برقرار رکھنے کے لئے ہر قسم کی مخالفت کو سرکوب

کر دینا چاہیے اور یہ بات بھی قدرتی امر ہے کہ حالات و شرائط کے بدلنے سے منطق افکار اور نظریات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعاً (الکھف: ۱۰۴)

وہ لوگ جن کی دنیاوی زندگی کی سعی و کوشش سب برباد ہو گئی اور وہ اس خام خیالی میں ہیں کہ یقیناً اچھے کام کر رہے ہیں۔

دکھوں کی ماری فاطمہ سلام اللہ علیہا بستر بیماری پر ہیں۔ ان کی علالت کے دوران سر بکف مجاہد اور ہمیشہ جہاد کے لیے تیار وہ مسلمان کہ جن کے پاس جو کچھ تھا وہ سب زہرا(س) کے بابا کی برکت سے تھا۔ ان میں سے کتنے افراد عیادت اور بیمار پرسی کے لئے آئے؟ کوئی بھی نہیں۔ سوائے دو آدمیوں کے اور وہ دونوں محروم و مظلوم سلمانؓ اور بلالؓ تھے۔

جو کچھ بھی ہو عورتوں کے دل مردوں کی نسبت نازک ہوتے ہیں۔ ان میں احساس ہمدردی زیادہ پایا جاتا ہے۔ خصوصاً اس دور میں جب عورتیں سیاسی میدان سے باہر تھیں۔ جو واقعات رونما ہوئے ان میں وہ بلاواسطہ شریک نہیں تھیں۔

شیخ صدوق اپنی روایت میں جس کی سند جناب فاطمہ بنت حسینؑ بن علیؑ تک پہنچتی ہے، لکھتے ہیں(۱):

> مہاجرین اور انصار کی عورتیں ان کے پاس آئیں لیکن احمد بن ابی طاہر کی عبارت میں صرف عورتوں(نساء) کا ذکر ہے، مہاجرین اور انصار کا نام اس نے نہیں لیا ہے۔

اگر مہاجر عورتوں میں سے بھی کسی نے عیادت کرنے والیوں میں شرکت کی تو قطعی بات

---

(۱) بحار ج ۴۳ ص ۱۵۸

(۲) بلاغات النساء ص ۳۲

ہے کہ وہ کسی ممتاز مہاجر یا کسی حکومتی عہدیدار کی رشتہ دار نہ تھی۔ البتہ انصار کا مسئلہ دوسرا تھا۔ ان کی پوزیشن دوسری تھی انہوں نے جب پیغمبر اسلام کو اپنے شہر آنے کی دعوت دی۔ اسی وقت سے انہوں نے حضورؐ کے گھر والوں اور اقرباء سے تعلقات استوار کرلئے اور ان سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ بعد میں اسی تعلق کو اور زیادہ مستحکم کیا۔

جیسا کہ ہم بعد میں اس کی طرف اشارہ کریں گے۔ان میں سے اکثریت نے علیؑ اور ان کے بیٹوں اور ان کے خاندان سے اس دوستی کو نبھایا۔ بہر حال ان عورتوں کے پوچھنے پر جو جواب رسول اللہؐ کی بیٹی نے انہیں دیا، وہ اس دور کے لوگوں کی بدلتی ہوئی روحانی حالت کی عکاسی کرتا ہے، جو دوسرے زمانوں سے مماثلت رکھتی ہے۔ جناب فاطمہ(س) نے ان کے مردوں کے کردار کا ان سے شکوہ کیا۔

جناب زہرا(س) کی گفتگو، احوال پرسی کا جواب نہیں بلکہ ایک فصیح وبلیغ خطبہ ہے جو مدینے کے ان دنوں کے حالات کا نقشہ پیش کررہا ہے۔ ایک چوتھائی صدی بعد پیش آنے والے واقعات کی پیشگوئی کررہا ہے۔ اس خطبے کا سب سے پرانا نسخہ جو مصنف کی دسترس میں ہے وہ کتاب بلاغات النساء ہے۔ البتہ یہی گفتگو اور خطبہ دوسری کتب جیسے امالی شیخ طوسی، کشف الغمہ' احتجاج طبرسی، بحار الانوار اور دیگر کتابوں میں بھی نقل ہوا ہے۔ میں نے احمد بن ابی طاہر کی عبارت کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے اور چونکہ یہ کلام بھی ادبی صنائع سے بھرپور اور مزین ہے، لہذا میں نے کوشش کی ہے کہ اس کا ترجمہ بھی ادبی زیور سے خالی نہ ہو لیکن:

گر بریزی بحر را در کوزہ ای چند گنجد قسمت یک روزہ ای (۱)

كَيْفَ اَصْبَحْتِ مِنْ عِلَّتِكِ يابِنْتَ رَسُولِ اللّٰهِ ؟ اَصْبَحْتُ وَاللّٰهِ عائِفَةً لِدُنْياكُمْ . قالِيَةً لِرِجالِكُمْ . لَفَظْتُهُمْ بَعْدَ اَنْ عَجَمْتُهُمْ وَشَنَأْتُهُمْ بَعْدَ اَنْ سَبَرْتُهُمْ . فَقُبْحاً لِفُلُولِ الْحَدِّ. وَخَوَرِ الْقَناةِ وَخَطَلِ الرَّأْيِ " وَبِئْسَما قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذابِ هُمْ خالِدُونَ .

عورتیں پوچھتی ہیں: رسول خداؐ کی بیٹی کیسی ہو؟ بیماری کی کیا حالت ہے؟ جناب فاطمہ(س) فرماتی ہیں: خدا کی قسم تمہاری دنیا اب اچھی نہیں لگتی۔ میں تمہارے مردوں سے بیزار ہوں میں نے ان کے ظاہر و باطن کو آزمایا ہے۔جو کچھ انہوں نے کیا ہے، میں اس سے نالاں اور ناراض ہوں۔ وہ زنگ آلودہ تلوار کی مانند ہوگئے ہیں، جس کی دھار کند ہوچکی ہے۔ وہ کبھی آگے بڑھتے ہیں اور کبھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کے افکار نامعقول ہیں۔ وہ فضول باتوں کے دھنی ہیں۔ انہوں نے غضب الٰہی خریدا ہے اور وہ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔

---

(۱) مثنوی مولانا رومی طبع نیکلسن دفتر ۱،۲ ص ۴

لا جَرَمَ لَقَدْ قَلَّدْتُهُمْ رِبْقَتَها . وَشَنَنْتُ عَلَيْهِمْ عارَها . فَجَدْعاً وَعَقْراً وَ بُعْداً لِلْقَوْمِ الظّالِمِينَ . وَيْحَهُمْ أنّىٰ زَحْزَحُوها عَنْ رَواسِى الرِّسالَةِ . وَقَواعِدِ النُّبُوَّةِ . وَمَهْبِطِ الرُّوحِ الْأمين . اَلطَّبِينِ بِاُمُورِ الدُّنيا وَالدّينِ. الا ذٰلِکَ هُوَ الْخُسْرانُ الْمُبِينُ. وَمَا الَّذِى نَقَمُوا مِنْ أبِى الْحَسَنِ؟ نَقَمُوا وَاللّٰهِ نَكِيرَ سَيْفِهِ وَشِدَّةَ وَطْاتِهِ . وَنَكالَ وَقْعَتِهِ وَتَنَمُّرَهُ فِى ذاتِ اللّٰهِ .

وَتَاللّٰهِ لَوْتَكا فَوُوا عَنْ زِمامٍ نَبَذَهُ اِلَيْهِ رَسُولُ اللّٰهِ (ص) لَسبارَبِهِمْ سَيْراً سُجُحاً لا يَكْلَمُ خِشاشُهُ . وَلاٰ يُتَعْتَعُ راكِبُهُ. و لَأوْرَدَهُمْ مَنْهلاً نَمِيراً فَضْفاضاً تَطْفَحُ ضَفَّتاهُ . وَلَأصْدَرَهُمْ بِطاناً قَدْ تَحَيَّرَ بِهِمُ الرَّىُ. غَيْرَ مُتَحَلّى بِطائِل . اِلّا بِغَمْرِ النّاهِلِ . وَرِدْعَةِ سَوْرَةِ السّاغِبِ . وَلَفَتَحَتْ عَلَيْهِمْ بَرَكاتٌ مِنَ السَّماء وَالْأرْضِ، وَسَياخُذُهُمُ اللّٰهُ بِما كانُو يَكْسِبُون.

اَلاٰ هَلُمَّنَّ فاسْمَعْنَ.

وَمآ عِشْتُنَّ اَراكُنَّ الدَّهْرُ عَجَباً. اِلىٰ اَىِّ لَجَا اِسْتَنَدُوا وَبِاَىِّ عُرْوَةٍ تَمَسَّكُوا؟ "وَلَبِئْسَ الْمَوْلَىٰ وَلَبِئْس الْعَشِيرُوَلَبِئْس لِلظّالِمينَ بَدَلاً". اِسْتَبْدَلُو وَاللّهِ الذُّنابَى بِالْقَوادِم.وَالْعَجُزَ بِالْكاهِلِ. فَرَغْماً لِمَعاطِسِ قَوْمٍ يَحْسَبُونَ أنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنعاً الا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لاٰ يَشْعُرُونَ .

میں نے مجبوراً اپنا معاملہ ان پر چھوڑ دیا ہے۔ ظلم و ناانصافی کی ذلت کا طوق ان کی گردنوں میں ڈال دیا ہے۔ میں ان مکاروں پر نفرین کرتی ہوں ۔ وہ ظالم، ستمگر اور رحمت الٰہی سے دور ہیں۔ وائے ہو ان پر۔ انہوں نے کیوں حق کو اپنے مرکز پر قائم نہ ہونے دیا؟ اور خلافت کو نبوت کی بنیادوں پر استوار کیوں نہ ہونے دیا؟ انہوں نے اس سے رخ پھیرا جو جبرائیل علیہ السلام کے نزول کا مقام ہے۔ اور علیؑ کے حق میں جو امور دنیا اور دین کا عالم ہے، یقیناً انہوں نے خسران مبین اٹھایا ہے۔ خدا کی قسم انہوں نے اس لیے علیؑ کو پسند نہیں کیا کیونکہ ان کی تلوار سے زخم کھا چکے تھے، ان کی استقامت اور ثابت قدمی کو دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ علیؑ کس طرح ان پر حملہ آور ہوتا ہے اور خدا کے دشمنوں سے ساز باز نہیں کرتا ہے۔

واللہ! اگر وہ رخنہ اندازی نہ کرتے اور علیؑ کو پیغمبرؐ کی طرف سے لگائی گئی ذمہ داری کو ادا کرنے دیتے اور رسول اللہؐ کی طرف سے منسوب منصب پر انہیں آنے دیتے تو علیؑ انہیں آہستہ آہستہ راہ راست پر لے آتے ۔ ہر ایک کو اس کا حق دلاتے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچتا اور ہر ایک اپنے کیے کا پھل کھاتا۔ عدالت کے پیاسے چشمہ عدل وانصاف سے سیراب ہوتے۔ زیردست اور کمزور ان کی بہادری کے سائے میں طاقتور بن جاتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو زمین و آسمان کی رحمت کے دروازے ان پر کھل جاتے۔ لیکن افسوس! انہوں نے ایسا نہ کیا جو کچھ انہوں نے انجام دیا خداوند بہت جلد انہیں اس کی سزا دے گا اور عذاب میں مبتلا کرے گا۔

آؤ اور میری باتیں غور سے سنو!

کیا عجیب ہے! زمانے کے دامن میں کیا کیا عجائب پوشیدہ ہیں ہر روز یکے بعد دیگرے کیا کیا عجیب رنگ اور عجیب باتیں سامنے آرہی ہیں ۔ سچ بتاؤ! تمہارے مردوں نے کیوں ایسا کیا؟ انہوں نے اپنے لئے کیا بہانہ بنایا ہے؟ دوستوں سے غداری کرنے والے، دوستوں کے حق میں دشمنی کرنے والے اور دوستوں پر ظلم و ستم ڈھانے والے آخر کار اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ اپنے برے اعمال کی سزا پائیں گے۔ وہ دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ عالم کو چھوڑ کر جاہل کے پیچھے چل پڑے ہیں ۔ ایسے بیوقوف فساد پھیلانے والے مردوں پر لعنت ہو جو اپنے فساد کو نیکی اور بھلائی سمجھتے ہیں۔

وَيْحَهُمْ ! أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ . أَمَا لَعَمْرِ إِلٰهِكُنَّ لَقَدْ لَقِحَتْ فَنَظِرَةٌ ، رَيْثَمَا تَنْتِجُ . ثُمَّ احْتَلِبُوا طِلَاعَ الْقَعْبِ دَماً عَبِيطاً وَ ذُعَافاً مُمْقِراً هُنَالِكَ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُونَ وَيَعْرِفُ التَّالُونَ غِبَّ مَا أَسَّسَ الْأَوَّلُونَ .

وائے ہو ان پر! کیا اس کی پیروی کرنا زیادہ مناسب ہے جو لوگوں کو راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے یا اس کی جو خود گمراہ ہے؟ اس بارے میں تم کیا فیصلہ کرتے ہو؟ تمہارے اللہ کی قسم جو انہیں نہیں کرنا چاہیے تھا، وہی انہوں نے کیا۔ فتنہ و فساد کا آغاز ہو گیا ہے۔ اب وہ اپنے کردار کے خطرناک انجام کا کچھ دیر انتظار کریں۔ اس کے بعد انہیں ہوش آئے گا کہ کیا ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور کتنے خون بہائے گئے ہیں۔ زندگی کی لذتیں، زمین کی تمام تر وسعتوں کے باوجود، سب پر حرام ہو جائیں گی۔ اس دن نقصان اٹھانے والوں کی حالت دیکھنے والی ہو گی اور جو آئندہ آنے والے ہوں گے انہیں اپنے بزرگوں کے گناہوں کی سزا ملے گی اور انکی پیدا کردہ مشکلات میں بے بس و مجبور نظر آئیں گے۔

ثُمَّ طِيبُوا عَنْ أَنْفُسِكُمْ نَفْساً . وَطَامِنُوا لِلْفِتْنَةِ جَاشاً وَأَبْشِرُوا بِسَيْفٍ صَارِمٍ . وَبِهَرْجٍ شَامِلٍ وَاسْتِبْدَادٍ مِنَ الظَّالِمِينَ . يَدَعُ فَيْئَكُمْ زَهِيداً وَجَمْعَكُمْ حَصِيداً فَيَا حَسْرَةً لَكُمْ وَ أَنَّى بِكُمْ وَقَدْ " عُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ - (آیہ ۲۸ سورہ ہود) "

اب تیار رہو! کیونکہ مصائب و مشکلات کی ہوا چل پڑی ہے اور خدا کی تلوار غضب نیام انتقام سے باہر آچکی ہے۔ تمہیں وہ ہرگز نہیں چھوڑے گی اور تمہیں اپنے کیفر کردار تک پہنچا کر دم لے گی۔ اس وقت تمہارا پچھتاوا تمہارے کسی کام نہ آئے گا۔ تمہاری وحدت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ تمہاری بنیادیں اکھڑ جائیں گی۔ افسوس کہ تمہارے پاس بصیرت نہیں ہے۔ تمہاری آنکھیں حقیقت کو نہیں دیکھ سکتیں اور یہ ہم پر کوئی الزام نہیں ہے اگر تم حق کو ناپسند کرتے ہو۔

اگرچہ یہ باتیں اس دن ایک مظلومہ، محرومہ اور دکھیاری خاتون کے گلے شکوے اور دل کی بھڑاس لگتی تھیں، لیکن حقیقت میں خطرے کا اعلان تھیں۔ یہ خطرہ صرف مہاجرین و انصار کے لیے نہیں تھا بلکہ حکمرانوں اور نظام اسلام کے مستقبل کے لیے تھا۔ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ نبی کی بیٹی نے مسلمانوں کے اجتماع میں جن خطرات اور ان کے عواقب سے مسلمانوں کو خبردار کیا تھا اور بستر بیماری پر جن امور کی پیشگوئی کی تھی وہ وقوع پذیر ہو گئے۔ علی علیہ السلام کو خلافت سے محروم کر کے انہوں نے کہا تھا کہ رسالت اور رہبری ایک ہی خاندان میں جمع نہیں ہونی چاہئیں اور کہا کہ قریش خود خواہ اور برتری کا طالب قبیلہ اسی طرح سرداری و حکمرانی کرے۔ اس وقت اس کے انجام کی طرف ان کی توجہ نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ سرداری اور قیادت قریش سے بنی امیہ میں منتقل ہو جائے گی اور پھر ابوسفیان کے بیٹوں میں، وہاں سے حکم بن عاص کے خاندان اور مروانیوں کے قبضے میں چلی جائے گی۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے فیصلے کی جلد بازی کی تیز ہوا عراق اور شام کے درمیان دیرینہ دشمنی کی سلگتی ہوئی چنگاری کو بھڑکا اور اس کے شعلوں کو بلند کر سکتی ہے جو سب کو

اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ انہیں خبر نہ تھی کہ قحطانی اور عدنانی عداوت اور رقابت کا پھر سے آغاز ہو جائے گا اور دو گروہ دست و گریبان ہو جائیں گے اور اس شورش و ہنگامے میں کئی خلفاء کی جانیں تلف ہو جائیں گی اور آخر کار ایسی آگ بھڑکے گی جو تمام عالم اسلام، حجاز، شام اور مشرق کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

ارشاد الٰہی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (الرعد: ۱۱)

اللہ لوگوں کی (موجودہ) حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔

ان تبدیلیوں اور تغیرات اور ان پر مرتب ہونے والے نتائج سے مزید آگاہی کے لیے ہم ایک علیحدہ فصل بعنوان ''تاریخ سے عبرت'' بیان کریں گے۔

☆☆☆☆☆

وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ ۝ جَنَّاتِ عَدْنٍ مُفَتَّحَةً لَهُمُ الْأَبْوَابُ ۝ (ص:۴۹-۵۰)

اور تقویٰ والوں کے لیے یقیناً اچھا ٹھکانا ہے۔ وہ دائمی جنتیں ہیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے۔

فاطمہ زہرا سلام علیہا کتنے دن بستر بیماری پر رہیں؟ صحیح معلوم نہیں ہے۔ باپ کی وفات کے بعد وہ کتنے دن زندہ رہیں؟ یہ بات واضح نہیں ہے۔ کم از کم مدت چالیس دن(۱) اور زیادہ سے زیادہ آٹھ ماہ بیان کی گئی ہے۔(۲) ان دو اقوال کے درمیان مختلف روایات جو دو ماہ(۳) سے لے کر پچھتر دن(۴) تین ماہ(۵) اور چھ ماہ(۶) کا عرصہ بتاتی ہیں۔

اس اختلاف اور مختلف قسم کی روایات کی وجہ کیا ہے؟ اس سے پہلے ہم نے لکھا ہے کہ اس دور میں واقعات کی تاریخیں ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل ہوئی تھیں اور اس بات کا کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ سب نقل کرنے والے غلطی اور اشتباہ سے مبرا تھے۔ یہ صرف اس صورت میں ہے جب دیگر عوامل کارفرما نہ ہوں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس پر آشوب دور میں ابھی مسلمانوں میں سیاسی گروہ بندی اپنی قوت کے ساتھ باقی تھی، دوسری جانب مسلمان داخلی طور پر مصروف جنگ تھے۔ ان حالات میں کسے فرصت تھی کہ وہ واقعات کی تاریخوں کو درست محفوظ کرنے کی طرف توجہ دیتا۔ فرض کریں کہ اس واقعہ میں ان دو عوامل میں سے ایک بھی دخیل نہیں تھا تو اس میں کسی قسم کا شک نہیں ہے کہ وہ سیاسی لوگ اور گروہ جو اس کے بعد برسر اقتدار آئے، جہاں تک ان سے

---

(۱) بحار ص ۱۹۱ ج ۴۳۔ روضۃ الواعظین ص ۱۵۱۔ (۲) الاستیعاب ص ۷۴۹

(۳) بحار ص ۲۱۳ ج ۴۳۔ (۴) عوالم المعجزات بنقل مجلسی ص ۲۱۲۔

(۵) طبقات ج ۸ ص ۱۸۔ (۶) انساب الاشراف بلاذری ص ۴۰۲۔

بن پڑا انہوں نے واقعات کی تاریخوں میں گڑبڑ کی ہے۔

علامہ مجلسی نے **دلائل الامامه** سے نقل کیا ہے کہ اس بیماری کے دوران تین اصحاب میں سے دو آدمی حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے جناب فاطمہ زہرا(س) سے ملنے کی اجازت چاہی، لیکن انہوں نے اجازت نہیں دی۔ علیؑ نے کہا کہ میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ تمہاری ان سے ملاقات کراؤں گا۔ جناب فاطمہ (س) نے کہا: جب ایسا ہے تو یہ آپ کا گھر ہے جیسے آپ کی مرضی۔(۱) اگرچہ ابن سعد نے لکھا ہے کہ ابو بکر نے فاطمہ (س) سے اس قدر گفتگو کی کہ آخر انہیں راضی کرلیا۔(۲) لیکن ظاہراً اس ملاقات سے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوسکے۔ رسول کی بیٹی نے ان سے کہا: تم نے نہیں سنا ہے کہ میرے بابا رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ فاطمہ (س) میرا ٹکڑا ہے، جس نے اسے تکلیف پہنچائی، اس نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ایسا ہی ہے۔ فاطمہ (س) نے فرمایا: تم نے مجھے اذیت پہنچائی ہے اور میں تم سے ناراض ہوں۔(۳) یہ سن کر وہ گھر سے چلے گئے۔

امام بخاری نے کتاب صحیح میں بیان کیا ہے:

جب دختر رسولؐ نے خلیفہ سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا اور اس نے جواب دیا کہ پیغمبر سے سنا ہے کہ ہماری میراث نہیں ہوتی تو اس کے بعد فاطمہ زہرا (س) نے اس سے مرتے دم تک کوئی بات نہیں کی۔(۴)

اپنی زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے اسماء بنت عمیس، جو مہاجرین حبشہ میں سے تھیں اور ان کے قریبیوں میں سے تھیں کو بلا بھیجا۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ اسماء بنت عمیس پہلے حضرت جعفر بن ابی طالب کی زوجہ تھیں۔ جب وہ جنگ موتہ میں شہید ہوگئے تو انہوں نے ابو بکر بن قحافہ سے عقد کیا۔

جناب فاطمہ(س) نے اسماء سے کہا: مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ عورت کی میت پر کپڑا ڈالا جائے اور اس کے بدن کی جسامت اس کپڑے سے نظر آئے۔

اسماء نے کہا: میں نے حبشہ میں ایک چیز دیکھی تھی۔ وہ میں ابھی بنا کر آپ کو دکھاتی ہوں۔ اس کے بعد اس نے چند تازہ اور سبز شاخیں منگوائیں۔ شاخوں کو اس نے ٹیڑھا کیا اور ان پر کپڑا ڈال دیا۔

جناب فاطمہ(س) نے کہا: کیا بہترین چیز ہے۔ یہ عورت کے جنازے کو مرد کے جنازے سے جدا کرتی ہے۔ جب میں مر جاؤں تو مجھے آپ غسل دیں اور کسی کو میرے جنازے کے قریب نہ آنے

---

(۱) بحار ج ۴۳ ص ۱۷۰ بنقل از دلائل الامامہ نیز رجوع فرمایئے: علل الشرائع ج ۱ ص ۱۷۸

(۲) طبقات ص ۱۷ ج ۸۔ (۳) بحار ص ۱۷۱۔ (۴) صحیح بخاری ج ۵ ص ۱۱۷

دیں۔(۱)

زندگی کے آخری دن انہوں نے پانی منگوایا۔ اپنے جسم کو خوب اچھی طرح دھویا اور غسل کیا نیا لباس زیب تن کیا اور اپنے حجرے میں چلی گئیں۔ اپنی خادمہ سے کہا کہ ان کا بستر حجرے کے درمیان بچھا دے۔ اس کے بعد وہ بستر پر روبہ قبلہ ہو کر لیٹ گئیں۔ ہاتھوں کو اپنے رخساروں پر رکھا اور فرمایا میں اسی وقت مرنے والی ہوں۔(۲) علماء شیعہ کے بقول ان کے شوہر علیؑ نے انہیں غسل دیا۔ ابن سعد نے بھی اسی روایت کو اختیار کیا ہے۔(۳) لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ابن عبدالبر کہتا ہے کہ فاطمہ(س) نے اسماء بنت عمیس کو غسل دینے کی وصیت فرمائی تھی۔ گویا فاطمہ(س) کو غسل دینے میں اسماء نے حضرت علیؑ کا ہاتھ بٹایا تھا۔

ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے کہ جناب فاطمہ (س) نے اس دنیا سے آنکھیں بند کیں تو حضرت عائشہ نے ان کے حجرے میں آنا چاہا تو اسماء نے وصیت کے مطابق انہیں داخل نہ ہونے دیا۔ اس نے اپنے باپ سے شکایت کی: یہ **خثعمیہ**(۴) عورت میرے اور فاطمہ(س) کے درمیان حائل ہو گئی ہے اور مجھے ان کی میت پر نہیں جانے دیا اور مزید یہ کہ اس کے لئے اس نے حجلہ عروسی کی طرح حجرہ سجایا ہے۔

ابو بکر جناب فاطمہ(س) کے حجرے کے دروازے پر آئے اور کہا: اسماء تم کیوں زوجات نبیؐ کو بنت نبیؐ کی میت پر آنے سے روک رہی ہو؟ اور تم نے اس کے لیے حجلہ کیوں بنایا ہے؟

اسماء نے جواب دیا: فاطمہ (س) نے مجھے وصیت کی تھی کہ کوئی بھی ان کے جنازے پر نہ آئے اور جو چیز میں نے ان کے تابوت کے لیے بنائی ہے، جب وہ زندہ تھیں تو میں نے بنا کر انہیں دکھائی تھی تو انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں یہ چیز ان کے جنازے کے لیے بناؤں۔

ابو بکر نے کہا: اگر ایسا ہے تو جیسے تمہیں کہا گیا ہے، ویسے ہی عمل کرو۔(۵)

ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلی خاتون جس کے تابوت پر ایسا پردہ بنایا گیا وہ رسول خداؐ کی بیٹی فاطمہ زھراء(س) تھیں۔ اس کے بعد اسی طرح کا پردہ زینب بنت جحش (زوجہ رسولؐ) کے تابوت کے گرد بنایا گیا۔

---

(۱) استیعاب ص ۷۵۱۔ طبقات ابن سعد ج۸ ص ۱۸۔ انساب الاشراف ص ۴۰۵ اور بحار ج ۴۳ ص ۱۸۹۔

(۲) بحار ج ۴۳ ص ۱۷۲ بنقل از امالی شیخ طوسی۔ انساب الاشراف ص ۴۰۲ اور طبقات ج ۸ ص ۱۷۔ ۱۸

(۳) طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۸

(۴) خثعم کا تعلق جنوبی عربوں سے تھا۔ یہ وہ علامت تھی جو عدنانی (جس میں قریش بھی شامل ہیں) قحطانیوں کی کرتے تھے۔

(۵) استیعاب ص ۷۵۱۔ جیسا کہ ہم نے لکھا ہے اس وقت اسماء حضرت ابو بکر کی زوجہ تھیں۔

الَّذِينَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوآ اِنَّآ لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○ (البقرہ:۱۵۶)

جو مصیبت میں مبتلا ہونے کی صورت میں کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔

شیعہ سیرت نگاروں اور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول خداؐ کی بیٹی کو رات کے وقت دفن کیا گیا۔

ابن سعد نے بھی اپنی روایات میں جو اس نے ابن شہاب، عروہ، عائشہ، زہری اور دوسرے ذرائع سے نقل کی ہیں، کہا ہے کہ فاطمہ زہرا(س) کو رات کی تاریکی میں دفن کیا گیا اور علی علیہ السلام نے انہیں سپرد خاک کیا۔(۱)

بلاذری نے بھی اپنی دو روایتوں میں اسی کو بیان کیا ہے۔(۲) نیز امام بخاری لکھتے ہیں:

ان کے شوہر نے انہیں رات کو سپرد خاک کیا اور ابو بکر کو ان کے جنازے پر آنے کی اجازت نہ دی۔(۳)

یعقوب کلینی جو شیعہ علماء اور محدثین کے بزرگان میں سے ہیں، چوتھی ہجری کے آغاز میں فوت ہوئے۔ انہوں نے اپنی کتاب تیسری صدی ہجری کے دوسرے نصف حصے میں لکھی ہے۔ ان کی کتاب کو شیعہ متون میں قدیم ترین سند شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

جب فاطمہ زہرا(س) کی رحلت ہوئی تو حضرت علیؑ نے خفیہ طور پر انہیں دفن کیا اور ان کی قبر کا نشان مٹادیا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ کے روضے کی طرف رخ کر کے کہا:

---

(۱) طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۸۔۱۹

(۲) انساب الاشراف ص ۴۰۵

(۳) صحیح بخاری ج ۵ ص ۱۷۷۔ بحار ص ۱۸۳

اَلسَّلامُ عَلَيْکَ يا رَسُولَ اللّٰهِ عنّی. وَالسَّلامُ عَلَيْکَ عَنْ ابْنَتِکَ وَزائِرَتِکَ وَالبائِتَةِ فِی الثَّرىٰ بِبُقْعَتِکَ وَالْمُخْتارِ اللّٰهِ لَها سُرْعَةَ اللِّحاقِ بِکَ. قَلَّ يا رَسُولَ اللّٰهِ عَنْ صَفِيَّتِکَ صَبْرِی وَ عَفا عَنْ سَيِّدَةِ نِساءِ الْعالَمِينَ تَجَلُّدِی. اِلاّ اَنَّ فِی التَّأَسّی لِی بِسُنَّتِکَ فِی فُرْقَتِکَ مَوْضِعُ تَعَزٍ فَلَقَدْ وَ سَّدْتُکَ فِی مَلْحُودَةِ قَبْرِکَ وَفاضَتْ نَفْسُکَ بَيْنَ نَحْرِی وَصَدْرِی. بَلىٰ وَفِی كِتابِ اللّٰهِ (لِی) اَنْعَمُ الْقَبُولِ. اِنّا لِلّٰهِ وَاِنّا اِلَيْهِ راجِعُونَ. قَدِ اسْتُرْجِعَتِ الْوَدِيعَةُ. وَاُخِذَتِ الرَّهِينَةُ وَاخْتُلِسَتِ الزَّهْراءِ فَما أَقْبَحَ الْخَضْراء وَالْغَبراء. اَمّا حُزْنِی فَسَرْمَدٌ

یارسول اللہؐ میری اور اپنی بیٹی کی طرف سے، جو ابھی آپؐ کے پاس آئی ہیں، آپ کے نزدیک منوں مٹی تلے سوئی ہیں، آپؐ پر درود وسلام ہو۔ اللہ کی مرضی یہی تھی کہ وہ سب سے پہلے آپؐ سے ملحق ہوجائیں۔ ان کے جانے کے بعد میرا صبر تمام ہو گیا، میری ہمت جواب دے گئی، لیکن جس طرح آپؐ کی جدائی پر میں نے صبر کیا، اسی طرح آپؐ کی بیٹی کی موت پر بھی صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ مصیبت پر صبر کرنا سنت ہے۔ اے رسول خداؐ! آپؐ نے اپنی جان میرے سینے پر جان آفرین کے سپرد کی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے آپ کو دفن کیا۔ قرآن نے خبر دی کہ زندگی کا آخری انجام خدا کی طرف بازگشت ہے۔ اب آپؐ کی امانت آپؐ کے پاس پہنچ گئی ہے۔ زہرا(س) مجھ سے جدا ہو گئیں اور آپؐ کے پاس محو آرام ہیں۔ یارسول اللہؐ! ان کے جانے کے بعد میری دنیا اندھیر ہو چکی ہے اور میرا دل غم سے بھرا ہوا ہے۔ یہ غم مجھ سے بھلایا نہ جائے گا۔

وَاَمّا لَيْلِی فَمُسَهَّدٌ. وَهَمٌّ لا يَبْرَحُ قَلْبِی اَوْ يَخْتارَ اللّٰهُ لِی دارَکَ الَّتِی اَنْتَ فِيها مُقِيمٌ. كَمَدٌ مُقَيِّحٌ وَهَمٌّ مُهَيِّجٌ سَرْعانَ ما فُرِّقَ بَيْنَنا وَاِلَى اللّٰهِ اَشْكُو وَسَتُنَبِّئُکَ ابْنَتُکَ بِتَظافُرِ اُمَّتِکَ عَلىٰ هَضْمِها. فَاَحْفِها السُّؤالَ. وَاسْتَخْبِرْها الْحالَ. فَكَمْ مِنْ غَلِيلٍ مُعْتَلِجٍ بِصَدْرِها لَمْ تَجِدْ اِلىٰ بَثِّهِ سَبِيلاً. وَسَتَقُولُ وَيَحْكُمُ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحاكِمِينَ.

میری نیند اڑ چکی ہے اور دل اس غم کی آگ میں کباب رہے گا۔ یہاں تک کہ خدا مجھے بھی آپؐ کے پاس بلالے گا۔ زہرا(س) کی موت بجلی بن کر مجھ پر گری۔ یہ ایسی چوٹ ہے جس نے میرے دل کو چکنا چور کردیا۔ جس نے مجھے غم کا دائمی روگ لگا دیا۔ اس نے کتنی جلدی ہمیں پریشانیوں اور مشکلات میں تنہا چھوڑ دیا۔ میں اپنی شکایت خدا کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں اور آپؐ کی بیٹی آپؐ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ آپؐ کو بتائیں گی کہ امت نے آپؐ کے بعد ان پر کیا کیا ستم ڈھائے اور کیا کیا ظلم توڑے۔ جو کچھ پوچھنا ہے ان سے پوچھیں اور جو کچھ کہنا ہے ان سے کہیں، تا کہ ان کے غم کا بوجھ ہلکا ہو اور جو خون جگر انہوں نے پیا ہے وہ باہر آئے اور انہیں سکون میسر آئے۔ خدا ان کے اور ظالموں کے درمیان فیصلہ کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

سَلامُ مُوَدِّعٍ لا قالٍ وَلا سَئِمٍ. فَاِنْ اَنْصَرِفْ فَلا عَنْ مَلالَةٍ. وَ اِنْ اُقِمْ فَلا عَنْ سُوءِ ظَنٍّ بِما وَعَدَ اللّٰهُ الصّابِرِينَ. وَاهاً وَاهاً وَالصَّبْرُ اَيْمَنُ وَاَجْمَلُ وَلَوْلا غَلَبَةُ الْمُسْتَوْلِينَ لَجَعَلْتُ الْمُقامَ وَاللَّبْثَ

آپؐ پر جو ہدیۂ سلام بھیج رہا ہوں یہ سلام عقیدت ہے نہ کہ رنج و ملال کا۔ یہ سلام شوق ہے نہ کہ سستی اور کم ہمتی کا۔ اگر یہاں سے چلا جاؤں تو رنج و ملال اور تھکاوٹ کے سبب نہیں اور اگر رہوں تو وعدہ خدا پر بدگمان نہیں ہوں۔ خدا نے چونکہ صابروں سے وعدہ کیا ہے، لہذا میں اس کے اجر وثواب کا انتظار کروں گا۔ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے اور صبر کا پھل میٹھا

لِزاماً مَعْکُوفاً
وَلَاَعْوَلْتُ اِعْوالَ الثُّکْلٰی عَلٰی جَلِیلِ الرَّزِیَّةِ. فَبِعَیْنِ اللّٰهِ تُدْفَنُ ابْنَتُکَ سِرّاً وَتُهْضَمُ حَقُّهٰا وَتُمْنَعُ اِرْثُهٰا. وَلَمْ یَتَبٰاعَدِ الْعَهْدُ وَلَمْ یُخْلَقْ مِنْکَ الذِّکْرُ. وَاِلَی اللّٰهِ یٰا رَسُولَ اللّٰهِ الْمُشْتَکٰی وَفِیکَ یٰا رَسُولَ اللّٰهِ اَحْسَنُ الْعَزٰاءِ. صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْکَ وَعَلَیْهٰا السَّلاٰمُ وَالرِّضْوٰانُ

(اصول کافی ج ۱ ص ۴۵۸، ۴۵۹)

ہے۔ اگر مجھے ظالموں کی چیرہ دستی کا ڈر نہ ہوتا تو ہمیشہ آپؐ کی قبر کے پاس ہوتا اور اس بھاری مصیبت پر، جوان بیٹے کی لاش پر بوڑھی ماں کی طرح آنسوؤں کے دریا بہاتا۔ خدا گواہ ہے کہ آپؐ کی بیٹی کو بطور مخفی لحد میں اتارا ہے۔ ابھی تو آپؐ کو رحلت فرمائے چند دن نہ گزرے تھے۔ ابھی تو آپؐ کا نام مبارک لوگوں کی زبان پر تھا کہ آپ کی بیٹی کا حق غصب کیا گیا اور ان کے ترکہ کو ہڑپ کرلیا گیا۔ میں اپنا دردِ دل آپؐ سے بیان کرتا ہوں اور اپنا حالِ دل آپؐ کو سناتا ہوں اور آپؐ کی یاد میں دل کو خوش رکھتا ہوں۔ آپؐ پر خدا کا درود و سلام ہو اور فاطمہ (س) پر درود و خوشنودی۔

اس مشہور روایت کے مقابلے میں ابن سعد ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے جناب فاطمہ زہرا(س) کے جنازے پر نماز پڑھائی اور چار تکبیریں کہیں۔(۱) ظاہر ہے کہ یہ اور اس طرح کی ایک دو اور روایتیں اس مشہور روایت کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ بعید نہیں کہ انہیں وقتی مصلحتوں کے پیش نظر جعل کیا گیا ہو۔

سیدہ زہرا (س) کی موت نے علی علیہ السلام کو سخت رنجیدہ خاطر کردیا۔ اس غم کا کچھ مشاہدہ ہم نے امیر المومنینؑ کے کلام سے کر لیا جو انہوں نے ان کی قبر کے نزدیک کھڑے ہو کر رسول خداؐ سے کیاہے۔ قدیم ترین کتب میں درج ذیل دو اشعار کی نسبت بھی ان کی طرف دی گئی ہے جو ان کی اندرونی غمزدہ کیفیت کی عکاسی کررہے ہیں۔ البتہ بعد والے ماخذ اور منابع میں ان اشعار کی تعداد زیادہ ہے۔ جیسا کہ امیر المومنینؑ سے منسوب دیوان میں ان کی تعداد انیس ہے۔(۱)

زبیر بن بکار اپنی کتاب الاخبار الموفقیات جسے اس نے تیسری صدی کے دوسرے نصف حصے میں تحریر کیاہے اور اس کا شمار قدیمی منابع میں ہوتا ہے، یوں رقمطراز ہے:

> مدائنی نے کہا ہے کہ جب امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ جناب فاطمہ (س) کی تدفین سے فارغ ہوئے تو ان کی قبر پر کھڑے ہو کر دو اشعار پڑھے:

لِکُلِّ اجْتِمٰاعٍ مِنْ خَلِیلَیْنِ فُرْقَةٌ　　وَکُلُّ الَّذِی دُونَ الْمَمٰاتِ قَلِیلٌ
وَاِنَّ افْتِقٰادِی وٰاحِداً بَعْدَ وٰاحِدٍ　　دَلِیلٌ عَلٰی اَنْ لاٰ یَدُومُ خَلِیلٌ

☆ جب کبھی دو دوست جمع ہوں آخر کار انہیں جدا ہونا ہے اور موت کے علاوہ ہر چیز

---

(۱) طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۹

چھوٹی ہے۔

☆ میرے دوست یکے بعد دیگرے مجھ سے جدا ہو رہے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی دوست ہمیشہ کے لیے باقی نہیں رہ سکتا۔

یہ دو اشعار بعض مصادر میں یوں بیان ہوئے ہیں:

لِکُلِّ اجْتِمَاعٍ مِنْ خَلِیلَیْنِ فُرْقَةٌ   وَکُلُّ الَّذِی دُونَ الْفِرَاقِ قَلِیلٌ
وَإِنَّ افْتِقَادِی فَاطِماً بَعْدَ اَحْمد   دَلِیلٌ عَلٰی اَنْ لَا یَدُومُ خَلِیل

بحارالانوار (طہران) کی آخری اشاعت کے فاضل مصحح نے اس کی جلد ۴۳ کے صفحہ ۱۸۷ پر حاشیے میں ایک عبارت درج کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

بعض نسخوں میں وان افتقادی واحداً بعدواحد کا مصرعہ آیا ہے اور یہ درست ہے۔ کیونکہ علیؑ نے ان دو شعروں کے ذریعے تمثیل پیش کی ہے نہ کہ انشاء کیا ہے۔ لیکن زبیر بن بکار کی عبارت یوں ہے: وانشا یقولُ۔ اس کے علاوہ یہ دو بیت، ان سے منسوب دیوان میں بھی موجود ہیں جس کا ذکر گزر چکا ہے۔

علامہ مجلسی نے لکھا ہے: روایت کی گئی ہے کہ ہاتف نے ان کے شعر کا جواب دیا ہے۔ اس کے علامہ نے چار ابیات لکھے ہیں۔(۱)

☆☆☆☆☆

---

(۱) بحار ج ۴۳ ص ۱۸۴

وَلِاَیِّ الْاُمُورِ تُدْفَنُ لَیْلاً بِضْعَۃُ الْمُصْطَفٰی وَ یُخْفٰی ثَرَاھَا

محمد مصطفیٰ (ص) کے جگر کے ٹکڑے کو کن اسباب کی وجہ سے رات کے وقت دفن کیا گیا اور اس کی قبر کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔

انتہائی افسوس کی بات ہے کہ دختر رسولؐ کی قبر بھی نامعلوم ہے۔ جو کچھ بھی ان کی وفات کے بارے میں لکھا گیا اور جو کوشش ان کی وفات کی خبر مخفی رکھنے کے لئے کی گئی، اس کے پیش نظر معلوم ہے کہ قبر کے بارے میں اہل بیت پریشان تھے۔ یہ پریشانی کس لئے تھی؟ صحیح طور پر کچھ نہیں معلوم۔ اس کا ایک پہلو ممکن ہے جناب زہرا(س) کی وصیت کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ جن سے وہ ناراض تھیں وہ ان کے نماز جنازہ اور تدفین میں شریک ہوں، لیکن قبر کے نشانات کو کیوں مٹا دیا گیا؟ یا انہیں سپرد خاک کرنے کے بعد قبرستان بقیع یا ان کے گھر میں سات یا چالیس قبروں کی شکلیں کیوں بنائی گئیں؟ کیوں ان کے مزار کو مخفی رکھنے کے لیے اس قدر اہتمام کیا گیا؟ اگر سن چالیس ہجری کو فرزندان زہرا(س) نے اپنے باپ کی قبر کو لوگوں سے خفیہ رکھا تو اس کی وجہ دشمنوں کی طرف سے بے حرمتی کا ڈر تھا۔ لیکن حضور اکرمؐ کی رحلت کے چالیس دن یا زیادہ سے زیادہ آٹھ ماہ بعد مدینے کے حالات کو چالیس ہجری میں کوفہ کے حالات کو ایک طرح اور یکساں قرار نہیں دیا جا سکتا۔

وہ لوگ جو سیاسی مسائل اور جاہ و منصب کے حصول کی خاطر علیؑ سے ستیزہ کار تھے، وہ لوگ نہ تھے جو گیارہ ہجری کو مدینے میں موجود تھے۔ مدینے میں رہنے والے لوگ علی علیہ السلام کو فاطمہ زہرا(س) سے الگ دیکھتے تھے۔ ظاہری طور پر ہی سہی، وہ رسول خداؐ کی بیٹی کا احترام کرتے تھے اور مسلم ہے وہ قبر کے ساتھ کوئی گستاخی نہ کرتے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ان کے مزار

سے لاعلمی کا موجب راویوں کی فراموشی یا زمانے کا گزرنا ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ کے دو صحابیوں کی قبریں آپؐ کے روضے کے ساتھ مشخص اور معین ہیں۔ اسی طرح فاطمہ زہرا(س) کے بیٹے جو جنت البقیع میں محو آرام ہیں کے مزارات بھی تقریباً مشخص کیے جاسکتے ہیں۔ پس جناب زہرا(س) کا مزار پوشیدہ رکھنے کا سبب کوئی اور امر ہے۔ اس کا سبب وہی ہے جس کی طرف گزشتہ فصل میں اجمالی طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا موجب وہی ہے جسے انہوں نے خود گفتگو میں بیان فرمایا ہے۔ شاید یہ ان کی آخری گفتگو تھی جو ان کی زبان سے جاری ہوئی۔ وہی باتیں جو انہوں نے عیادت کے لیے آنے والی خواتین سے کہی تھیں: ''مجھے تمہاری دنیا سے نفرت ہو گئی ہے اور تمہارے مردوں سے بیزار ہوں۔'' ان کی خواہش تھی کہ ان ناقدر اور حق ناشناس لوگوں کی نظروں سے اوجھل دفن ہوں ۔ حتیٰ ان کی قبر کے نشان پر بھی ان لوگوں کی نگاہیں نہ پڑیں۔

ابن شہر آشوب نے ذکر کیا ہے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے حضرت علیؑ پر اعتراض کیا اور انہیں سرزنش کی کہ انہوں نے دختر رسولؐ کے جنازے میں انہیں شرکت کی کیوں اجازت نہیں دی۔ انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ فاطمہ (س) نے یونہی وصیت کی تھی اور ان دونوں نے یہ بات مان لی۔(۱) البتہ مرحوم کلینی نے احمد بن ابی نصر کی روایت نقل کی ہے اور اس نے امام رضا(ع) سے روایت کی ہے۔ اس میں بیان ہے کہ امام علیؑ سے احمد نے جناب فاطمہ (س) کے محل دفن کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا:

> انہیں گھر میں سپرد خاک کیا گیا تھا اور جب بنی امیہ نے مسجد نبوی میں توسیع کی تو یہ قبر مسجد نبوی کے اندر آ گئی۔(۲)

ابن شہر آشوب نے شیخ طوسی کا قول نقل کیا ہے:

> جو بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں گھر کے اندر یا روضہ رسولؐ میں دفن کیا گیا۔(۳)

اس روایت کے بر خلاف ابن سعد جس کا تیسری صدی کے آغاز میں انتقال ہوا، عبداللہ بن حسن سے روایت کرتے ہیں:

> میں نے مغیرہ بن عبدالرحمان بن حارث بن ہشام کو گرم دن میں دوپہر کے وقت بقیع میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا: ابو ہاشم

---

(۱) مناقب ابن شہر آشوب ج ۱ص ۵۰۴

(۲) اصول کافی ج ۱ص ۴۶۱

(۳) مناقب ابن شہر آشوب ج ۳ ص ۳۶۵

اس وقت کیوں یہاں کھڑے ہو؟ اس نے جواب دیا: تیرے انتظار میں تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ فاطمہ زہرا(س) کو اس گھر میں (جناب عقیل کا گھر) جو جحشیین کے گھر کے ساتھ ہے، سپرد خاک کیا گیا۔ میں تجھ سے تقاضا کرتا ہوں کہ اس گھر کو خریدو اور مجھے یہاں دفن کرنا۔ میں نے جواب دیا: خدا کی قسم یہ کام ضرور کروں گا۔

لیکن جناب عقیل کے بیٹوں نے اس گھر کو فروخت نہ کیا۔ عبداللہ بن جعفر نے کہا کسی کو کوئی شک نہیں ہے کہ جناب فاطمہ (س) کی قبر یہاں پر ہے۔(۱)

اگر احمد بن ابی نصر کی روایت کے خلاف قرینہ موجود نہ ہوتا تو قابل قبول تھی لیکن علماء شیعہ نے ایسی روایات نقل کی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ جناب زہرا(س) کو جنت البقیع میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہی روایات میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ دختر رسولؐ کی قبر پوشیدہ رکھنے کے لیے سات نقلی قبریں(۲) اور ایک روایت کے مطابق چالیس نقلی قبریں بنائی گئیں۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ قبر مطہر گھر میں نہیں تھی۔ کیونکہ ان کے چھوٹے سے گھر میں اتنی ساری قبریں بنانے کی جگہ کہاں تھی۔ نیز بحارالانوار کی ایک روایت میں آیا ہے کہ جس رات بی بی نے انتقال کیا اسی کی صبح جب مسلمان بقیع میں آئے تو انہوں نے تازہ بنائی گئی چالیس قبریں دیکھیں۔(۳)

علامہ مجلسی نے دلائل الامامہ سے اور انہوں نے اپنے ذرائع سے امام صادق (ع) سے ایک روایت نقل کی ہے کہ اس دن صبح (بعض) لوگوں نے چاہا کہ جناب زہرا(س) کا جنازہ قبر سے نکال کر اس پر نماز پڑھی جائے۔ لیکن علیؑ کی طرف سے سخت مخالفت اور شدید دھمکی کے بعد انہوں نے اس کام سے صرف نظر کر لیا۔(۴)

بہر حال حضرت زہرا(س) کی قبر کا مخفی ہونا چند افراد سے ان کی ناراضگی کا پتہ دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اس ذریعے سے اپنی ناراضگی آشکار کرنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆☆☆

---

(۱) طبقات ج ۸ ص ۲۰

(۲) بحار ص ۱۸۲

(۳) بحار ص ۱۷۱

(۴) ایضاً

برائے عبرتِ تاریخ

خدا کی قسم! اگر وہ مداخلت نہ کرتے اور علیؑ کو وہ فریضہ انجام دینے دیتے جو رسول خدا نے ان پر عائد کیا تھا تو وہ آہستہ آہستہ سب کو راہ راست پر لے آتے اور ہر ایک کو اس کا حق دے دیتے...۔

اگر وہ ایسا کرتے تو زمین و آسمان کی رحمتوں کے دروازے ان پر کھل جاتے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا...۔

جو انہیں نہیں کرنا چاہیے تھا وہ انہوں نے کر دکھایا۔ اب وہ انتظار کریں کہ کتنا خون خرابہ ہوگا اور کتنی جنگیں لڑی جائیں گی...۔

بستر بیماری پر جناب سیدہؑ کے خطبے سے ایک اقتباس

جس دن دختر رسولؐ نے بستر بیماری پر انصار کی عورتوں سے گلے شکوے پر مبنی مذکورہ گفتگو کی اس کے بعد چوتھائی صدی بھی نہ گزری تھی کہ عرب کی پر امن اور متحد سرزمین شورش زدہ اور جنگ و جدال میں تبدیل ہو گئی۔ اسلام سے پہلے کی مخالفتیں اور دشمنیاں جو بیس سال سے زیادہ مدت تک فراموش ہو گئی تھیں یاان کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھاوہ سب عود کر آئیں۔ قبیلہ پرستی اور نسل پرستی کا دور واپس آ گیا۔ دور جاہلیت کے امتیازات کو دوبارہ افتخار سمجھا جانے لگا۔ مسلمان دو گروھوں بلکہ چند گروہوں میں بٹ گئے اور انتشار نے دوبارہ اپنا قبیح چہرہ ظاہر کردیا۔ ایک بار پھر قحطانی اور عدنانی عرب ایک دوسرے کے مدمقابل آگئے اور ایک دوسرے پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ''ایام العرب'' (۱) کی یاد تازہ ہو گئی۔

غیر عرب لوگ جو رحمت کی امید یا نعمتوں کے حصول کے لیے مسلمان ہوئے تھے، جزیرۃ العرب کے علاوہ دیگر علاقوں سے عراق کے شہروں جیسے کوفہ، بصرہ یا شمالی علاقوں میں آ کر بس گئے تھے۔ ان میں ہر جماعت یا خاندان قبائلی عہد وپیان کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ جب وہ مطلوبہ اہداف نہ پاسکے یعنی جس چیز کی خاطر انہوں نے دامن اسلام میں پناہ لی تھی وہ انہیں نظر نہ آئی تو انہوں نے اس افراتفری اور کشمکش کی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گروہ بندی شروع کردی یا ان گروہوں کے ساتھ ہو گئے جہاں ان کے مفادات کی تکمیل ہوتی نظر آئی۔

اس کتاب میں کئی مرتبہ قحطانی اور عدنانی نام لیے گئے ہیں۔ ایک دو جگہوں پر مختصر طور پر ان کے بارے میں وضاحت بھی کی گئی ہے۔

تاریخ اسلام کا مطالعہ رکھنے والے افراد کے لیے ان دو الفاظ کا معنی اور مفہوم واضح ہے۔ لیکن ممکن ہے سب قارئین مصنف کا مقصود نہ سمجھ سکیں یا ان دو الفاظ کا زیر بحث موضوع سے ربط اور تعلق نہ جان سکیں۔ پس مناسب ہے کہ ان دو گروہوں کے بارے میں ذرا تفصیل سے بات کی

قبل از اسلام کی جنگیں جو جزیرۃ نمائے عرب میں مختلف قبیلوں کے درمیان پیش آتی تھیں۔ مختلف دنوں کے ناموں سے موسوم تھیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ مجمع الامثال میدانی لفظ یوم کے تحت۔

جائے۔

اگر آپ عرب کے نقشے پر نگاہ ڈالیں تو جزیرۃ العرب کے جنوبی حصے کے آخر میں ایک مثلث شکل کا علاقہ آپ دیکھیں گے۔ جس کا مشرقی ضلع بحیرہ عرب کا ساحل ہے۔ مغربی ضلع بحیرہ احمر پر مشتمل ہے اور جب آپ ظہران (مغرب میں) سے وادی حضر موت (مشرق میں) تک ایک خط کھینچیں گے تو اس مثلث کا تیسرا ضلع بن جائے گا۔ ان حدود کے اندر ایک علاقہ ہے جسے قدیم زمانے میں خوش بخت عرب یا یمن کہتے تھے۔ آج یہ علاقے شمالی یمن اور جنوبی یمن کے ممالک پر مشتمل ہیں۔

ظہور اسلام سے صدیوں پہلے اپنے مناسب جغرافیائی حالات اور موسمی بارشوں کی بہتات کی وجہ سے یہ علاقہ سرسبز و شاداب اور زرخیز تھا۔ اس کے باشندے کھیتی باڑی اور زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اس علاقے کی سب سے اہم برآمد (کُنْدُر) مشہور شاہراہ بُخُور سے ہوتی ہوئی بندر، صور، صیدا اور خلیج عقبہ کے راستے یورپ پہنچتی تھی۔ وہاں کے عبادت خانوں میں اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس ذریعے سے جنوبی عرب کے باشندوں کو خاطر خواہ آمدنی ہوتی تھی۔ طبیعی امر ہے کہ سرمایہ حیات (پانی) کی فراوانی، خوشگوار آب و ہوا اور انواع و اقسام کی فصلیں اور پیداوار کے لیے زمین کی آمادگی، لوگوں کے لیے کشش اور جاذبیت کا باعث ہیں، لوگوں کی کشش آبادی میں اضافے کا باعث بنتی ہے اور زیادہ آبادی، مکانات و تعمیرات اور گھریلو زندگی کی ضروریات کو ایجاد کرتی ہے۔ اسی سے ایک گھر، چھوٹا گاؤں، دیہات، قصبے اور چھوٹے بڑے شہر وجود میں آتے ہیں۔ اس قسم کی اجتماعی زندگی کا لازمہ رفاہ و آسائش، تہذیب و تمدن، دولت اور حکومت کا معرض وجود میں آنا ہے۔ جو اس قسم کی معاشرتی زندگی کے مظاہر ہیں۔

انہی مختلف عوامل کے نتیجے کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہزار سال قبل مسیح سے لے کر چوتھی صدی عیسوی تک علاقے میں معین، قتبان، سبا اور حمیر جیسی حکومتوں کی بنیادیں ڈالی گئیں۔ کبھی ان کی حکومتوں کا دائرہ کار اپنے سے دور دراز علاقوں تک پھیل گیا۔ اس لیے یہ بھی ایک فطری امر ہے کہ اس قسم کی مہذب زندگی گزارنے والے لوگ، صحرا نشین، خانہ بدوش عربوں کو غیر تہذیب یافتہ اور غیر متمدن سمجھیں گے یا انہیں کم اہمیت یا بالکل اہمیت نہیں دیں گے۔

جنوبی یا خوشحال عرب کے برعکس عرب کا شمالی علاقہ بے آب و گیاہ سلگتا ہوا صحرا ہے۔ اس کی سرزمین بنجر اور ریت کے وسیع سمندر پر مشتمل ہے۔ اس کی وادیاں ایک دوسرے سے کٹی ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ اس کے رہنے والے ہر وقت سفر میں ہیں اور زندگی کی بقاء کے لیے مسلسل حرکت میں نظر آتے ہیں۔

صحرائی بود و باش اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی صحرا نشین کو خود غرض، خود پسند، بے پرواہ بنا دیتی ہے۔ شہر اور شہری زندگی کے اصول و قوانین سے اسے بیزار کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ

وہ شہر سے بالکل متنفر ہو جاتا ہے اور اگر کبھی اسے مجبوراً شہر آنا پڑے اور ناچار شہری آداب کا اپنے آپ کو پابند بھی بنانا پڑے تو وہ شہریوں اور شہری زندگی کا مذاق اڑاتا ہے۔

ظہور اسلام سے تقریباً دو صدیاں پہلے جزیرۃ العرب کی معاشرتی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا۔ جنوبی علاقے میں آبپاشی کے لیے بنائے گئے پانی کے بندوں کی تباہی اور بیرونی حملہ آوروں کی وجہ سے اس علاقے کے لوگوں نے ایک ایک کرکے اپنے گھروں کو خیر آباد کہہ دیا۔ کچھ لوگوں نے شمال کا رخ کیا اور زندگی گزارنے کے لیے مناسب مقامات پر سکونت اختیار کر لی۔ ان ہجرت کرنے والوں میں سے ایک گروہ نے کاریزوں اور چشموں کی وجہ سے شہر یثرب کو رہائش کے لیے پسند کر لیا۔

صحرا نشینی کی زندگی میں بھی کچھ تبدیلیاں آئیں۔ بندر گاہوں اور تجارتی راستوں میں تبدیلیوں کی وجہ سے امن و اطمینان کے ساتھ مال تجارت لے جانے کے لئے تاجروں کو مجبوراً راستہ بتانے والے (گائیڈز) رکھنے پڑے۔ عرب کے بدوؤں نے تاجروں کی نوکریاں اختیار کر لیں اور مال تجارت کو ایک سے دوسری جگہ لے جانے کی ڈیوٹی انہیں دی گئی۔ اس کے نتیجے میں جن مقامات پر سامان اتارنا اور لادنا مناسب معلوم ہوا وہاں راستے میں ایسی جگہیں وجود میں آ گئیں۔ اس معاشرتی تبدیلی سے متاثر ہو کر چند عرب شیوخ نے بھی تجارت کا پیشہ اپنا لیا۔ وہ مقامات جو اس کام کے لیے نہایت موزوں تھے ان میں سے ایک شہر مکہ تھا جو بحیرہ احمر سے ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

جغرافیائی خصوصیات کے علاوہ مکہ کی مذہبی حیثیت بھی تھی۔ خانہ کعبہ میں ہر سال ایک مرتبہ زائرین کا اجتماع ہوتا تھا۔ یہ دو چیزیں صحرا نشینوں کے اس شہر کی طرف آنے کا باعث بنیں۔ اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ظہور اسلام سے سالہا سال پہلے مکے کی آبادی شمال کے عربوں پر مشتمل تھی۔ وہی خود غرض، سرکش غیر مہذب بالخصوص کھیتی باڑی کی باقاعدہ زندگی سے بیزار لوگ مکہ میں رہائش پذیر تھے۔ دونوں شمالی اور جنوبی علاقوں کے عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سمجھتے تھے اور طرفین کے پاس اپنے اپنے شجرہ نسب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو نسلیں اپنے اپنے جد امجد "عدنان" اور "قحطان" سے ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں۔

جب معاشرتی اور معاشی لحاظ سے یہ دو نسلیں ایک دوسرے کے مدمقابل قرار پائیں تو ایک دوسرے کے طرز حیات کی تحقیر کرنے لگیں۔ نسلی اعتبار سے بھی ہر ایک اپنے آپ کو حضرت اسماعیلؑ کا حقیقی وارث سمجھتا تھا اور دوسرے کو غاصب گردانتا تھا۔ اگرچہ ان میں ہر دو گروہ متعدد قبیلوں، خاندانوں اور طائفوں میں تقسیم ہو گئے، لیکن انہوں نے اپنی بنیاد کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا تھا۔

کبھی کبھار خود قحطانی یا عدنانی قبائل کی آپس میں لڑائیاں اور جنگیں ہوتی تھیں۔ وہ ایک

دوسرے پر حملے کرتے تھے۔ جونہی کوئی غیر قحطانی یا غیر عدنانی ان پر حملہ کردیتا، وہ چھوٹے قبائل اپنی دشمنیاں فراموش کردیتے اور حملہ آور دشمن کے خلاف متحد ہو جاتے تھے۔

مثلاً ممکن تھا کہ ھمدان اور قضاعه کئی سالوں سے آپس میں نبرد آزما ہوں، لیکن اچانک قبیلہ ربیعه ان دو میں سے کسی ایک پر حملہ کردے تو یہ دونوں آپس کی سالوں سے جاری جنگ کو ترک کردیں گے اور ایک دوسرے کے شانہ بشانہ ربیعه سے جنگ کریں گے۔ عربوں میں ضرب المثل ہے: "میں اپنے بھائی اور چچا زاد بھائی کے خلاف برسرپیکار ہوں، میں اور چچازاد بھائی غیروں سے برسرپیکار ہیں۔" (۱)

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ عدنانی یا شمالی علاقوں کے عرب اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہمیشہ سفر اور حرکت میں رہتے تھے۔ ایسی گردش میں مصروف زندگی کے لیے لڑائی جھگڑا، لوٹ مار اور قتل وغارت ناگزیر چیزیں تھیں۔ ہم نے کہا کہ صحرا اپنے فرزند کو دو سبق سکھاتا ہے: اولاً جو مقابلے پر آئے اس سے جنگ کرو ثانیاً اپنے رشتہ داروں، عزیزواقارب اور پناہ حاصل کرنے والوں کا دفاع کرو۔ اسی عادت اور خصلت کو تعصب یا عصبیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم نے اسے "حمیت جاہلی" سے یاد کیا ہے۔ مثلاً: فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ (الفتح:۲۶)۔ اپنے دلوں میں تعصب رکھا تعصب بھی جاہلیت کا...

اس ماحول میں پرورش کے نتیجے میں صحرا نشین اپنے آپ کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد سمجھتا ہے۔ شہری اور دیہاتی زندگی کا مذاق اڑاتا ہے، محنت اور کام جسے شہری اور دیہاتی لوگ اپنا شعار سمجھتے ہیں وہ اسے ذلت اور پستی گردانتا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں شہر مکہ کی اہمیت کے پیش نظر جو لوگ وہاں آکر آباد ہوگئے تھے وہ اسی قبیل کے لوگ تھے۔ قصی بن کلاب نے شہر مکہ کی سرداری جنوبی مہاجرین (خزاعه) سے چھین لی اور اپنے قبیلے (قریش) کو شہر لے آیا۔ یہ قبیلہ مکہ سے باہر بیابانوں اور دروں میں رہتا تھا۔ اس طرح مکہ شہر کا انتظام عدنانیوں (شمالی علاقوں کے عربوں) کے ہاتھوں میں آگیا۔ انہوں نے تجارت کو اپنا پیشہ بنالیا یا تجارتی قافلوں کی پاسبانی کی ذمہ داری انجام دینے لگے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی پرانی خصلت نہ چھوڑی۔ خصوصاً قحطانی یعنی جنوبی علاقوں کے عربوں سے رقابت بلکہ ان سے دشمنی کو اسی شدومد سے باقی رکھا۔ پس قدرتی طور پر اہل مکہ اور اہل مدینہ کے درمیان خوشگوار تعلقات نہیں ہونے چاہیے تھے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اسلام کی دعوت کا آغاز پہلے مکہ میں ہوا۔ مکہ وہ شہر تھا جس کا کنٹرول اور انتظام عدنانی سرداروں اور شیوخ کے ہاتھوں میں تھا۔ رسول اکرمؐ نے تیرہ سال تک ان

---

(۱) انا وَ اخی عَلَی ابْنِ عَمِّی وَ انَا وَ ابْنُ عَمِّی عَلَی الْغَرِیبِ (تاریخ تمدن اسلامی۔ جرجی زیدان ص ۴ ص ۱۳)

لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دی، لیکن جو افراد آپؐ پر ایمان لے آئے وہ زیادہ تر مظلوم، محروم، غریب یا نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے تھے۔ مالدار، دولت مند، رئیس، طبقے اور سرداروں میں سے نہ صرف کوئی ایمان نہ لایا بلکہ جہاں تک ان سے بن پڑا انہوں نے آپؐ اور آپ کے پیرو کاروں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ اس کے بر عکس اسلام کا پیغام جونہی یثرب پہنچا تو اس شہر کے لوگ رسول خداؐ سے عہد و پیمان باندھنے لگے۔ انہوں نے آپؐ کو اپنے شہر آنے کی دعوت دی۔ اس تاریخ کے بعد اس شہر کے لوگوں کو انصار کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ اس شہر کو بعد میں "مدینۃ الرسولؐ" (رسولؐ کا شہر) کہا جانے لگا جو بعد میں مخفف ہو کر مدینہ رہ گیا۔ وہ لوگ جو مکہ میں مسلمان ہوئے اور یثرب آئے وہ مہاجرین کہلائے۔

البتہ ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مہاجرین کی اکثریت عدنانی تھی یا عدنانیوں کی حمایت میں تھی۔

جب مہاجرین یثرب میں رہائش پذیر ہو گئے تو رسول اللہؐ نے ہجرت کے ابتدائی مہینوں میں ان کے اور انصار کے درمیان اخوت و برادری رشتہ قائم کر دیا۔ اس طرح قحطانی اور عدنانی اسلامی بھائی بن گئے۔ اس پیمان اخوت کے نتیجے میں جو الفت ان کے درمیان پیدا ہوئی، اس نے ان دونوں کے درمیان ظاہری طور پر کینہ و عداوت کو ختم کر دیا۔ ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران: ۱۰۳)

تم لوگ خود پر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت کے زیر اثر بھائی بھائی بن گئے۔

لیکن حقیقت میں کیا یہ ممکن تھا کہ وہ عداوت اور دشمنی جو صدیوں سے نسل در نسل چلی آرہی تھی، دس سال کے مختصر عرصے میں بالکل ہی ختم ہو جائے؟ اگر چند افراد اپنے آپ کو مکمل طور پر اسلامی سانچے میں ڈھال لیں اور دور جاہلیت کی خصلت کو کلی طور پر جڑ سے اکھاڑ دیں تو کیا یہ امر سب کے لیے ممکن ہے کہ وہ بھی اسی طرح کے مسلمان بن جائیں؟ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کا جواب منفی ہے۔ تاریخ اسلام کے دقیق مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں باوجود اس کے کہ یہ دونوں گروہ براہ راست آپؐ کے زیر تربیت تھے اور آپؐ کے وعظ و نصیحت سنتے تھے، پھر بھی جب کبھی انہیں موقع ملتا وہ اپنے آباء واجداد پر فخر و مباہات اور مخالف حریف کی مذمت کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

کبھی کبھار تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ دو مختلف عدنانی قبیلوں کے افراد یا دو مختلف قحطانی قبائل کے

افراد آپس میں بحث و مباحثہ میں اسلام سے پہلے کی سنت پر عمل پیرا ہو کر ایک دوسرے کے نسب کی تحقیر و تذلیل کرتے تھے۔

لکھا ہے کہ ایک دن مغیرہ بن شعبہ اور عمرو بن عاص کے درمیان تکرار ہو گئی۔ مغیرہ نے عمرو کو گالی دی۔ عمرو نے کہا "ھصیص" کہاں ہے؟ (اپنے بزرگ کا نام لیا) اس کے بیٹے عبداللہ نے کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون" بابا جان، جاہلیت کی طرف چل پڑے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے اس عمل کی وجہ سے تیس غلام آزاد کیے۔(۱) فتح مکہ کے دن قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ لوگوں کے آگے چل رہے تھے۔ جب شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے با آواز بلند یہ نعرہ لگایا کہ آج خون بہایا جائے گا اور عزتیں پامال ہوں گی۔(۲) انہوں نے اپنے طور پر یہ گمان کیا کہ آج عدنانیوں کی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کریں اور انصار یعنی قبیلہ قحطانی کی عظمت کی ان پر دھونس جمائیں اور کئی سالوں کی دشمنی کا انتقام ان سے لیں۔ رسول اکرمؐ اس فخر و مباہات کو برداشت نہ کرسکے۔ آپؐ نے علیؑ سے فرمایا: جائیں اور سعد سے پرچم لے لیں اور انہیں ایسی غلط باتیں کرنے سے باز رکھیں آج مرحمت (ومعافی) کا دن ہے۔

اگر جنگ حنین کے بعد جو پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں جزیرۃ العرب کے اندر آخری لڑائی تھی، چند سال مزید رسول اللہؐ کا سایہ ان لوگوں پر قائم رہتا، اسلام قبول کرنے والے سب لوگ ان کی تربیت کی برکت سے کم و بیش بہرہ مند ہوجاتے، موجودہ نسل ان تعلیمات کو آئندہ نسل تک منتقل کردیتی تو یقینی طور پر اسلامی تعلیمات دینی اخوت و برادری اور عدالت اجتماعی کے زیر سایہ باہمی چپقلش، کینہ وعداوت اور قومی و نسلی عصبیت بالکل ختم ہوجاتی۔ ہر دو گروہ یہ باور کرلیتے کہ ہمیں وحدت کلمہ (توحید) کی پیشرفت کے لیے اکٹھے کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن افسوس کہ جب مختلف اور پراگندہ قبائل اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ قبائلی سرداری اور حکومت کا دور گزر گیا ہے، وہ ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑے ختم کردیں اور خدا کے نام پر مدینہ میں قائم ہونے والی حکومت کی اطاعت کریں، تو رسولؐ خدا اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔

ہم جانتے ہیں کہ حکومت اسلامی دین کی بنیاد پر معرض وجود میں آئی۔ حکومت کے سربراہ کا لوگوں نے انتخاب نہیں کیا تھا، بلکہ اللہ نے انہیں پیغمبرؐ بنا کر بھیجا تھا۔ جو کچھ آپؐ نے کہا وہ وحی آسمانی اور کلام الٰہی تھا (سوائے ان مواقع کے جہاں اصحاب سے آپؐ نے مشورہ کیا اور ان کی رائے قبول کی)۔ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد دور نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔ اگر مسلمانوں کی سربراہی اور

---

(۱) کنزالعمال ج ۱ ص ۳۶۲ طبع دوم

(۲) ابن ہشام ص ۶ ج ۴

حکومت کسی خاص نسل و نژاد کے ہاتھوں میں نہ دی جاتی، اگر برتری اور فضیلت کا معیار صرف قریشی ہونے کو نہ بنایا جاتا اور اگر رسول اللہ کی وصیت کو پس پشت نہ ڈالا جاتا تو یہ بات اطمینان اور یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انصار کو برتری جتانے کا موقع نہ ملتا اور آخر کار وہ صلح کرنے پر آمادہ نہ ہوتے اور یہ نہ کہتے کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر عدنانیوں میں سے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہاں پر دین کا عنصر (رسولؐ خدا سے منقول حدیث) تھا، جس نے انصار کو خاموش کرا دیا اور وہ اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو گئے اور وہ یہ کہ حضرت ابو بکر نے کہا کہ میں نے رسول اکرمؐ سے سنا ہے کہ سربراہ اور حکمران، قبیلہ قریش سے ہو۔

بہر حال یہ سب سے پہلا امتیاز تھا جو رسولؐ خدا کی رحلت کے بعد شمالی عربوں کو حاصل ہوا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اکرمؐ کے مختصر خطبے سے قریش کے تمام امتیاز اور برتری ختم ہو گئی تھی۔(۱)وہ دوسرے قبائل کے ساتھ ایک ہی صف میں آ گئے تھے۔ اب انہیں اپنے پاؤں مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے انصار یعنی قحطانیوں کو اپنا دست نگر بنا لیا۔ ان سب باتوں کے باوجود حضرت ابو بکر کی خلافت کے دوران چونکہ مسلمان ایک طرف مرتدوں کی سرکوبی میں مشغول تھے اور دوسری طرف نئی حکومت ابھی پوری طرح سنبھل نہیں پائی تھی اور پوری طرح براجمان نہیں ہوئی تھی یا کم از کم حکومتی عہدے اور منصب کسی امتیاز اور آمدنی کا باعث نہیں بنے تھے، ان دو گروہوں کے درمیان کشمکش واضح طور پر نظر نہیں آتی۔

حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں ان کے اہلکار بڑے بڑے شہروں کے حکمران بن بیٹھے۔ جنگی غنائم اور ایران اور روم کے جزیہ اور خراج کی وجہ سے حکومتی خزانے (بیت المال) کے اموال اور مال دولت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ خلیفہ کی سخت پالیسی کی وجہ سے ممکن حد تک ان دو گروہوں کے درمیان توازن قائم رہا۔ خلیفہ نے اگر ایک شہر کی حکومت عدنانیوں کے سپرد کی تو دوسرے شہر کا گورنر قحطانی کو بنایا۔ سقیفہ کے واقعہ کو ابھی چوتھائی صدی بھی نہیں گزری تھی کہ نہ صرف قریش اور عدنانی بڑے بڑے عہدوں اور وزارتوں پر قابض ہو گئے بلکہ بیت المال کی آمدنی کے سیلاب نے ان کے گھروں کا رخ کر لیا۔ ان کے گھر سکوں کے جھنکار سے گرجنے لگے۔ مروان بن حکم، معاویہ بن ابی سفیان، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، عبد الرحمٰن بن عوف اور یعلی بن امیہ میں سے ہر ایک نے اس دور میں لاکھوں درہم و دینار جمع کر لیے تھے۔ قریش اور فرزندان امیہ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے حتی المقدور یہ کوشش کی کہ جنوبی عربوں کو بڑے بڑے عہدوں اور کام پر نہ رہنے دیا

---

(۱) قبل اس کے کہ رسول اکرمؐ مراسم حج کی تعلیم فرمائیں قریش نے اپنے لیے خاص امتیاز رکھ لیے تھے۔ چنانچہ وہ عرفات سے منیٰ کی طرف کوچ کرتے وقت دوسرے حاجیوں سے جدا ہو جاتے تھے وغیرہ۔ (ملاحظہ ہو: در راہ خانہ خدا۔ تالیف مؤلف کتاب ھذا)

جائے۔

تاریخ میں آیا ہے کہ بنی جفنہ کا ایک شخص عثمان کے پاس آیا اور کہا تمہارے خاندان میں کوئی بچہ نہیں ہے کہ اسے آپ حکمران بنائیں۔ یہ بوڑھا (ابو موسیٰ) کب تک بصرے پر حکومت کرتا رہے گا۔(۱) یہ اس وقت کی بات ہے جب شام میں معاویہ، کوفہ میں ولید بن عقبہ بن ابی معیط اور مصر میں عمرو بن العاص حکمران تھے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ تینوں مضری باالفاظ دیگر عرب عدنانی یا شمالی تھے ۔ صرف بصرے کا حکمران (ابو موسیٰ) قحطانیوں میں سے تھا۔ کوئی زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ بنی امیہ کا خاندان دوسرے قریشی خاندانوں سے آگے نکل گیا۔ یہ بات بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس خاندان نے کبھی بھی دل سے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ انہوں نے اسلام کو اس دن قبول کیا جب اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔

ایک خاندان میں حکومت کے منحصر ہونے کے نتیجے میں خوابیدہ کینے اور عداوتیں بیدار ہو گئیں ابتداء میں شورش کا آغاز سرحدوں سے ہوا۔ پھر شہروں میں بھی صورت حال کشیدہ ہو گئی۔ آخر کار اس نے مرکز خلافت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ اس کشمکش میں خلیفہ کی جان چلی گئی۔

اس دور کے اشعار ہمارے پاس موجود ہیں جو بنی امیہ کی اندرونی کیفیت کی نشاندہی کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ شاعر کے پیش نظر اگر کوئی چیز نہیں ہے تو وہ دین اسلام اور عدالت اجتماعی ہے۔ جس چیز کی طرف اس کی شدید توجہ ہے وہ خاندانی افتخارات، اور دوسرے قبائل پر اپنے قبیلے کی برتری اور فضیلت ہے۔

جس دن حضرت عثمان کو قتل کیا گیا، ماں کی طرف سے ان کے بھائی ولید بن عقبہ نے ان کے سوگ اور غم میں بنی ہاشم سے مخاطب ہو کر یوں کہا:

بَنِي هَاشِمٍ اِيه فَمَا كَانَ بَيْنَنَا وَسَيف ابْنِ أَرْوَى☆عِنْدَ كُمْ وَ خزائنه
بَنِي هَاشِمٍ رُدُّوا سِلاح ابْنِ اُخْتِكُم وَلَا تَنْهَبُوهُ لَا تَحِلُّ مَنَاهِبُه
بَنِي هَاشِمٍ كَيْفَ الْهَوادَةُ بَيْنَنَا وَعِنْدَ عَلِيّ دِرعُهُ وَنَجائبُه
لَعَمْرُکَ لاَ اَنسى إِبنَ اَرْوى وَقَتْلَهُ وَهَلْ يُنْسِئَنَّ اَلْماء مَاعَاشَ شَارِبُه ؟

☆ بنی ہاشم! ہم سے اور کیا چاہتے ہو؟ عثمان کی تلوار، مال و متاع اور اس کا خزانہ

---

(۱) انقلاب بزرگ تالیف طہ حسین ترجمہ مؤلف کتاب هذا ص ۱۲۰ ۔ ☆اروی حضرت عثمان کی والدہ کا نام ہے

تمہارے پاس ہے

☆ اے بنی ہاشم! اپنے بھانجے کا اسلحہ واپس کردو۔ اسے مال غنیمت نہ سمجھو۔ یہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے

☆ بنی ہاشم! ہم کس طرح تمہارے ساتھ نرم سلوک کر سکتے ہیں جبکہ عثمان کی زرہ اور گھوڑا علیؑ کے پاس ہے۔

☆ جس طرح کوئی ساری زندگی پانی پینے کو نہیں بھول سکتا اس طرح میں عثمان اور اس کے قتل کو ہرگز نہیں بھلاؤں گا۔

ان اشعار پر خوب غور کریں۔ کہنے والا خلیفہ حضرت عثمان کا بھائی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو خلیفہ کی طرف سے کوفہ کا حکمران تھا۔

جس دن آنحضرتؐ کی آنکھیں بند ہوئیں اس وقت سے لے کر ان اشعار کے کہنے تک پچیس سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی اصول کس طرح مدینہ (دعوت اسلام کی نشر واشاعت اور تبلیغ کا مرکز) میں اس بظاہر مسلمان کی زبان سے برباد ہو رہے ہیں۔

ان اشعار میں اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے کہ عثمان کیوں قتل ہوئے، ناحق قتل ہوئے یا صحیح طور پر؟ جس دن انہیں قتل کیا گیا سنت رسولؐ اور سیرت شیخین پر تھے یا اس سے عدول کر چکے تھے؟ ان میں یہ سوال بھی نہیں کیا گیا کہ حملہ آوروں نے کیوں اور کس لیے خلیفہ پر حملہ کیا اور انہیں قتل کیا؟ صرف اور صرف فرزندان امیہ کی فرزندان ہاشم کے ساتھ رقابت، عداوت اور بغض و کینہ کا اظہار ہے۔

اگر قتل عثمان میں بالواسطہ یا بلا واسطہ ہاشمیوں کا ہاتھ ہوتا تو پھر بھی ہم کہنے والے کو قصوروار نہ ٹھہراتے، لیکن وہ کھلم کھلا الزام تراشی کر رہا ہے کہ عثمان کا سب خزانہ اور ترکہ علیؑ کے گھر ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ جب لوگوں نے عثمان کے گھر کا محاصرہ کرلیا تو حضرت علیؑ نے ان کی حمایت کی اور اگر عثمان کے رشتہ داروں کے بقول علیؑ نے عثمان کی مدد نہیں کی تو کم از کم ان کے خلاف جنگ تو نہیں لڑے۔ ان کے مخالفین کی بھی مدد نہیں کی اور عثمان کے ترکے اور خزانے کو بھی نہیں لوٹا۔

پس بنی ہاشم سے بیزاری اور مخالفت کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ان میں سے مبعوث ہوئے؟ حضرت عثمان کے قتل کے بعد چونکہ مسلمانوں نے خاندان بنی ہاشم سے خلیفہ بنا لیا تھا۔ یہ انتخاب اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور وجہ تھی؟ اس بارے میں کیا ہم اس کے علاوہ کوئی اور تاویل کرسکتے ہیں کہ بعض قبائل کے افراد اور سرداروں نے

دوسرے قبائل سے بغض و کینے اور دشمنی و عداوت کو فراموش نہیں کیا تھا؟ بلکہ اسلام لانے کے بعد وقتی طور پر اس سے چشم پوشی کرلی۔ چونکہ نئی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے تھے اور جونہی انہیں موقع ملا وہ اپنی پرانی عادتوں کی طرف پلٹ گئے۔ یہ وہی امر تھا جس کے خطرات سے قرآن انہیں خبردار کررہا تھا:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاْنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْاً وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران: ۱۴۴)

اور محمد تو صرف رسول ہیں۔ ان سے پہلے دوسرے بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر (محمد) اپنی موت مر جائیں یا مار ڈالے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں (اپنے کفر کی طرف) پلٹ جاؤ گے اور جو الٹے پاؤں پھرے گا تو (سمجھ لو کہ) ہرگز خدا کا کچھ نہ بگاڑے گا اور عنقریب خدا شکر کرنے والوں کو اچھا بدلہ دے گا۔

حضرت عثمان کی خلافت کا آخری دور تھا کہ دوبارہ عدنانی اور قحطانی صفیں نئے سرے سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئیں۔ جس طرح قحطانی حضور اکرمؐ کو عدنانی شہر سے اپنے شہر لے گئے اسی طرح انہوں نے آپؐ کے چچازاد بھائی کو مدینہ سے کوفہ دعوت دی یا دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہیں کہ ان دنوں میں علیؑ علیحدگی پسندوں کی دعوت پر حجاز سے عراق آگئے۔ انہوں نے حضرت علیؑ سے مدد و نصرت کا وعدہ کیا اور ان کا ساتھ دیا۔ اس کے برعکس مضری یا عدنانی بصرہ میں اکٹھے ہوئے اور علیؑ اور ان کے لشکر سے جنگ کی۔

حضرت عثمان کے دور خلافت کے آخری پانچ سالہ اور معاویہ، اس کے بیٹے یزید اور یزید کے بیٹے کی حکومتوں کے بیس سالہ دور میں مضریوں سے جہاں تک ہو سکا انہوں نے یمنیوں سے سخت رویہ رکھا۔ یمنیوں نے بھی جب یہ دیکھا کہ اسلامی دور حکومت اختتام پذیر ہو گیا ہے اور دوبارہ نسلی اور قومی برتری کا دور شروع ہو گیا ہے تو انہوں نے ایسے گروہ کا دامن تھام لیا جو لوگوں کو حکم قرآن اور عدالت کی طرف بلاتا تھا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ صفین میں انصار، معاویہ اور شامیوں کو یہ کہتے تھے:

کل تنزیل قرآن کے حکم پر تمہارے ساتھ ہم نے جنگ کی اور آج تاویل قرآن کی خاطر تمہارے ساتھ نبرد آزما ہیں۔

یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے علیؑ کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے حسنؑ سے کہا تھا کہ اپنا ہاتھ آگے کریں تاکہ ہم کتاب الٰہی، سنت رسولؐ اور بدعت گزاروں سے جنگ کی خاطر آپ کی

بیعت کریں۔(۱) جیسا کہ انہوں نے حضرت علیؑ کے دوسرے بیٹے کو لکھا تھا کہ تیرا دشمن بیت المال دولت مندوں اور بد معاش افراد کے درمیان تقسیم کرتا ہے۔(۲)

سنہ ۶۱ ہجری میں جب عراقیوں نے انتہائی بزدلانہ طریقے سے حسین (ع) کو ان کے دیرینہ دشمن کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد ظاہری طور پر ایک بار مضریوں کی خواہشات پوری ہو گئیں اور وہ اپنے ہدف میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ابھی اس سانحہ کو چار سال بھی نہ گزرے تھے کہ مَرْجِ رَاھِط میں یمنیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ ہو گیا۔ اس لڑائی میں مضری (قیسی) ابن زبیر کی حکومت کے طرفدار تھے اور یمنی (جنہیں اس وقت کلبی کہا جاتا تھا) بنی امیہ کی حکومت کے حق میں تھے۔ آخر کار کلبیوں نے قیسیوں پر یا یمنیوں نے مضریوں پر فتح پائی اور مروان بن حکم خلیفہ بن گیا۔

عربی میں ایک ضرب المثل ہے "اَذَلُّ مِنْ قَیْسِی بِحِمْصٍ" حمص (شام کا ایک شہر) میں قیسی سے زیادہ ذلیل۔ قوی احتمال یہ ہے کہ یہ مثال اس دور کی ایجاد ہے جب کلبیوں نے سر اٹھایا۔ اس تاریخ کے بعد دو قبیلوں کے درمیان جنگ و جدال سے دین کا رنگ مکمل طور پر اتر گیا اور یہ جنگ شمال اور جنوب کے دو بڑے عرب گروہوں کے درمیان ذاتی بغض و عناد کی مکمل تصویر بن گئی۔

ان دونوں گروہوں نے جو جنگی اشعار کہے ہیں۔ ان سے دین و شریعت کی ذرا بھی بو نہیں آتی۔ جو کچھ ہے وہ آباء و اجداد پر فخر و مباہات اور اپنے قوم و قبیلے کی امتیازی خصوصیات کا بیان ہے۔

حیران کن بات تو یہ ہے کہ اس جنگ میں جسے زیادہ صدمہ پہنچا وہ ابن زبیر (خاندان ابو سفیان کا کٹر مخالف) کی خلافت کا حامی ضحاک بن قیس ہے۔ جس نے معاویہ کے پورے دور حکومت میں دل و جان سے اس کی خدمت کی۔ اسی شخص نے یزید کی خلافت کے لیے بلائے گئے جلسے میں اس بات کی پوری پوری نگرانی کی کہ کوئی بھی معاویہ کے خلاف رائے نہ دے اور معاویہ کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ کہے۔

اسی شخص نے یزید کو حوارین کے ذریعے سے دمشق بلوایا اور اسے تخت حکومت پر بٹھایا۔ لیکن یزید کے مرنے کے بعد اس کے ننھالی رشتہ دار، جو قبیلہ کلبی (جنوبی) سے تھے، یزید کے بیٹے خالد کی خلافت کی حمایت کرنے لگے۔ ان کا رویہ ضحاک (جو قبیلہ مضری سے تھا) پر سخت ناگوار گزرا۔ اس نے ان کی ضد میں آ کر یہ فیصلہ کیا کہ ایک مضری (عبداللہ بن زبیر) کو تخت پر بٹھایا جائے۔

تاریخ اسلام پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس تاریخ کے بعد صدیوں تک جہاں بھی شورش پیدا ہوئی اس کا سبب مذکورہ دو گروہ تھے یا کسی نہ کسی طرح ان کا شورش میں ہاتھ تھا۔

---

(۱) تحلیلی از تاریخ اسلام ج ۲ ص ۸

(۲) پس از پنجاہ سال ص ۱۱۴

مروان بن حکم سے لے کر مروان ثانی کے دور حکومت تک ہر خلیفہ یا حکمران نے اپنی مصلحت کے پیش نظر مضریوں کی طرفداری کی یا یمنیوں کی حمایت کی۔ البتہ ان میں سے اکثر نے مضریوں کی حمایت کی۔ اس واقعہ کو ملاحظہ کریں جو ایک تاریخی حقیقت سے زیادہ لطیفہ لگتا ہے۔ زیاد بن عبید حارثی کہتا ہے:

میں مروان بن محمد کے دور خلافت میں چند آدمیوں کے ساتھ اس سے ملاقات کرنے گیا۔ پہلے ہمیں مروانی پولیس کے سربراہ ابن ہبیرہ کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے ایک ایک مہمان کا حال پوچھا۔ ہر ایک نے مروان اور ابن ہبیرہ کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ اس کے بعد ابن ہبیرہ نے ان کے نسب کے بارے میں پوچھا۔ میں ایک طرف ہو گیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس بات چیت کا انجام بخیر نہیں ہو گا۔ میں دل ہی دل میں پر امید تھا کہ سب مہمان اپنی چرب زبانی اور طویل باتوں سے اسے تھکا دیں گے اور مسئلہ ختم ہو جائے گا اور میری نوبت ہی نہیں آئے گی، لیکن ایسا نہ ہوا۔ سب سے اس نے پوچھ لیا۔ اب میرے سوا کوئی باقی نہیں بچا تھا اس کے بعد اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا:

تمہارا تعلق کس قوم سے ہے؟

یمنی قوم سے۔

کس قبیلے سے؟ مذحج سے۔

اپنی بات کو مختصر کر۔

بنی حارث بن کعب سے۔

حارثی بھائی! لوگ کہتے ہیں یمنیوں کا باپ بندر تھا، تمہارا کیا خیال ہے؟

اس کا پتہ چلانا مشکل کام نہیں۔

ابن ہبیرہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: تیرے پاس کیا دلیل ہے؟

میں نے جواب دیا: تم بندر کی کنیت کو دیکھو اگر انہیں ابوالیمن کہا جاتا ہے تو یمنیوں کا باپ بندر ہے، لیکن اگر اس کی کنیت ابو قیس ہے تو پھر بندر دوسروں کا باپ ہے۔

ابن ہبیرہ اپنی باتوں پر شرمندہ ہوا۔(۱)

---

(۱) الصفوات النادرہ ص ۱۳۱۔ ۱۳۲ یاد رہے کہ بندر کی عربی میں کنیتوں میں سے ایک "ابو قیس" ہے۔

ان دو گروہوں کا پہلے قحطانی اور عدنانی نام تھا، لیکن بعد میں آپس کی پوری جنگی تاریخ میں ان کے نام مختلف رہے ہیں، جیسے: یمنی اور قیسی، مضری اور یمنی، قیسی اور کلبی، ازدی اور تمیمی۔ ان کا میدان جنگ خراسان سے لے کر خوزستان اور سیستان، یہاں سے لے کر مغربی ایران تک، عراق سے شام تک، حجاز سے مصر تک، تمام افریقہ، سیسیل اور رودس جزیروں سے لے کر جنوبی ہسپانیہ تک کا علاقہ تھا۔

اس وسیع و عریض سر زمین پر جہاں بھی دو فریقوں کے درمیان جنگ ہوئی، اس میں جنوبی اور شمالی عربوں کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

سن چالیس ہجری سے جب معاویہ نے اپنے آپ کو مسلمانوں کا خلیفہ کہلوانا شروع کیا۔ ۱۳۲ ہجری تک صرف عبدالملک بن مروان کے دور حکومت کو نسبتاً امن و سکون کا دور کہا جاسکتا ہے۔ وہ بھی اس لحاظ سے نہیں کہ اس وسیع و عریض مملکت اسلامی میں عدل وانصاف کا راج تھا بلکہ اس لحاظ سے کہ حجاج بن یوسف جیسے حاکموں نے جبر و استبداد سے لوگوں کے سانسوں کو ان کے سینوں میں محبوس کر دیا تھا۔ جو کوئی ابوسفیان کے سپوتوں یا ان کے گماشتوں کے خلاف کوئی بات کرتا اس کا سر اڑا دیا جاتا یا زندان میں ڈال دیا جاتا۔ مروانیوں کے دور حکمرانی کے آخری نصف حصے میں بابصیرت اور دور اندیش افراد نے دین میں یکے بعد دیگرے وجود میں آنے والی بدعتوں کا اصلی اور بنیادی سبب جان لیا اور وہ اس بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ رسول خداؐ کی رحلت کے بعد جب یہ کہا گیا کہ نبوت اور خلافت ایک خاندان میں جمع نہیں ہونی چاہیے تو وہ اس سے بے خبر تھے کہ خلافت و حکومت قبیلہ تیم و عدی سے نکل کر ابوسفیان اور مروان کے خاندان میں منتقل ہوجائے گی اور اسلام کے بدترین دشمن اسلامی حکومت پر قابض ہوجائیں گے۔ عبدالمالک کے دور حکومت کے اواخر میں آہستہ آہستہ یہ سوچ اور فکر زور پکڑنے لگی کہ اگر ابتدائی ایام میں حق کو صاحبان حق سے غصب نہ کیا جاتا تو امویوں کو یوں ان گستاخیوں کا موقع ہر گز نہ ملتا اور مسلمانوں کی حالت زار یہاں تک نہ پہنچتی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کی پیش گوئی فاطمہ زہرا(س) نے کی تھی کہ رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد مسند اقتدار اگر عادل شخص کے سپرد کی جاتی تو وہ سب کو عدل و انصاف کے چشمے سے سیراب کرتا۔

ہم دیکھتے ہیں اس دور میں مظلوم عوام نے دوبارہ علویوں کا دامن پکڑا اور ان کا ساتھ دیا اگرچہ ان کے قیام کے یکے بعد دیگرے وہ سرکوب کر دیئے گئے لیکن آخر کار سنت پیغمبرؐ کے عقیدت مند اور پیروکار اس نتیجے پر پہنچے کہ ان سب مشکلات، پریشانیوں اور مصیبتوں کا حل یہ ہے کہ حکومت بنی امیہ کے خاندان سے بنی ہاشم کے خاندان میں منتقل ہو اور ابوسفیان کے پوتوں کے بجائے علیؑ کے پوتے برسر اقتدار آئیں۔

ابھی پہلی صدی ہجری اختتام پذیر نہیں ہوئی تھی کہ پہلے دور دراز (مشرقی ایران) کے علاقوں

میں پھر مرکزی ایران اور آخر میں کوفہ و بصرہ میں خاندان پیغمبرؐ اور فرزندان فاطمہ (س) بنت رسولؐ کی حمایت کے نام پر مزاحمتی گروہ تشکیل دیئے گئے۔ حکومت سے ناراض افراد بھی ان مزاحمتی دستوں سے منسلک ہوگئے۔ پھر آہستہ آہستہ مفاد پرست اور اقتدار کے لالچی افراد بھی ان دستوں میں شامل ہوگئے۔ یہ وہ افراد تھے جو ہدف تک پہنچنے کے لیے ہر ذریعے اور وسیلے کو جائز سمجھتے تھے۔ ان کا نعرہ یہ تھا کہ اموی حکومت کو سرنگوں کیا جائے اور اس کی جگہ پر آل علیؑ کو بٹھایا جائے۔ جنہوں نے اس قتل و غارت، اذیت و آزار، قید وبند کی صعوبتوں پر سیاست کی اور فائدہ اٹھایا، وہ نہ تو فرزندان فاطمہ (س) تھے نہ اولاد علیؑ۔ ان حالات میں ایک موقع پرست، چالاک و عیار اور سازشیں تیار کرنے والا ماہر شخص میدان سیاست میں وارد ہوا اور الرضا من آل محمدؐ(۱) کی بجائے الرضا من آل عباس کی مسند خلافت پر براجمان ہو گیا۔ جس دن ابوالعباس سفاح نے حیرہ میں ایک جلسہ کیا جس میں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت شعراء نے آل ہاشم اور عباسی خاندان پر بنی امیہ کے مظالم کو گنوایا۔ اس کے بعد خراسان کے سپاہی" کافر کوبوں"،(۲) کے ساتھ امویوں کے سروں پر ٹوٹ پڑے اور ان کے بھیجے نکال دیئے۔ اس کے بعد امویوں کی نیم جان لاشوں پر قالین بچھائے گئے اور رسول خداؐ کا خلیفہ اور اس کے قریبی لوگ دستر خوان لگا کر کھانے میں مشغول ہوگئے۔ قالین کے نیچے سے ان نیم جان لاشوں کے کراہنے اور آہ وفریاد کی آوازیں آتی رہیں۔ خلیفہ کھانے میں مشغول رہا اور اس نے کہا کہ جو لذت آج کھانے میں تھی وہ زندگی بھر کسی کھانے میں نہیں پائی۔(۳) کچھ ہی عرصہ بعد اسلامی عدل و انصاف کے پیاسوں نے دیکھا کہ الرضا من آل محمد کے نام پر اقتدار حاصل کرنے والے الرضا من آل ابو سفیان سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ عباسی خاندان نے سب سے پہلے ان لوگوں کی خبر لی اور ان کا حساب چکایا جنہوں نے ان کے اقتدار کی راہیں ہموار کی تھیں۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ آل علیؑ کے خون کے پیاسے ہوگئے۔

علویوں کو یا تو تہہ تیغ کردیا گیا یا وہ زندانوں اور قید خانوں میں گل سڑ گئے یا پھر بیابانوں، پہاڑوں اور دیہاتوں میں جان کے خوف سے گمنامی کی زندگی گزارنے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رسول اللہؐ کے طرفداروں اور متوالوں نے اپنی دلی کیفیات اور غم و غصے

---

(۱) محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس پہلا عباسی امام شروع میں اپنے داعیوں سے کہتا تھا کہ کسی خاص شخص کا نام خلافت کے لیے نہ لو بلکہ لوگوں کو آل محمد کے رضا" الرضا من آل محمد " کی طرف بلاؤ۔ اس نے ان سے کہا ہوا تھا کہ عدنانی عربوں کو نیست و نابود کر دو اور قحطانیوں کو اپنے ساتھ رکھو۔

(۲) ایک قسم کا گرز جس کا یہ نام رکھا گیا تھا۔

(۳) اغانی ج ۴ ص ۳۴۶۔۳۴۷

کی حالت کو قصیدوں اور حکایتوں کے قالب میں بیان کیا۔ انہوں نے نہایت مؤثر اور دل خراش انداز اور مناسب ترین الفاظ میں ان چیزوں کو دوسروں تک پہنچایا۔ خفیہ مجالس میں رسول خداؐ کی بیٹی اور ان کی اولاد پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم پر نوحہ خوانی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد بازاروں میں اور کھلے عام یہ مجالس برپا ہوئیں۔ انہی سالوں میں ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ آل محمدؐ کی مظلومیت کا راز دختر رسولؐ زھراء اطہر(س) ہیں۔

یاقوت نے خالع (حسین بن محمد بن جعفر، چوتھی صدی کے مشہور شاعر) سے روایت کی ہے:

> میں سنہ ۳۴۶ ہجری میں بچہ تھا۔ میں نے اپنے باپ کے ہمراہ بازار وراقان اور زرگران کے درمیان واقع مسجد میں منعقد ایک غمگین مجلس میں شرکت کی۔ مسجد لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی کہ اچانک ایک شخص خاک آلودہ عصا ہاتھ میں لیے پھٹے پرانے لباس میں اپنا غذا اور پانی کا کٹورہ ساتھ لیے ظاہر ہوا۔ اس نے بلند آواز کے ساتھ حاضرین کو سلام کیا اور کہا: میں زہرا(س) کا بھیجا ہوا ہوں۔ حاضرین نے اسے خوش آمدید کہا اور اسے مجلس میں صدارت والی جگہ پر بٹھادیا۔ اس کے بعد اس نے پوچھا: کیا آپ نوحہ خواں احمد مزوق(۱) کے بارے میں مجھے بتا سکتے ہیں؟ یہیں موجود ہیں (مجمع میں سے آواز آئی)۔ میں نے جناب سیدہ کو خواب میں دیکھا ہے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے بغداد جاؤ اور احمد سے کہو کہ ناشی کے شعر کے ذریعے میرے بیٹے پر نوحہ سرائی کرے جس میں انہوں نے کہا ہے:
>
> بَنِی اَحْمَدٍ قَلْبِی لَکُمْ یَتَقَطَّعُ　　بِمِثْلِ مُصَابِی فِیکُم لَیْسَ یُسْمَعُ
>
> اے احمد کے فرزند، میرا دل تمہارے لئے خون ہے اور جو مصیبتیں تم پر پڑیں اس جیسی مصیبتیں کبھی سننے میں نہیں آئیں۔
>
> ناشی بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ جب اس نے یہ بات سنی تو اس نے اپنا منہ پیٹ لیا، احمد مزوق اور دوسروں نے بھی یونہی کیا۔ ناشی اور اس کے بعد مزوق نے سب سے زیادہ ماتم کیا۔ اس کے بعد انہی اشعار کے

---

(۱) "نقاش" اور "سخن آراء" دونوں معنی ہیں

ساتھ نماز ظہر تک نوحہ خوانی کی گئی۔ مجلس ختم ہو گئی۔ اس مرد کو کچھ ہدیہ دینے کی بہت کوشش کی گئی لیکن اس نے قبول نہ کیا بلکہ کہا: خدا کی قسم اگر مجھے پوری دنیا بھی دے دو تو پھر بھی نہیں لوں گا کیونکہ جناب سیدہ(س) کا پیامبر ہوں اور اس پیام رسانی کے بدلے کوئی چیز بھی قبول نہیں کروں گا۔(۱)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کے آخر میں ایک فصل ان مرثیوں اور قصیدوں کے لئے مخصوص کریں۔ ہم نے عربی شاعروں کے بعض نمونے جو آٹھویں صدی ہجری سے پہلے کہے گئے، دیئے ہیں اور فارسی اشعار میں سے ان اشعار کے نمونے جو نویں صدی ہجری کے آخر تک کے ہیں، ہم نے انہی پر اکتفا کیا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہمیں علم ہے دسویں صدی ہجری کے بعد شیعہ مذہب پھیل گیا اور عہد صفوی کے اشعار میں (جب شیعہ مذہب کو سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی) اہل بیت کی شان میں بکثرت قصیدے دیکھے جاسکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

---

(۱) معجم الادباء ج ۱۳ ص ۲۹۲ ۔ ۲۹۳

شیعہ شعرائے عرب کے اشعار

سے

انتخاب

ظہور اسلام سے دسیوں سال قبل سے سرزمین عرب میں ہمدردی اور دشمنی کے جذبات کو ابھارنے کے لیے عربی اشعار ایک موثر ذریعہ رہے ہیں۔ کتنے ہی قصیدے اور قطعے کہے گئے اور ان کے کہنے اور زبان پر لانے سے ایک شخص یا افراد لوگوں کے ذہنوں میں بڑے بن کر جلوہ گر ہوئے یا اپنی قدر و منزلت کھوبیٹھے۔ چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ ایک اجتماع اور محفل میں کچھ شعر پڑھے گئے اور حاضرین آپس میں الجھ گئے اور ایک دوسرے کی جانوں کے درپے ہو گئے۔

جذبات و احساسات پر اشعار کی تاثیر، صرف عربی اشعار کا ہی خاصہ نہیں ہے۔ البتہ اس میدان میں ان کا استعمال اور اس علاقے کے لوگوں پر اشعار کا اثر دیگر علاقوں کی نسبت زیادہ ہے۔ اسی خصوصیت کی بناء پر دور جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی ادوار میں مختلف قبائل مدح خواں شعراء کو اپنی طرف متوجہ کرنے یا ہجو گو کو راضی رکھنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے اور نہایت قیمتی انعامات دے کر اپنے لئے فخر و مباہات کا سامان فراہم کرتے یا اپنی عزت و وقار خریدتے۔

جونہی مدینہ منورہ میں حکومت اسلامی کی بنیاد پڑی قرآن کے احکامات اور فرامین پیغمبرؐ کی رو سے شعراء حضرات کو دوسروں کی عزت واحترام کی حدود سے تجاوز کرنے سے منع کردیا گیا۔ البتہ بعض اشعار کو دین کی خدمت کے عنوان سے بروئے کار لایا گیا۔ سیرت اور تاریخ کی کتب کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ غزوہ بدر، احد، خندق اور دوسری بڑی جنگوں میں دونوں طرف کے شعراء نے اپنے گروہ کی کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر دکھانے کی کوششیں کیں اور نقصانات کو کم سے کم ظاہر کیا گیا۔

رسول خداؐ کے لشکر میں ایسے مجاہد شاعر بھی تھے جو دیگر مجاہدین کے ساتھ دشمنوں پر حملے بھی کرتے تھے۔ انہیں رسول اللہؐ فرماتے:

تمہارے اشعار تیروں کی طرح دشمن پر ضرب کاری لگاتے ہیں۔(۱)

---

(۱) مسند احمد۔ بنقل از معجم الفہرس ذیل کلمۂ شعر

جنگ جمل میں جب علوی اور عثمانی صفوف مشخص ہو گئیں اور پھر نئے سرے سے عرب ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئے تو خلافت علیؑ کے طرفدار شعراء اور بیعت شکن گروہ کے شعراء قدیم روایت زندہ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر فخر ومباہات کا اظہار کرنے لگے۔ پھر یہ روش اور طرز عمل جنگ صفین اور جنگ نہروان میں پوری قوت کے ساتھ برقرار رہا۔

معاویہ کے بیس سالہ دور حکومت میں شیعہ شدید دباؤ میں رہے اور انہوں نے سخت ترین حالات میں ایام زندگی بسر کیے۔ ان حالات میں علوی شعراء کے لیے اپنے افکار اور تخیلات کو شعری قالب میں ڈھالنے کا موقع نہ تھا۔ لیکن محرم سن ۶۱ ہجری کے افسوس ناک واقعہ، دوسرے مدینہ میں قتل عام اور ابوسفیان کے خاندان اور آل مروان کے ہاتھوں دین اور اہل بیت رسولؐ کی جو بے حرمتی کی گئی، ان امور نے یزید کی ہلاکت کے بعد آل رسولؐ کے مدح خوانوں میں یہ جرأت پیدا کی اور انہوں نے اپنی زبانیں کھولیں۔ مروانی دور حکومت سے اس طرح کے اشعار زبانوں سے جاری ہوئے۔ حضرت علی بن حسینؑ کی ستائش میں اور ہشام بن عبدالملک کی مذمت میں فرزدق کا میمیّہ قصیدہ اور کمیت کا سلسلہ قصائد جو ہاشمیات کے نام سے معروف ہے، اہل بیت کی مدح سرائی یا نوحہ سرائی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ ان کے بعد سید اسماعیل حمیری، دعبل خزاعی، منصور نمری، عبدی کوفی اور دسیوں دیگر شعراء نے اس مشعل کو مزید روشن کرنے کی سعی کی۔ آل علیؑ کی مظلومیت اور آل ابوسفیان کے ظلم و ستم کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ باوجود اس کے کہ اس دور میں اس قسم کے اشعار کہنا اپنی جان گنوانے کے مترادف تھا، شیعہ شعراء رضائے الٰہی کی خاطر موت سے نہ ڈرے اور حق کو بیان کیا۔

ان شعراء کی نظر میں خاندان رسالت میں سے دو ہستیاں ایک رسولؐ اللہ کی بیٹی اور دوسرا ان کا نواسہ، سب سے زیادہ مظلوم ہیں۔ شیعہ شعراء نے لوگوں کے جذبات و احساسات بیدار کرنے اور ابھارنے کے لیے ان دو شخصیات پر ڈھائے جانے والے مظالم بیان کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ ایسے اشعار کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ چونکہ یہ کتاب دختر رسول خداؐ کے بارے میں تحریر کی گئی ہے اس لیے صرف ان اشعار کو اہمیت دی گئی ہے جو ان کی مدحت یا سوگ میں کہے گئے ہیں۔

جن اشعار کو نقل کیا گیا ہے ان کا تعلق پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی تک سے ہے۔ کیونکہ اس کے بعد جیسا کہ ہم جانتے ہیں تشیع کے اثرات میں وسعت اور ایران میں شیعہ حکمرانوں کے آنے سے اس طرح کے اشعار (عربی اور فارسی) میں وسعت آ گئی اور ان کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔

ابو المستھل، کُمیت بن زیاد اسدی

یہ سنہ ۶۰ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کا شمار ان شیعہ شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے سخت ترین حالات اور مروانیوں کے دور حکومت میں بنی ہاشم کی مدح سرائی کی جب انعام کی بجائے جان کا خطرہ تھا۔ انہوں نے مخلوق کے انعام کی لالچ کے بغیر صرف رضائے الٰہی کی خاطر عظیم الشان قصائد اور قطعے اہل بیت کی مدح میں کہے۔ اس کے بدلے میں ہاشمیوں نے انعام دینے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے قبول نہ کیا۔

ان کا سلسلہ قصائد ''ہاشمیات'' کے نام سے معروف ہے جو کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ عربی کے علاوہ دیگر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ انتہائی مناسب ہو گا کہ اگر تشیع کے مرکز، سرزمین ایران میں عربی زبان کے ماہرین ان قصائد کا فارسی میں ترجمہ کردیں۔

اَهْوَى عَلِيّاً اَمِيرَالْمُؤْمِنِينَ وَلاٰ اَلُومُ يَوْماً اَبابَكْرٍ وَلاٰ عُمَرا

وَلاٰ اَقُولُ وَاِنْ لَمْيُعْطِيا فَدَكا بِنْتَ النَّبِيَّ وَلاٰ مِيراثَهُ كَفَرا

اَللّٰهُ يَعْلَمُ ماٰ ذٰا يَاتِيانِ بِهِ يَوْمَ الْقِيامَةِ مِنْ عُذْرٍ اِذَا اعْتَذَرا

(ہاشمیات: ص ۸۴ تصحیح محمد محمود رافعی۔ شرکتہ التمدن الصناعیہ۔ مصر)

☆ میں علیؑ امیرالمومنین کو پسند کرتا ہوں ۔ لیکن ابو بکر اور عمر کو سرزنش نہیں کروں گا۔

☆ اگرچہ انہوں نے دختر رسولؐ کو فدک نہیں دیااور ان کی میراث ان سے چھین لی۔ لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ کافر ہوگئے۔

☆ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ دونوں قیامت کے دن کیاعذر پیش کریں گے۔

اس کے اشعار میں سے چند بیت اس نے عباسیوں کی حمایت میں کہے اور خالد کے بھائی اسد بن عبداللہ قسری کے خلاف قیام پر خراسانیوں کو برانگیختہ کیا۔ اسد اپنے بھائی کی جانب سے حکومت

خراسان میں تھا۔ چند ابیات ملاحظہ ہوں۔

اَلاَ اَبْلِغْ جَماعَةَ اَهْلِ مَرْوٍ   عَلیٰ ما کانَ مِنْ نَایٍ وَ بُعْدٍ
رِسٰالَةَ نٰاصِحٍ یُهْدِی سَلاماً   وَیَاْمُرُ فِی الَّذِی رَکِبُوا بِجِدٍّ
فَلاٰ تَهِنُوا وَلاٰ تَرْضَوْا بِخَسْفٍ   وَلاٰ یَغْرُرْکُم اَسَدٌ بِعَهْدٍ
والاّ فَارْفَعُوا الرّایاتِ سَوداً   عَلیٰ أهْلِ الضَّلالَةِ والتَّعَدِی

(شوقی ضیف تاریخ الادب العربی۔ العصر الاسلامی، ص ۳۱۷)

☆ دور دراز کے بسنے والے اہل مرو کو پیغام پہنچا دو۔
☆ انہیں خیر و بھلائی کا پیام سنا دو کہ وہ تمہیں سلام بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے قیام پر ثابت قدم رہو۔
☆ تم سستی نہ دکھاؤ عقب نشینی نہ کرو اور اس کے دھوکے میں نہ آؤ۔
چنانچہ سیاہ پرچموں کو اٹھائے رکھو اور گمراہوں اور ظالموں پر چڑھ دوڑو۔

☆☆☆☆☆

سید اسماعیل حمیری

ان کی پیدائش سنہ ۱۰۵ ہجری اور وفات سنہ ۱۷۳ھ میں ہوئی۔ پہلے یہ مذہب کیسانی پر تھے اور محمد بن حنیفہ کی امامت اور رجعت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ بعد میں امامیہ مذہب کے پیروکار بن گئے۔ ان کا دیوان زیور طباعت سے کئی مرتبہ آراستہ ہوا۔ آخری مرتبہ یہ شاکر ھادی شاکر کی سعی و کوشش اور تصحیح کے ذریعے بیروت میں چھپا ہے۔

وَفاطِمُ قَد اَوْصَتْ بَانْ لاٰ یُصَلِیّا عَلَیْهاٰ وانْ لاٰ یَدْنُوا مِنْ رَجٰا الْقَبرِ
عَلِیّاً وَ مِقْداداً او اَنْ یَخرُجُوا بها رُوَیْداً بِلَیْلٍ فِی سُکُوتٍ وَ فِی سَتْرٍ

(مناقب: ج۳، ص۳۶۳ دیوان ص ۲۴۳-۲۴۴)

☆ حضرت فاطمہ (س) نے وصیت کی کہ فلاں دو شخص ان کی نماز جنازہ میں شریک نہ ہوں اور نہ ہی ان کی قبر پر آئیں۔

☆ فاطمہؑ نے علیؑ اور مقداد کو وصیت کی کہ انہیں رات کے سناٹے میں لوگوں سے چھپ کر خاموشی کے ساتھ سپرد خاک کریں۔

☆ فاطمہؑ تمام رشتہ داروں میں سے سب سے پہلے رحلت کریں گی اور مجھ سے ملحق ہوں گی ان کی وفات پر زیادہ آہ وفریاد نہ کرنا۔

اِنَّهٰا اَسْرَعُ اَهْلِی مِیتَةً وَ لحاقاً بِی، فَلاٰ تُکْثِرِ جَزعٍ
فَمَضٰی وَاتَّبَعَتْهُ وٰالِهاً بَعْدَ غَیْضٍ جَرَّعَتْهُ وَوَجَع

(دیوان ص، ۲۸۹۔ مناقب ج ۳ ص ۳۶۲)

☆ رسول خداؐ کوچ کر گئے اور فاطمہؑ رنج و الم کے داغ سہنے کے بعد بڑے اشتیاق کے ساتھ ان کے پیچھے چلی گئیں۔

منصورِ نمری

منصور بن زبرقان بن مسلم یا مسلمہ بن زبرقان دوسری صدی ہجری کے شعراء میں سے ہیں۔ خاندان برامکہ کے مدح خوان تھے۔ انہوں نے عباسیوں کی تعریف میں کئی قصائد لکھے۔ ان میں سے بعض میں بنی ہاشم کی توہین بھی کی گئی ہے۔ لیکن شوقی ضیف لکھتا ہے:

وہ شیعہ تھا اور اس تعریف و ستائش کو اس نے اپنے عقیدے کے لیے سپر بنایا۔ ایک قصیدے میں جس کے چند اشعار میں نے ذکر کئے ہیں۔ اس طرح اس نے آل محمدؐ پر مظالم ڈھانے والوں کی مذمت کی ہے کہ ہارون نے اس قتل کا حکم جاری کردیا۔ مگر اس کے حکم کے اجراء سے پہلے منصور فوت ہو گیا۔ اس کی وفات دوسری صدی ہجری کے اختتام پر ہوئی۔

تُقْتَلُ ذُرِّيَةُ النَّبِي وَيَرْجُونَ جِنَانَ الْخُلُودِ لِلْقَاتِل

وَيْلَکَ يا قاتِلَ الْحُسَيْنِ لَقَدْ نُؤْتَ بِحَمْلٍ يَنُوءُ بِالْحامِل

دِينُكُمْ جَفْوَةُ النَّبِیِّ وَمَا اَلْجافِی لآلِ النَّبِیِّ كَالْوَاصِل

مَظْلُومَةٌ وَالنَّبِیُّ وَالِدُها قَرِيرُ أَرْجاءِ مُقْلَةِ حافِل

الاَ مَصَالِيتَ يَغْضِبُونَ لَها بِسَلةِ الْبِيضِ وَالْقَنَا الذابِلِ

(الشعر والشعراء: ص ۸۳۶۔ ۸۳۷ اور تاریخ الادب العربی شوقی ضیف ج ۳ ص ۳۱۷۔ الاغانی: ج ۱۳ ص ۱۴۰، تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۶۵ اور مقاتل الطالبین ص ۵۲۲)

☆ ذریت رسولؐ کو تہ تیغ کیا جارہا ہے اور ان کے قاتلوں کے لئے بہشت جاوداں کی امیدیں لگائی جارہی ہیں۔

☆ وائے ہو تجھ پر اے قاتل حسینؑ! تیرے کندھوں پر وہ سنگین بوجھ ہے جو اٹھانے والے پر مزید بھاری ہو جاتا ہے۔

☆ تمہارا دین رسولؐ پر ظلم و ستم ہے۔ نجات اور حصول مقصد میں آل رسولؐ کا دوست اور ان پر ظلم کرنے والا ایک درجے پر نہیں ہے۔

☆ ایک مظلومہ پیغمبرؐ کی لخت جگر ہیں، جن کی آنکھوں سے اشک رواں ہیں۔

☆ بہادر اور شجاع شمشیر زن کہاں ہیں؟ کیوں انہیں غیرت نہیں للکار رہی اور کیوں وہ نیزہ و تلوار نہیں اٹھاتے؟

ان ابیات کو ''الشعر والشعراء'' کے تصحیح شدہ نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ اس کی تصحیح احمد محمد بن شاکر نے کی ہے۔ مذکورہ مآخذ اور منابع میں الفاظ کے نقل میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ چوتھے شعر میں گرامر کی بھی ایک غلطی ہے۔ میں اپنے دانشور دوست جناب ڈاکٹر مہدوی دامغانی کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ان صفحات کی نقول فراہم کیں۔

☆☆☆☆☆

دِعبِل

ان کا نام ابو علی بن رزین بن عثمان بن عبداللہ بن بدیل اور لقب دِعبل ہے۔ قبیلہ خزاعہ سے ان کا تعلق ہے۔ سنہ ۱۴۸ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۴۶ھ میں قتل ہوئے۔ وہ تند وتیز زبان، صریح لہجے اور موت کے ڈر سے بے نیاز شاعر کے عنوان سے پہچانے جاتے ہیں۔ ذیل میں مذکور ان کا قصیدہ تائیہ اشعار عربی کا ایک شاہکار، جاوداں، نمونہ اور اہل بیت پیغمبرؐ کی حرمت وتوقیر کے دفاع کا مظہر ہے۔

جیسا کہ مشہور ہے کہ یہ قصیدہ امام علی بن موسی الرضا(ع) کے سامنے پڑھا گیا۔ اس قصیدے کے منتخب اشعار یہاں ذکر کیے گئے ہیں جو گزشتہ فصل میں اخذ شدہ تاریخی نتائج کی تائید کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ لِلایّامِ مَا جَرَّ جَوْرُهاٰ   عَلَی النّاسِ مِنْ نَقْصٍ وَطُولِ شِتاٰتِ

لکَیفَ وَمِنْ اَنّی یُطاٰلَبُ زُلْفَةٌ   اِلَی اللّٰهِ بَعْدَ الصَّوْمِ وَ الصَّلَواٰتِ

سِوَی حُبِّ اَبْناءِ النَّبیّ و رَهْطِهِ   وَ بُغْضِ بَنِي الزَّرقاٰء وَالْعَبَلاٰت

و هِنْدٍ و ماٰ اَدَّتْ سُمَیَّةُ وَابْنُهاٰ   اُولُو الْکُفْرِ فِی الاِسْلامِ، وَالفَجَراتِ

هُمْ نَقَضُوا عَهْدَ الْکِتاٰبِ وَ فَرْضَهُ   وَمُحْکَمَهُ بِالزُّوْرِ وَ الشُّبَهاٰتِ

تُراٰثٌ بِلاٰ قُرْبَی وَ مُلْکٌ بِلاٰ هُدَی   وَحُکْمٌ بِلاٰ شُوریٰ بِغَیْرِ هُداٰةِ

وَلَوْ قَلَّدُوا الْمُوصَی اِلَیْهِ زِماٰمَها   لَزُمَّتْ بِمَاْمُونٍ مِنَ الْعَثَراتِ

سَقَی اللّٰهُ قَبْراً بِالْمَدِینَةِ غَیْثَهُ   فَقَدْ حَلَّ فِیهِ اْلاَمْنُ بِالْبَرَکاٰتِ

نَبِیُّ الْهُدَی صَلَّی عَلَیْهِ مَلِیکُهُ   وَ بَلَّغَ عَنَّاٰ رُوحَهُ التَّحَفاٰتِ

اَفاٰطِمُ لَوْخِلْتِ الْحُسَیْنَ مُجَدَّلاً   وَقَدْ ماٰتَ عَطْشاٰناً بِشَطِّ فُراٰتِ

اِذَنْ لَلَطَمْتِ الْخَدَّ فاٰطِمُ عِنْدَهُ   وَ اَجْرَیْتِ دَمْعَ الْعَیْنِ فِی الْوَجَناٰت

اَفاٰطِمُ قُومِی یاٰبْنَةَ الْخَیْرِ وَ اَنْدُبِی   نُجُومَ سَماٰواٰت بِاَرْضِ فَلاٰةِ

أَرَىٰ فَيْأَهُمْ فِي غَيْرِهِمْ مُتَقَسِّماً وَ أَيْدِيَهُمْ مِن فَيْئِهِمْ صَفِرَات
دِيَارُ رَسُولِ اللّٰهِ أَصْبَحْنَ بَلْقَعاً وَآلُ زِيَاد تَسْكُنُ الْحُجُرَاتِ
وَ آلُ رَسُولِ اللّٰهِ تُدْمَى نُحُورُهُمْ وَآلُ زِيَادٍ آمنواْ السَّرِبَاتِ
خُرُوجُ إِمَامٍ لاَ مَحَالَةَ خَارِجٌ يَقُومُ عَلَى اسْمِ اللّٰهِ وَ الْبَرَكَاتِ
يُمَيِّزُ فِينَا كُلَّ حَقٍّ وَ بَاطِلٍ وَ يُجْزِي عَلَى النَّعْمَاءِ وَ النِّقِمَاتِ
فَيَا نَفْسُ طِيبِي ثُمَّ يَا نَفْسُ اَبْشِرِي فَغَيْرُ بَعِيدٍ كُلُّ مَا هُوَ آتٍ

(دیوان فصیح، عبدالصاحب عمران دجیلی، ص ۱۲۶۔ ۱۴۳)

☆ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ زمانہ کس طرح لوگوں پر اپنے مظالم کا جال پھیلا رہا ہے۔ انہیں ختم کررہا اور ان کے اجتماع کو منتشر کررہا ہے۔

☆ پس نماز اور روزے کے بعد کہاں سے اور کس طرح سے خدا کے نزدیک ہوا جاسکتا ہے؟

☆ ہاں! رسول اللہؐ کی بیٹیوں اور اقرباء سے محبت و دوستی اور بنی زرقا (مروان بن حکم) اور ان کے یاروں سے دشمنی کے ذریعے۔

☆ ہند، سمیہ (زیاد کی ماں) اور اس کے بیٹوں نے اسلام کے اندر کفر او رفسق و فجور کے جو کرتب دکھائے ہیں۔

☆ انہوں نے جھوٹ اور فریب کے ذریعے کتاب الٰہی کا پیمان توڑا اور اس کے واجبات ترک کیے اور اس کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا۔

☆ جس میراث کے یہ حق دار نہ تھے اس پر قابض ہوئے اور ہدایت و مشورت کے بغیر حکم و حکومت کو چلایا۔

☆ اگر حکومت اور مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور وصی رسولؐ کے سپرد کردیتے تو وہ انہیں بلاخوف وخطر راہ راست پر لے جاتے۔

☆ اللہ تعالیٰ باران رحمت سے مدینے میں موجود قبر مقدس کو سیراب کرے کہ وہ امن اور برکات کا گہوارہ ہے۔

☆ ہادی برحق، ختم رسل پر خدا کے فرشتوں کا درود و سلام ہو اور ہماری طرف سے آپؐ کی روح پر ہدیہ سلام و درود ہو۔

☆ اے فاطمہؑ! کیا آپ کو پتہ ہے کہ آپ کا حسینؑ فرات کے کنارے پیاسا مارا گیا۔

☆ اگر آپ ان کے پاس ہوتیں تو اپنا منہ پیٹتیں اور آنسوؤں کی لڑیاں پروتیں۔

☆ اے خیر البشر کی بیٹی فاطمہؑ! اٹھو اور ان آسمان کے ستاروں پر نوحہ کرو جو صحرا کی ریت پر پڑے ہیں۔

☆ میں دیکھتا ہوں کہ ان کا حق دوسروں میں تقسیم ہو رہا ہے اور ان کے ہاتھ اپنے مال سے خالی ہیں۔

☆ رسول اللہؐ کا گھر ویران و برباد ہے جبکہ آل زیاد کے گھر میں رونقیں ہیں۔

☆ آل رسولؐ کی گردنوں کو تہ تیغ کیا جاتا ہے اور آل زیاد آرام و سکون میں ہے۔

☆ لامحالہ امام و رہبر کو قیام کرنا چاہیے اور خدا کے نام اور برکات سے ظالموں سے برسرپیکار ہونا چاہیے۔

☆ جو حق کو باطل سے جدا کردے، ظالم و ستمگر کو کیفر کردار تک پہنچائے اور فرمانبردار کو نعمات سے نوازے۔

☆ اے دل! خوش ہو جا، اے دل! تجھے بشارت ہو کہ جو کچھ ہونا چاہیے وہ جلد ہو کر رہے گا۔

سَلاَمَةُ الْمَوْصلی

لَمّاٰ قَضَتْ فَاطِمُ الزَّهْراءِ غَسَّلَهٰا   عَنْ اَمْرِهٰا بَعْلُهاَ الْهاٰدِی وَ سِبْطٰاهاء
و قاٰمَ حَتّٰی اتیٰ بَطْنَ الْبَقِیعِ بِهاٰ   لَیْلاً فَصَلّٰی عَلَیْهٰا ثُمّ واٰراٰهٰا
وَلَمْ یُصَلِّ عَلَیْهٰا مِنْهُمْ اَحَدٌ   حٰاشٰا لَهٰا مِنْ صَلاٰةِ الْقَوْمِ حٰاشٰاها

(مناقب: ج۳، ص ۳۶۳)

☆ جب فاطمہ (س) اس دنیا سے رخصت ہوئیں توان کی وصیت کے مطابق ان کے شوہر نامدار اور دو بیٹوں نے انہیں غسل دیا۔(وضاحت: سبط کے معنی نواسہ یا پوتا زیادہ مشہور ہوئے ہیں لیکن اس کے دوسرے معنی حقیقی فرزند کے بھی ہیں۔(لسان العرب)

☆ رات کی تاریکی میں جب سب لوگ محو خواب تھے ان کے شوہر ان کا جنازہ بقیع میں لائے۔ان کی نماز جنازہ ادا کی اور ان کی قبر کو دنیا والوں کی نظروں سے مخفی رکھا۔

☆ (جن سے زہرا(س) ناراض تھیں) ان میں سے کوئی بھی ان کے جنازے میں شریک نہ ہوا کیونکہ انہیں ان کی نماز کی ضرورت نہ تھی۔

یا نَفسُ اِنْ تَلْتَقِی ظُلماً فَقَدْ ظُلِمَتْ   بِنْتُ النَبِیّ رَسُولِ اللّٰہِ وَ ابناٰهٰا
تِلْکَ الَّتِی اَحْمَدُ الْمُخْتٰارُ واٰلِدُهٰا   و جِبْرئیلُ اَمِینُ اللّٰہِ رَبّٰاهٰا
اَللّٰہُ طَهَّرَهٰا مِنْ کُلِّ فاحِشَةٍ   وَکُلّ رَیْبٍ وَصَفّاٰهٰا وَزَکّاٰهٰا

(مناقب: ج۳، ص ۳۵۸)

☆ اے نفس! اگر تم پر مظالم ڈھائے جائیں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ یہاں تو رسول اللہؐ کی بیٹی اور ان کے فرزندوں پر ظلم وستم کیا گیا۔

☆ وہ تو احمد مختارؐ کی لختِ جگر تھیں اور ان کی پرورش کرنے والا جبرائیل امین تھا۔

☆ خدا نے انہیں ہر عیب اور نقص سے پاک کیا اور ہر برائی و نجاست سے طاہر قرار دیا۔

صنوبری

احمد بن محمد بن حسن، زرکلی کی نقل کے مطابق سنہ ۳۳۴ھ میں فوت ہوئے۔
ابن کثیر نے ان کی وفات سنہ ۳۰۰ھ کے لگ بھگ بیان کی ہے جو کہ غلط ہے۔
ثعالبی نے یتیمہ میں، ابن ندیم نے الفہرست میں اور دیگر افراد نے ان اشعار کی تعریف کی ہے۔

مَنْ ذا لِفاطِمَةَ اللَّهْفاء يُنْبِئُها عَنْ بَعْلِها وَابْنِها إنْباء لَهْفانِ
مِنْ قابِضِ النَّفسِ فِي الْمِحْرابِ مُنْتَصِبا وَقابِضِ النَّفْسِ فِي الْهَيْجاء عَطْشانِ
نَجمانِ فِي الاَرْضِ بَلْ بَدْرانِ قَد أفَلا نَعَمْ وَشَمْسانِ امّا قُلْتُ شَمْسان

(الغدیر: ج ۳، ص ۳۷۱)

☆ ظلم و ستم سہنے والی فاطمہؑ کو کون خبر بتائے کہ ان کے شوہر اور بیٹے پر کیا گزری؟
☆ ایک محراب عبادت میں خون میں نہا گیا اور ایک میدان کارزار میں پیاسا مارا گیا۔
☆ وہ دو ستارے تھے جو زمین میں غروب ہو گئے بلکہ وہ دو چاند تھے۔ چاند کیا ہے؟ بلکہ خورشید بھی ان سے روشنی حاصل کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ناشئ صغیر

ان کا نام علی بن عبداللہ بن وصیف اور کنیت ابوالحسن تھی۔ ان کی پیدائش سنہ ۲۷۱ھ اور وفات سنہ ۳۶۵ھ میں ہوئی۔ ان کا نام گزشتہ فصل میں بھی ذکر ہوا ہے۔
معجم الادباء کے مؤلف کی نقل کے مطابق کبودی کی مجلس میں ایک شخص نے اپنے آپ کو فاطمۃ الزہراؑ کا پیام رساں ظاہر کیا اور احمد مزوق سے کہا کہ ناشی کے چند ابیات، جنہیں یہاں نقل کیا گیا ہے پڑھیں اور نوحہ کریں۔

بَنِی اَحْمَدٍ قَلْبِی لَکُم یَتَقَطَّعُ — بِمِثْلِ مُصَابِی فِیکُم لَیْسَ یُسْمَعُ
فَمَا بُقْعَةُ فِی الاَرْضِ شَرْقاً وَ مَغْرِباً — وَ لَیْسَ لَکُمْ فِیهَا قَتِیلٌ وَ مَصْرَعٌ
ظُلِمْتُم وَقُتِّلْتُمْ وَقُسِّمَ فَیئُکُمْ — وَضَاقَتْ بِکُمْ اَرْضٌ فَلَمْ یُحْمَ مَوْضِعٌ
عَجِبْتُ لَکُمْ تَفْنَونَ قَتْلاً بِسَیْفِکُم — وَیَسْطُو عَلَیْکُمْ مَنْ لَکُمْ کَانَ یَخْضَعُ
جُسُومُ عَلَی الْبُوْغَاء تُرْمٰی وَاَرْؤُسٌ — عَلٰی اَرْؤُسِ اللَّدنِ الذَّوَابِلِ تُرْفَعُ
کَاَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ اَوْصَی بِقَتْلِکُم — وَ اَجْسَامُکُم فِی کُلِّ اَرْضٍ تُوَزَّعُ

(معجم الادباء ج ۱۳ ص ۲۹۳ وفیات الاعیان ج ۳، ۵۱ ص ۵۳ الغدیر ج ۴ ص ۲۸)

☆ اے فرزندان احمد! تمہاری مصیبت میں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہے اور جو مصائب تم پر گزرے انہیں سننے کی تاب نہیں۔
☆ مشرق ومغرب میں کوئی ایسی زمین نہیں جہاں تمہارا خون نہ بہایا گیا ہو اور تمہیں قتل نہ کیا گیا ہو۔
☆ تم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ تمہیں خاک وخون میں غلطان کیا گیا۔
☆ تمہارے مال وجائیداد اور حق کو غارت کیا گیا۔ یہاں تک کہ زمین تم پر تنگ ہو گئی اور لوگ تم سے برسرپیکار ہوئے۔
☆ میں تمہارے بارے میں سراپا حیرت ہوں کہ تمہاری ہی تلوار سے تمہیں ذبح کیا

جارہا ہے اور جو تمہارے زیردست تھے وہ تم پر حکم چلانے لگے ہیں۔

☆ تمہارے جسموں کو تپتی ریت پر لٹایا گیا اور سروں کو نیزوں پر اٹھایا گیا۔

☆ (ان مظالم کو دیکھ کر یوں لگتا ہے) جیسے رسولؐ اللہ نے وصیت کی ہو کہ تمہیں قتل کیا جائے اور تمہارے جسموں کو روئے زمین پر پھیلا دیا جائے۔

☆☆☆☆☆

ابن حماد

علی بن حماد بن عبیداللہ بن حماد بصری شیعہ شاعر تھے۔ آپ چوتھی صدی ہجری کی شخصیت ہیں۔ مناقب ابن شہر آشوب میں ان کے اشعار مختلف مناسبتوں سے مذکور ہیں۔ ان کے حالات زندگی رجال اور تذکرے کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کے مفصل ترین حالات زندگی الغدیر کی چوتھی جلد میں مذکور ہیں جہاں ان کے طولانی قصائد بھی بیان ہوئے ہیں۔

وَرَوىٰ لِی عَبْدُالْعَزِیزِ الْجُلُودِیُّ   وَقَدْ کَانَ صَادِقاً مَبْرُوراً

عَنْ ثِقَاةِ الْحَدِیثِ اَعْنِی الْعَلاٰئِی   هُوَ اَکْرِمْ بِذا وَذا مَذْکُوراً

یُسْنِدُوهُ عَن ابْنِ عَبّاس یَوْماً   قَالَ کُنّا عِنْدَ النَّبِیّ حُضُوراً

إذاَتَتْهُ الْبَتُولُ فاطِمُ تَبْکِی   وَتُوالِی شَهِیقها وَالزَّفِیرا

قَالَ مَالِی اَرَاکِ تَبْکِینَ یا فاطِمُ   قالَتْ وَاَخْفَتِ التَّعْبِیرا

إجْتَمَعْنَ النِّساء نَحْوِی وَ اَقْبَلْنَ   یُطِلْنَ التَّقْرِیعَ وَ التَّعْیِیراً

قُلْنَ إنَّ النَّبِیَّ زَوَّجَکِ الْیَوْمَ   عَلِیّاً بَعْلاً عَدِیماً فَقِیراً

قَالَ یا فاطِمُ اسْمَعِی وَ اشْکُرِی اللّٰهَ   فَقَدْ نِلْتِ مِنْهُ فَضْلاً کَبِیراً

لَمْ اُزَوّجکِ دُونَ إذْنٍ مِنَ اللّٰهِ   وَمَا زال یُحسِنُ التدبیرا

☆ میں نے تمہاری شادی حکم خدا کے سوا نہیں کی اور خدا اپنے بندوں کے لیے احسن تدبیر کرتا ہے۔

☆ مجھ سے عبدالعزیز جلودی نے روایت کی ہے جو سچے اور پاکباز انسان ہیں۔

☆ ان کا شمار ثقات حدیث میں ہوتا ہے اور وہ امانت اور بزرگواری میں معروف ہیں۔

☆ انہوں نے سند معتبر سے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ایک دن ہم رسولؐ خدا

کی خدمت میں حاضر تھے۔

☆ فاطمہ زہرا(س) آپؐ کے پاس آنسو بہاتی، درد دل بیان کرتی اور عورتوں کا شکوہ کرتی ہوئی آئیں۔

☆ آنحضرتؐ نے پوچھا: بیٹی تمہیں کس بات نے رلایا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا

☆ مجھے عورتوں کے طعنوں اور ان کی زبانوں کے زخموں نے رلایا ہے۔

☆ عورتوں نے آج کہا ہے کہ رسولؐ خدا نے تمہیں علیؑ جیسے نادار فقیر شوہر کے ساتھ بیاہ دیا ہے۔

☆ آپؐ نے فرمایا: اے فاطمہؑ! غور سے سنو۔ خداوند متعال کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں عظیم فضل سے نوازا ہے۔

☆☆☆☆

یا بَنِی اَحْمَدِ عَلَیْکُمْ عِمادِی وَ اتِّکالِی اِذا اَرَدْتُ النُّشورا

و بِکُمْ یَسْعِدُ الْمَوالِی وَیَشْقَی مَنْ یُعادِیْکُمْ وَ یُصْلیٰ سَعِیراً(1)

☆ اے رسول اللہؐ کے فرزندو! قیامت کے دن میرا سہارا اور میری امیدوں کا مرکز آپ ہیں۔

☆ تمہارے دوست اور محبؐ، سعادت مند اور خوشحال ہیں اور تمہارے دشمن بدبخت اور آتش جہنم میں جلتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

---

(1) الغدیر: ج ۴ ص ۱۶۷۔۱۶۸۔ مناقب نے ان ابیات کو عبدی کوفی کے نام سے لکھا ہے لیکن "الغدیر" کے مصنف نے ابن حماد کے نام سے جو قصیدہ نقل کیا ہے یہ اشعار اس قصیدے کا حصہ ہیں۔

مهیارد یلمی

ابوالحسن مهیار مرزویه پہلے دین زرتشت کے پیرو کار تھے۔ اس کے بعد شریف رضی (نہج البلاغہ کو جمع کرنے والے) کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا۔ شاعری شریف رضی سے سیکھی اور پھر اس میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچے۔ سنہ ۴۲۸ھ میں وفات پائی۔

(مقدمہ دیوان –– طبع دارا لکتب اور وفیات الاعیان و دیگر مصادر)

الاَسَلْ قُرَیْشاً وَ لُمْ مِنْهُمْ مَنِ اسْتَوْجَبَ اللُّوْمَ اَوْفَنِّدِ
وَ قُلْ: مَالَکُمْ بَعْدَ طُولِ الضَّلاَ لِ لَمْ تَشْکُرُوا نِعْمَةَ الْمُرْشِدِ؟
اَتاکُمْ عَلیٰ فَتْرَةٍ فَاسْتَقَام بِکُمْ جائِرِینَ عَنِ الْمَقْصَد
وَوَلّیٰ حَمِیداً اِلیٰ رَبِّهِ وَ مَنْ سَنَّ مَاسَنَّهُ یُحْمَد
وَ قَدْ جَعَلَ الْاَمْرَ مِنْ بَعْدِهِ لِحَیْدَرَ بِالْخَبَرِ الْمُسنَدِ
وَ سَمّاهُ مَوْلیً بِاِقْرار مَنْ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقَّ لَمْ یُجْحِدِ
فَمِلْتُم بِهَا حَسَدَ الْفَضْلِ عَنْهُ وَ مَنْ یَکُ خَیْرَالْوَریٰ یُحْسِد
وَ قُلْتُم بِذاکَ قَضَی الْاِجْتِماعُ اَلا اِنَّمَا الْحَقُّ لِلْمُفْرَدِ
سَیَعْلَمُ مَنْ فاطِمُ خَصْمُهُ بِاَیِّ نَکالٍ غَداً یَرتَدِی

(دیوان مهیار۔ طبع دار لکتب۔ ج۱ ص ۲۹۸۔۳۰۰)

☆ ہاں! قریش سے سوال کرو اور انہیں ملامت وسرزنش کا مستحق سمجھو۔

☆ کہو! ایک طویل عرصہ ضلالت و گمراہی میں گزرنے کے بعد تم نے رہبر اور ہادی کی نعمت پر شکر ادا کیوں نہیں کیا؟

☆ جب دنیا جہالت و گمراہی کے اندھیروں میں سرگرداں تھی انہوں نے تم منحرف

لوگوں کے لیے چراغ ہدایت روشن کیا۔

☆ وہ مقرب درگاہ حق ہوئے اور جو ان کی سنت پر چلا وہ بھی قابل ستائش ہوا۔

☆ اپنے بعد انہوں نے امت کے امور حیدرؑ کے سپرد کیے اور یہ حدیث درست اور قابل اعتماد ہے۔

☆ علیؑ کی فضیلت و برتری سے حسد کی بناء پر تم نے خلافت کو کسی اور کے حوالے کردیا اور جو سب سے افضل ہیں دنیا ان سے حسد کرتی ہے۔

☆ تم نے کہا کہ یہ اکثریت کا فیصلہ ہے تم نے حق کے فیصلے کو تسلیم نہ کیا۔

☆ اور آپؐ نے انہیں ''مولی'' کا لقب دیا جس نے سنا اور قبول کیا۔ اگر کوئی حق کا تابع ہو تو وہ انکار نہیں کرے گا۔

☆ جو فاطمہ زہرا(س) کا دشمن ہے اسے جلد معلوم ہوجائے گا کہ کل اس کے لیے کون سا عذاب تیار کیا ہوا ہے؟

☆☆☆☆☆

ابن العودی

سنہ ۴۷۸ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۵۵۸ ہجری میں وفات پا گئے۔

مَنَعْتُم تُراثِی اِبْنَتِی لاٰ اَبَاً لَکُمْ فَلِمْ اَنْتُمْ آباءَ کُم قَدْ وَرِثْتُمْ
وَقُلْتُمْ نَبِیٌّ لاٰ تُراثَ لِوُلْدِهِ اَلِلْاَ جْنَبِیَّ اَلارْثُ فِیمٰا زَعَمْتُمْ
فَهذٰا سُلَیْمٰانُ لِداوُدَ وارِثٌ وَ یَحْییٰ لِزَکَرِیَا فَلِمْ ذا مَنَعْتُم

☆ تم نے اپنے آباء سے تو میراث پائی ہے لیکن تم کیوں میری بیٹی سے میری وراثت چھینتے ہو۔
☆ تم کہتے ہو کہ پیغمبرؐ اپنی اولاد کے لیے وراثت نہیں چھوڑتا۔ کیا تمہارے خیال میں بیگانہ وراثت کا حقدار بن سکتا ہے؟
☆ یحییٰ زکریا کا وارث تھا اور داود کا وارث سلیمان (علیہم السلام) تھا۔ میری بیٹی کو تم نے کیوں وراثت سے محروم کر دیا۔

☆☆☆☆☆

علاء الدین حلّی

ان کا نام ابوالحسن علاء الدین علی بن حسین حلی ہے۔ یہ چھٹی صدی ہجری کے علماء اور شعراء میں سے ہیں۔ ان کے سات قصیدے معروف ہیں۔ یہ شہید اوّل کے ہم عصر ہیں اور شہید اول نے ان قصائد میں سے ایک کی تشریح کی ہے۔

وَ اجمَعُو الامْرَ فِیمٰا بَینَهُم وَغَوَتْ　　لَهُمْ امٰانِیُّهُمْ وَالْجَهْلُ وَالأمَلُ
اَنْ یُحرِقُوا مَنْزِلَ الزَّهراء فاطِمَه　　فَیٰا لَهُ حٰادِثٌ مُسْتَصْعَبٌ جَلَلُ
بَیْتٌ بِهَ خَمْسَةٌ جِبْرِیلُ سٰادِسُهُمْ　　مِنْ غَیْرِ مٰاسَبَبٍ بِالنّارِ یُشْتَعَلُ

(الغدیر ج۶، ص۳۹۱ قصیدہ پنجم)

☆ امیدوں آرزوؤں اور جہالت نے انہیں ورغلایا۔ وہ ایک امر پر اکٹھے اور متفق ہو گئے۔

☆ فاطمہ زہرا(س) کے گھر کو جلا دیا جائے! کتنا بڑا کام اور کتنا کٹھن اور دشوار امر!

☆ جس گھر میں پنجتن پاک اور چھٹے جبرائیل ہوں اسے کسی وجہ کے بغیر کیوں آگ کے شعلوں کی نذر کیا جائے!

☆☆☆

و دارُ عَلِیّ وَ الْبَتُولِ وَ اَحْمَد　　وَ شَبَّرهٰا مَوْلی الْوَری وَ شَبیرهٰا
مَعٰالِمُهٰا تَبْکِی عَلٰی عُلَمٰائِهٰا　　و زٰائِرُهٰا یَبْکِی لِفَقْدِ مَزُورِهٰا
مَنٰازِلُ وَحیٍ اَقْفَرَتْ فَصُدوُرُهٰا　　بِوَحْشَتِهٰا تَبْکِی لِفَقْدِ صُدورِهٰا

(الغدیر ج۶ ص۳۷۶ قصیدہ دوم)

☆ علیؑ و بتول، پیغمبرؐ اور ان کے دو بیٹے شبیر اور شبر جو مخلوقات میں افضل ہیں کا گھر۔

☆ اس کے گھر کے درودیوار اس کے مکینوں کے فراق میں گریاں ونالاں ہیں اور اس کے زائر گھر کے مالک کو نہ پا کر آنسو بہا رہے ہیں۔

☆ نزول وحی کے مقامات بے آب و گیاہ بیابان کی طرح ہو گئے اس گھر کا ماحول اپنے باسیوں کے غم فراق اور وحشت و تنہائی سے نوحہ کناں ہے۔

☆☆☆☆☆

فارسی شاعری
میں
حضرت فاطمہ (س) کا ذکر

جیسا کہ آپ نے گزشتہ باب میں ملاحظہ کیا،دوسری صدی ہجری کے وسط سے حکومتِ دمشق کے رجحان کے بر عکس عربی شاعری میں خاندان رسالت سے محبت کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔(۱) اس شاعری میں ان کا حق پر ہونا، ان کی مصیبت پر سوگواری اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف اظہار نفرت شامل ہیں اور بعض اوقات ان لوگوں کی بھی مذمت کی گئی ہے جو اس ظلم کا باعث تھے۔

یہاں صرف ان اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے جو دختر پیغمبرؐ کی زندگی سے متعلق تھے۔ کیونکہ جو اشعار امیر المومنین حضرت علیؑ اور واقعہ کربلا کے بارے میں کہے گئے ہیں وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے لئے کئی بڑی جلدیں درکار ہوں گی۔

۱۳۲ھ میں بنی امیہ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد ان جیسے شاعروں کو بیان کرنے کے لیے وسیع تر میدان ملا اور باوجود اس کے کہ عباسی لوگ اولاد علیؑ سے دل سے خوش نہیں تھے لیکن خاندان بنی امیہ کے باقی ماندہ لوگوں کی بیخ کنی کے لئے انہوں نے بنی ہاشم کی مدح کرنے والوں کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ لوگ خاندان رسالت کی مدح کے ساتھ عباسی خاندان کی بھی تعریف کرتے تھے تو ان کو اس کا صلہ اور انعام بھی ملتا تھا۔ بہرحال ان کی آزادی صرف وہاں تک محدود تھی کہ اولاد علیؑ کی مدح کے ساتھ عباسیوں کی مذمت نہ ہو،ورنہ ان کی جان کی خیر نہ ہوتی۔

جیسا کہ آپ نے منصور نمری کے بیان میں ملاحظہ کیا ہے بعض اوقات بعض عباسی فرمانروا جیسے متوکل اور معتصم اولاد علیؑ سے کم ترین محبت بھی برداشت نہیں کرتے تھے اور ان کی مدح کرنے والے شعراء کو ایذارسانی سے باز نہیں آتے تھے۔

بغداد میں دیلمیوں کے تسلط کے ساتھ اس شہر میں جو کئی سال پہلے ہی شیعہ شعراء کا مرکز بن گیا تھا ایسی انجمنوں کی تشکیل عمل میں آئی جن میں اہل بیت کی فضیلت بیان ہوتی اور لوگ ان کی

---

(۱) ان اشعار سے مراد وہ اشعار ہیں جو آل نبی کی مظلومیت بیان کرتے ہیں۔ وگرنہ مدینہ میں حکومت اسلامی کے آغاز سے ہی اہل بیتؑ کی مدحت میں اشعار کہے گئے۔

مظلومیت پر گریہ وزاری کرتے۔ اس طرح کی انجمنوں کی مثال اس باب میں جس کا عنوان ''تاریخ سے عبرت'' ہے محترم قاری کی نظر سے گزر چکی ہے۔

فارسی شاعری میں، جیسا کہ اس باب میں ملاحظہ کریں گے، رسول اکرمؐ کی مدح اور علیؑ اور خاندان علیؑ سے محبت چوتھی صدی ہجری سے شروع ہو گئی تھی اگرچہ ان اشعار کی تعداد (جو ہماری دسترس میں ہیں) سامانی، غزنوی، سلجوقی اور خوارزم شاہی ادوار میں کم ہے۔

ان اشعار میں جو دری زبان کے اولین اشعار کے طور پر دئے گئے ہیں فطرت کی تصویر کشی اور حکومت وقت کی تعریف کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں ملتا۔

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی دور کے ایران میں عام فارسی اشعار جو چوتھی صدی ہجری تک دری یا دوسرے ایرانی لہجوں میں کہے گئے صرف اسی طرح کے اشعار تھے؟! اگرچہ اس سوال کا جواب مثبت نہیں دیا جاسکتا، لیکن یہ خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے موضوع بحث کے بارے میں اشعار کہے گئے ہوں گے۔ ایسی صورت میں اس کا سبب کیا ہے؟ کیا اس کا سبب حکومت کا سخت دباؤ تھا؟! اس احتمال کا امکان ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ سنہ ۴۳ھ سے ولید بن عبدالملک بن مروان کی حکومت کے خاتمہ تک ایران اور مشرقی علاقوں پر بعض حاکموں کا دباؤ تھا جیسے زیاد، عبیداللہ (بن زیاد)، حجاج بن یوسف، ابن اشعث اور ایسے دوسرے حکام جن کے ماتحت لوگ زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن کیا سبب ہے کہ مدینہ میں جو خاندان بنو امیہ کے براہ راست زیر نظر تھا کمیت جیسا شاعر جو بنو ہاشم کی مدح کرتا تھا، پیدا ہوا جبکہ نیشاپور، طوس، غزنی اور ہرات میں اس جیسا شاعر نظر نہیں آتا؟

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں ایرانی لوگوں کو خاندان رسالت اور جو کچھ ان کے ساتھ پیش آیا، اس کی کوئی خبر نہ تھی؟ اس احتمال کا ہرگز امکان نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر، ولید بن عبدالملک کی سلطنت سے مروان بن محمد کے خاتمہ تک تقریباً نصف صدی کے دوران جبکہ ایران میں حکومت کے مخالف اپنے کام میں سرگرم تھے اور خاندان رسالت کے فرزند حضرت امام رضا (ع) کی حکومت کے حق میں نعرے لگا رہے تھے، کیا کہا جاسکتا ہے؟ کیا اس زمانے میں کسی قسم کے اشعار جو اس رجحان کے آئینہ دار ہوں نہیں کہے گئے ہوں گے؟ ہم جانتے ہیں کہ شاعری عوام کے جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کیا کہا جاسکتا ہے کہ حکومتوں اور ان کے کارندوں نے اس قسم کے اشعار کو غائب کردیا ہوگا؟! اگر ایسا ہے تو یہی عمل عربی اشعار کے ساتھ کیوں نہیں کیا گیا؟ بعض اشعار کا مضمون خلفائے بنو امیہ اور بنو عباس کی براہ راست مذمت تھا۔ جبکہ اگر اس قسم کے اشعار فارسی میں کہے جاتے تو صنعاری، سامانی یا غزنوی خاندانوں کے حکام کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا، کیونکہ ان مظالم میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

یہ بات صحیح ہے کہ ہمارا موضوع بحث دری شاعری ہے اور اس لہجہ کو تیسری صدی ہجری سے

سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن (تعجب اس بات پر ہے کہ) ان عربی اشعار میں بھی جو ایران کے عربی گو شعراء نے کہے ہیں اس قسم کے نمونے نہیں ملتے۔ چوتھی صدی ہجری سے یعنی مرکزی ایران میں شیعہ حکومتوں کے قیام کے زمانہ میں ان مضامین کے نمونے کبھی کبھی فارسی شاعری میں نظر آتے ہیں، مثلاً کسائی مروزی کہتا ہے:

مدحت کن بستای کسی را که پیغمبرؐ بستودو ثنا کرد وبدو داد همه کار

☆ تم اس کی تعریف اور ستائش کرو جس کی تعریف و ستائش اور ثنا پیغمبر نے کی اور تمام کام اس کے سپرد کر دیئے۔

یا فردوسی کے یہاں یہ نمونہ ملتا ہے:

چنین زادم وهم بدین بگزرم همین دان که خاک ره حیدرم

☆ میں اسی طرح پیدا ہوا اور اسی طرح سے اپنی زندگی گزار دوں گا۔ تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ میں حیدر کی خاک راہ ہوں۔

یا خضائری رازی کے یہ اشعار ہیں:

مرا شفاعت این پنجتن بسنده بود که روز حشربدین پنجتن رسانم تن

بهین خلق و برادرش ودختر و دوپسر محمدؐ وعلیؑ فاطمهؑ حسینؑ وحسنؑ

☆ میرا سہارا اور میرا اعتماد پنجتن آل عبا کی شفاعت پر ہے۔ میں روز حشر پنجتن پاک کا دامن تھاموں گا۔

☆ کائنات کی بہترین مخلوق اور اس کا بھائی اور اس کی بیٹی اور اس کے دو بیٹے یعنی محمد و علی و فاطمہ حسن و حسین (علیہم السلام)

چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں جب فاطمیوں نے مصر پر قبضہ کرلیا اور مضبوط حکومت کی بناء ڈالی اور ان کی شہرت دوسرے اسلامی ممالک میں پہنچی تو مشرقی ایران میں بعض حامی پیدا ہو گئے۔ اس خطہ کے فارسی گو شعراء نے اہل بیتؑ کی مدح میں زبان کشائی کی جس کی ممتاز مثال ناصر خسرو علوی ہے۔ تاہم پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں سراسر ایسے اشعار جو فارسی میں اہل بیتؑ کی مدح میں کہے گئے، زیادہ نہیں ہیں۔ تعجب اس بات پر ہے کہ پانچویں صدی ہجری میں شیعوں نے بغداد اور عباسی حکومت کے مرکز میں انجمنیں قائم کیں جن میں اہل بیتؑ کے مصائب پر گریہ وزاری کرتے تھے اور

اس قسم کی انجمنوں کا نمونہ اس باب میں جس کا عنوان '' تاریخ سے عبرت '' ہے قاری کی نظر سے گزر چکا ہے۔ لیکن مشرقی ایران میں مرکز خلافت سے دور ترین نقطہ میں ناصر خسرو بیچارہ دربدر ایک ویرانہ سے دوسرے ویرانہ میں اپنی جان بچاتا پھرتا رہا۔

اس قسم کی سخت گیری کو بنو عباس کے حساب میں ڈالنا چاہیے یا ان مقامی حکومتوں کی اچھی خدمت کے حساب میں جو اپنے استحکام کی خاطر کوشش کرتی تھیں کہ جس طرح بھی ہو بنو عباس کی خوشنودی حاصل کی جائے، یا اس خطہ کے لوگوں کی اہل سنت و الجماعت سے سخت وابستگی کے حساب میں یا ان لوگوں کی تھوڑی مزاحمت کے بعد حالات کو بدستور قبول کرنے کے حساب میں ڈالنا چاہیے۔ البتہ یہ ایک جداگانہ بحث ہے کہ ایک ہزار سال گزرنے کے بعد جو کچھ اس بارے میں لکھا جائے وہ خیال و گمان سے زیادہ نہیں ہو گا جس کا سرچشمہ بحث کرنے والے کا اپنا جذبہ یا طرز تفکر ہو گا۔

بہر حال جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں مشرقی ایران میں دری لہجہ کی پیدائش سے ساتویں صدی کی پہلی دہائی تک فارسی شاعری میں اہل بیتؑ کی تعریف میں بہت کم نمونے ملتے ہیں اور دختر رسول (س) کا نام ان بعض اشعار میں کنایۃً یا ضمناً دکھائی دیتا ہے۔ ایران پر منگولوں کے حملہ کے ساتھ ہی سو سال سے زیادہ مدت تک ہر چیز درہم برہم ہو گئی اور آٹھویں صدی ہجری میں کہیں جا کر شیعہ شعراء نے ایران کے مختلف علاقوں میں اہل بیتؑ کی مدح میں زبان کھولی۔

اس باب کے آخر میں ان اشعار کے نمونے محترم قارئین کی نظر سے گزریں گے اور جیسا کہ ہم ملاحظہ کریں گے ان مدحیہ اشعار میں طویل ترین اشعار خواجوی کرمانی اور ابن حسام خوسفی کے ہیں۔

اس باب میں جو اشعار درج کئے گئے ہیں وہ نویں صدی ہجری کے اختتام تک کے ہیں کیونکہ دسویں صدی ہجری میں ایران میں شیعہ مذہب کو سرکاری حیثیت دے دی گئی۔ اس دور میں اہل بیتؑ کی مدح میں اشعار اور ان کے مرثیے فارسی شاعری کا اہم حصہ قرار پاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ناصر خسرو

ابومعین ناصر خسرو بن حارث قبادیانی بلخی جس کی ولادت سنہ ۳۹۴ھ اور وفات سنہ ۴۸۱ ہجری قمری میں ہوئی اسماعیلی شیعوں میں سے تھا اور فاطمی خلفاء کا مداح تھا اور خراسان میں ان کی طرف سے ''حجت''مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت فاطمہؑ کی شان میں اس کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

آنروز در آن هول وفزع برسر آن جمع — پیش شهدا دست من ودامن زهرا
تا داد من از دشمن اولاد پیمبر — بدهد بتمام ایزد داد ارتعالی

(دیوان .تقوی ص ۴)

شمس وجود احمد و خود زهرا — ماه ولایتست زِ اطوارش
دخت ظهور غیب احد احمد — ناموس حق و صندُقِ اسرارش
هم مطلع جمال خداوندی — هم مشرق طلیعهٔ انوارش
صد چون مسیح زنده ز انفاسش — روح الامین تجلی پندارش
هم از دمش مسیح شود پران — هم مریم دسیه زگفتارش
هم ماه بارد از لب خندانش — هم مهر ر یزد از کف مهیارش
این گوهر از جناب رسول الله — پاکست و داور است خریدارش
کفوی نداشت حضرت صدیقه — گرمی نبود حیدر کرارش
جنات عدن خاک در زهرا — رضوان زهشت خلد بود عارش
رضوان بهشت خلد نیارد سر — صدیقه گر بحشر بود یارش
باکش ز هفت دوزخ سوزان نی — زهرا چو هست یارو مدد کارش

(دیوان ص ۲۰۹)

گفتا که منم امام و میراث — بستد زنبیر گان و دختر

صعبی تو و منکری گر این کار　　نزدیک تو صعب نیست ومنکر
ورمی بر وی توبا امامی　　کاین فعل شده است زومشهر
من با تونیم که شرم دارم　　از فاطمه و شبیر وشبر

(ناصر خسرو. دیوان. مینوی ومحقق ص ۹۴)

سنائی

اس کا نام ابوالمجد مجدو دبن آدم ہے۔ اس کا شمار پانچویں اور چھٹی صدی کے شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ چھٹی صدی کے اوائل (۵۱۸ھ) میں فوت ہوا۔

نشوی غافل از بنی هاشم　　و ز یَدُ اللهِ فَوقَ ایدِیهم
داد حق شیر این جهان همه را　　جز فطامش نداد فاطمه را

(حدیقه. مدرس رضوی ص ۲۶۱)

در صفت کربلا ونسیم مشهد معظم

آل یاسین بداده یکسر جان　　عاجز و خوار و بی کس و عطشان
کرده آل زیاد وشمر لعین　　ابتدای چنین تبه در دین
مصطفی جامه جمله بدریده　　علی از دیده خون باریده
فاطمه روی را خراشیده　　خون باریده بی حد از دیده

(حدیقہ ص ۲۷۰)

☆☆☆☆☆

قوامی رازی

بدرالدین قوامی کا شمار چھٹی صدی ہجری کے پہلے نصف کے معروف شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ چھٹی صدی ہجری کے دوسرے نصف میں فوت ہوا۔

در مرثیۂ سید الشهداء

زهرا و مصطفی و علی سوخته زدرد ماتم سرای ساخته بر سدره منتها
در پیش مصطفی شده زهرای تنگدل گریان که چیست درد حسین مرا دوا

☆☆☆

ایشان در ین که کرد حسین علی سلام جدش جواب داد و پدر گفت مرحبا
زهرازجای جست وبه رویش دراوفتاد گفت ای عزیز ماتو کجائی وما کجا
چون رستی از مصاف وچه کردند باتوقوم مادر در انتظار تودیر آمدی چرا

☆ ☆ ☆

حب یاران پیمبرفرض باشدبی خلاف لیکن از بهر قرابت هست حیدر مقتدا
بود با زهرا وحیدر حجت پیغمبری لا جرم بنشاند پیغمبر سزائی باسزا

(دیوان . ص ۱۲۶.۱۲۷)

☆☆☆☆☆

اثیر اخسیکتی

اس کا شمار ساتویں صدی ہجری کے شعراء میں ہوتا ہے۔ اس کی وفات سنہ ۵۷۷ یا ۵۷۹ھ قمری میں ہوئی۔

سبزه فکنده بساط برطرف آبگیر   لاله حقه نمای شعبدهٔ بوالعجب

پیش نسیم ارغوان قرطه خونین بکف   خون حسینیان باغ کرده چو زهرا طلب

(دیوان رکن الدین همایون فرخ ص ۲۷)

☆☆☆☆☆

خواجه کرمانی

اس کا نام ابوالعطا کمال الدین محمود مرشدی ہے وہ سنہ ۶۸۹ھ میں پیدا ہوا اور ۷۵۳ھ میں فوت ہوا۔

روشنان قصر کحلی گرد خاک پای او | سرمه چشم جهان بین ثریا کرده اند
باوجود شمسه گردون عصمت فاطمه | زهره را این تیره روزان نام زهرا کرده اند
خون او را تحفه سوی باغ رضوان برده اند | تا از آن گلگونهٔ رخسار حورا کرده اند

☆☆☆

باز دیگر بر عروس چرخ زیور بسته اند | پردهٔ زر بفت بر ایوان اخضر بسته اند
چرخ کحلی پوش را بند قبا بگشوده اند | کوه آهن چنگ را زرین کمردر بسته اند
اطلس گلریز این سیما بگون خرگاه را | نقش پردازان چینی نقش ششتر بسته اند
مهد خاتون قیامت می برند از بهر آن | دیده بانان فلک را دیده ها بربسته اند
دانه ریزان کبوتر خانهٔ روحانیان | نام اهل بیت بربال کبوتر بسته اند
دل در آن تازی غازی بند کاندر غَزِوروم | تاز یانش شیهه اندر قصر قیصر بسته اند

(دیوان، ص ۱۳۳۔ ۱۳۴)

☆☆☆

منظومهٔ محبت زهرا وآل او | بر خاطر کواکب از هر نوشته اند

دوشیز گان پردہ نشین حریم قدس   نام بتول برسر معجر نوشتہ اند
(دیوان، ص ۵۸۴)

☆☆☆

از آن بوصلت او زهره شد بدلالی   که از شرف قمرش در سراچه دربان بود
چون شمع مشرقی از چشم سایر انجم   زبس اشعهٔ انوار خویش پنهان بود
نگشت عمروی ازحی[1] فزون ز روی حساب   چرا که زندگی او بحَیِ حنّان بود
ورای ذروهٔ افلاک آستانه اوست   زمر غزارفردایس آب ودانه اوست
بدسته بندر یا حین باغ پیغمبر   که بود نَیّرهٔ برج قدس راخاور
عروس نه تتق[2] لاله برگ هفت چمن[3]   تذرو هشت گلستان[4] وشمع شش منظر
زنام اوشده نامی سه فرع[5] وچار اصول[6]   بیمن اوشده سامی دو کاخ وپنج قمر[7]
کهینه سوری[8] بیت العروس اوسارهٔ[9]   کمینه جاریهٔ خانه دار اُو هاجر[10]
بمطبخش فلک دود خورده را درپیش   زمه طبقچهٔ سیم زمهر هاون زر
زسفرهٔ انا املح[11] طعام او نمکین   زشکرانا افصح[12] کلام او شیرین
(دیوان ص ۶۱۵)

☆☆☆☆☆

ا۔ حی بحساب ابجد بمعنی ۱۸ ہے۔ دختر پیغمبرؐ کی عمر کی طرف اشارہ ہے ۲۔ نہ افلاک ۳۔ ہفت سیارہ ۴۔ ہشت بہشت ۵۔ موالید سہ گانہ: حیوان۔ نبات معادن ۶ چہار آخشیج: آب۔ باد۔ خاک۔ آتش ۷۔ ہفت افلاک ۸۔ مہمان ۹۔ زن ابراہیم(ع) ومادر اسحاق ۱۰۔ مادر اسماعیل (ع) ۱۱۔ ماخوذ از حدیث "کان یوسف حسننا ولکننی املح"(سفینۃ البحار ج۲ ص ۵۴۲) ۱۲۔ ماخوذ از حدیث انا افصح العرب بیدانی من قریش(سفینۃ البحار ج ۲ ص ۳۶۱)

ابن یمین

اس کا نام محمود بن یمین الدین فریومدی ہے۔ اس کا شمار آٹھویں صدی ہجری کے شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ سربداری خاندان کے مدح سرا اور اس خاندان سے وابستہ شعراء میں سے تھا۔ اس کی وفات سنہ ۷۶۹ ہجری قمری میں ہوئی۔

شنیدم زگفتار کار آگهان　　بزرگان گیتی کهان و مهان
که پیغمبر پاک والا نسب　　محمد سر سروران عرب
چنین گفت روزی باصحاب خود　　بخاصان درگاه واحباب خود
که چون روز محشر درآید همی　　خلایق سوی محشر آید همی
منادی برآید بهفت آسمان　　که ای اهل محشر کران تا کران
زن و مرد چشمان بهم بر نهید　　دل از رنج گیتی بهم بر نهید
که خاتون محشر گذر می کند　　زآب مژه خاک تر می کند
یکی گفت کای پاک بی کین و خشم　　زنان از که پوشند باری دو چشم
جوابش چنین داد دارای دین　　که بر جان پاکش هزار آفرین
ندارد کسی طاقت دیدنش　　ز بس گریه و سوز و نالیدنش
بیک دوش او بر، یکی پیرهن　　بزهر آب آلوده بهر حسن
ز خون حسینش بدوش دگر　　فروهشته آغشته دستار سر
بدینسان رود خسته تا پای عرش　　بنالد بدرگاه دارای عرش
بگوید که خون دو والا گهر　　ازین ظالمان هم تو خواهی مگر
ستم کس ندیدست از این بیشتر　　بده داد من چون توئی داد گر
کند یاد سوگند یزدان چنان　　بدوزخ کنم بندوشان جاودان
چه بد طالع آنظالم زشتخوی　　که خصمان شوندش شفیعان او

(دیوان۔ حسین علی باستانی راد ص ۵۸۹۔۵۹۰)

ابن حسام

محمد بن حسام الدین خوسفی کا شمار نویں صدی ہجری کے مشہور شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ ایک باقدرت طبیعت رکھنے والا شاعر اور بلند ہمت عالم تھا جس نے اپنی عمر خاندان رسالتؐ کی مدح میں بسر کی اور لوگوں کی مدح سرائی روٹی کی خاطر نہیں کی، جیسا کہ وہ کہتا ہے۔

شکم چون به یک نان توان کرد سیر مکش منت سفره اردشیر

اس کا شعری مجموعہ "خاوران نامه" اور "دیوان" پر مشتمل ہے جس میں اس کے قصائد، ترجیع بند، مخمس اور دوسرے اصناف شعر شامل ہیں۔ وہ سنہ ۸۷۵ ہجری قمری میں فوت ہوا۔

قصیده در مدح فاطمه زهراء(س)

چنین گفت آدم علیه السلام | که شد باغ رضوان مقیمش مقام
که باروی صافی و با رای صاف | زهر جانبی می نمودم طواف
یکی خانه در چشم آمد ز دور | برونش منور ز خوبی ونور
زتابش گرفته رخ مه نقاب | زنورش منور رخ آفتاب
کسی خواستم تا بپرسم بسی | بسی بنگریدم ندیدم کسی
سوی آسمان کردم آنگه نگاه | که ای آفرینندۀ مهر وماه
ضمیر صفی از تودارد صفا | صفا بخشم از صفوت مصطفی!
دلم صافی از صفوت ماه کن | زاسرار این خانه آگاه کن
زبالا صدائی رسیدم بگوش | که یا ای صفی آنچه بتوان بگوش!
دعایی ز دانش بیاموزمت | چراغی ز صفوت برافروزمت

بگو ای صفی با صفای تمام | بحق محمد علیه السلام
بحق علی صاحب ذوالفقار | سپهدار دین شاه دلدل سوار
بحق حسین و بحق حسن | که هستند شایستهٔ ذوالمنن
بخاتون صحرای روز قیام | سلام علیهم علیهم سلام
کز اسرار این نکته دلگشای | صفی را زصفّوت صفایی نمای
صفی چون بکرد این دعا از صفا | درودی فرستاد بر مصطفی
در خانه هم درزمان بازشد | صفی از صفایش سر انداز شد
یکی تخت در چشمش آمد ز دور | سراپای آن تخت روشن زنور
نشسته برآن تخت مر دختری | چو خورشید تابان بلند اختری
یکی تاج بر سر منور ز نور | زانوار او حور یان را سرور
یکی طوق دیگر بگردن درش | بخوبی چنان چون بود درخورش
دو گوهر بگوش اندر آو یخته | زهر گوهری نوری انگیخته
صفی گفت یا رب نمی دانمش | عنایت بخطی که برخوانمش
خطاب آمد اورا که از وی سؤال | بکن تا بدانی توبر حسب وحال
بدو گفت من دخت پیغمبرم | باین فر فرخندگی در خورم
همان تاج برفرق من باب من | دو دانه جواهر حسین و حسن
همان طوق در گردن من علی است | ولی خدا و خدایش ولی است
چنین گفت آدم که ای کرد گار | درین بار گه بنده راهست بار
مرا هیچ از اینها نصیبی دهند | از ین خستگیها طبیبی دهند
خطابی بگوش آمدش کای صفی | دلت در وفا های عالم وفی
که اینها به پاکی چوظاهر شوند | بعالم به پشت تو ظاهر شوند
صفی گفت با حرمت این احترام | مرا تا قیام قیامت تمام

مهمان نوازیٔ رسولؐ از طرف فاطمه (س)

باز بر اطراف باغ از چمن گل عذار | مجمره پر عود کرد بوی خوش نو بهار
مقنعه بربود باد از سر خاتون گل | برقع خضرا گشود از رخ گل پرده دار
مریم دوشیزه بود غنچه زآبستنی | درپس پرده زدلتنگی خود شرمسار

سرو سهی ناز کرد سرکشی آغاز کرد   سنبل تر باز کرد نافهٔ مشک تتار
گل چه رخ نیکوان تازه وترو جوان   مرغ بزاری نوان برطرف مرغزار
برصفت حسب حال گشته قوافی سگال   بلبل وامق عذار بر گل عَذرا عذار
ناله کنان فاخته تیغ زبان آخته   سرو سر افراخته چون قد دلجوی یار
بادریا حین فروش خاک زمین حُله پوش   لاله شده جرعه نوش در سر نرگس خمار
برق ثواقب فروغ تیغ کشان از سحاب   ز آتش دل میغ راچشم سیه اشکبار
از پی زینت گری لعبت ایام را   لاله شده سرمه دان گل شده آینیه دار
از دل خارای سنگ آمده بیرون عقیق   لاله رخ افروخته بر کمر کوهسار
بوی بنفشه بباغ کرده معطر دماغ   لاله خور ز ین چراغ در دل شبهای تار
یاقلم من فشاند بر ورق گل عبیر   یا درجنت گشاد خازن دارالقرار
یا مگر از تربت دختر خیر البشر   باد سحرگه فشاند بر دل صحرا غبار
مَطْلَعَةُ الْکوکَبین نَیَّرَةِ النَّیرَّیَنِ   سیدةُ الْعالَمِینَ بَضْعَه صدرالکبار
ماه مشاعل فروز شمع شبستان او   ترک فلک پیش او جاریهٔ پیش کار
ریشه کش معجرش مفتخرات الخیام   رایحهٔ چادرش نفحهٔ عودِ وقمار
کسوت استبرقش اطلس نه توی چرخ   سندس والای اوشَعری شِعَری شعار
پردگی عصمتش پرده نشینان قدس   کرده بخاک درش خلد برین افتخار
رُفته بجار وب زلف خاک درش حورعین   طرهٔ خوشبوی را کرده از آن مشکبار
آنچه زگرد رهش داده برضوان نسیم   روشنی چشم را برده حواری بکار
در حرمِ لا یزال ازپی کسب کمال   خدمت او خالدات کرده بجان اختیار
مطبخیان سپهر هر سحری می نهند   بر فلک از خان او قرصهٔ گاور سه دار
باشرف شرفهٔ طارم تعظیم او   کنگره نه فلک کم زیکی کو کنار
در حرم عرش او از پی زینتگری   هندوی شب وسمه کوب صبح سپید اب کار
زهرهٔ جادو فریب از سردست آمده   پیش کش آورد پیش هدیه او را سوار
معجر سر فرقَدین تحفه فرستاده پیش   مشتری انگشتری داده ومه گوشوار
زهره بسوری او رفت بدار السرور   بست بمشاطگی در کف حوران نگار
در شب تزویج او چرغ جواهر فروش   کرد بساط فلک پر دُرَر آبدار
پرده نشینان غیب پرده بیاراستند   گلشن فردوس شد طارم نیلی حصار
بس که جواهر فشاند کوکبهٔ در موکبش   پرده گلریز گشت پر گهر شاهوار

مشعله داران شام بر سر بام آمدند مشعله افروز شد هندوی شب زنده دار

گشت مزین فلک سدره نشین شد ملک تا همه روحانیان یافت بیکجا قرار

جَلّ تعالی بخواند خطبهٔ تزویج او باولی الله علی بر سر جمع آشکار

روح مقدس گواه باهمه روحانیان مجمع کَرّوبیان صف زده بر هر کنار

خازن دارالخلود خلد جنان در گشود تا بتوانند کرد زمرهٔ حوران نظار

همچو نسیم بهشت خواست نسیمی زعرش کز اثر عطر اوگشت هوا مشکبار

باد در سد ره زدبر سر حورای عین لؤلؤو مرجان بریخت از سرهر شاخسار

خیمه نشینان خلد بسکه بچیدند دُرّ مرهمه راگشت پر معجرو جیب وکنار

اینت عروسی وسوراینت سرای سرور اینت خطیب وگواه اینت طبق بانثار

ای بطهارت بتول لالهٔ باغ رسول کوکب توبی فضول عصمت توبی عوار

بابکَ بدرالدجا زوجِکَ خیرالتقی اَنَّکَ فخر النسِا چشم وچراغ تبار

مقصد عالم توئی زینت آدم توئی عفت مریم توئی اَخْیَرِ خیر الخیار

مام حسین وحسن فخر زمین وزمن همسر توبو الحسن تازی دلدل سوار

ای که نداری خبر از شرف وقدر او یک ورق از فضل اوفهم کن وگوش دار

بروَرقی یافتم از خط بابای خویش راست چوبر برگ گل ریخته مشک تتار

☆☆☆

بود که روزی رسول بعد نماز صباح روی بسوی علی کرد که ای شهسوار

هیچ طعامیت هست تابضیافت رویم نام تکلف مبر عذر توقف میار

گفت که فرمای تا جانب خانه رویم خواجه روان گشت و شاه براثرش اشکبار

زانکه بخانه طعام هیچ نبودش گمان تا بدر خانه رفت جان ودل از غم فکار

پیش درون شد علی رفت بر فاطمه گفت پدر بر دراست تا کند اینجا نهار

فاطمه دلتنگ شد زانکه طعامی نبود کرد اشارت بشاه گفت پدر را درار

باحسن و باحسین هر دوبه پیش پدر باش که من بنگرم تاچه گشاید زکار

خواند انس را وداد چادر عصمت بدو گفت ببازار بربی جهت انتظار

تا بفروشم بزروزثمن آن برم طرفه طعامی لطیف پیش خداوند گار

شد پدرم میهمان چادر من بیع کن از ثمن آن برم زود طعامی بیار

چادر پشم شتر بافته وتافته — از عمل دست خود رشته ورا پود وتار

چادر زهرا انس برد وبد لالّ داد — برسر بازار شهر تاکه شود خواستار

مرد فروشنده چون جامه زهم بازکرد — یافت از و شعلهٔ نور چو رخشنده نار

جمله بازار از آن گشت پر از مشغله — زرد شد از تاب اوبالش خور برمدار

یکدو خریدار خواست وآن سه درم خواستند — وان سه درم رانکرد هیچکس آنجا چهار

بود جهودی مگر بردرد کانخویش — مهتر بعضی یهود محتشم ومالدار

چادر ودلال را بر درد کان بدید — نور گرفته از وشهر یمین ویسار

خواجه بدو بنگر یست گفت که این جامکک — راست بگوآنِ کیست راست بود رستگار

گفت که چادر انس داده بمن زوبپرس — واقف این چادر اوست من نیم آگه زکار

گفت انس راجهود قُصه چادر بگوی — گفت تو گرمیخری دست زپرسش بدار

گفت بجان رسول آنکه تویارویی — کین خبر از من مپوش راز نهفته مدار

سر بسوی گوش او برد بآ هستگی — گفت بگویم ترا گرتوشوی راز دار

چادر زهر است این دختر خیرالوری — فاطمه خیر النساء دختر خیر الخیار

شد پدرش میهمان هیچ نبودش طعام — داد بمن چادرش از جهة اضطرار

تا بفروشم بزروزثمن آن برم — طرفه طعامی لطیف پیش خداوند گار

خواجهٔ دِکان نشین عالِم تورية بود — دید بسوی کتاب دیده چوابربهار

از صحف موسوی چند ورق باز کرد — تاکه بمقصد رسید مرد صحایف شمار

روبسوی آنس کرد که این جامه من — از توخریدم بچار پاره درم یکهزار

قصه این چادر پردهٔ نشین رسول — گفته بموسی بطور حضرت پروردگار

گفته که پیغمبر دور پسین را بود — پرده نشین دختری فاطمهٔ باوقار

روزی از آنجا که هست مقدم مهمان عزیز — مر پدرش رافتد بر در حجره گذار

فاطمه را در سرا هیچ نباشد طعام — تا بنهد پیش باب خواجهٔ روز شمار

چادر عصمت برند تاکه طعامی خرند — وزسه درم بیش و کم کس نبود خواستار

مُخلِص من دوستی چار هزارش درم — بدهد ودروجه آن نقره بوزن عیار

ذکر قسم میکنم من بخدائی خویش — از قسمی کان بود ثابت و سخت استوار

عزت آن چادر از طاعت کرّوبیان — پیش من افزون بود از جهت اقتدار

خاصه ترا یکهزار درهم دیگر دهم — لیک مرا حاجتیست گربتوانی برآر

من چونبی رابسی کرده ام ایذا کنون — هست سیاه از حیاروی من خاکسار

روی بدو کردنم، روی ندار دولیک
در حرم فاطمه خواهش من عرضه دار

گر بغلامی خویش فاطمه بپذیردم
عمر بمولائیش صرف کنم بنده وار

رفت انس بازپس تابحریم حرم
بر عقب او جهود با دل امیدوار

گفت انس رایهود چون برسی در حرم
خلعت او عرضه کن تاکه مرا هست بار؟

رفت انس در حرم قصه به زهرا بگفت
گفت که تامن پدر راکنم آگه زکار

فاطمه پیش پدر حال یهودی بگفت
گفت پذیر فتمش گوانس او رادرآر

شدانس آواز داد تاکه درآید یهود
یافته اندر دلش نور محمد قرار

سر بنهاد آن جهود برقدم عرش سا
کرد زخاک درش فرق سرش تاجدار

لفظ شهادت بگفت باز برون شدز کو
طوف کنان برز بان نام خداوند گار

چون بغلامی تومعتقد ومخلصم
در حرمت زان یهود حرمت من کم مدار

تا که بود نور ونار روشن و سوزنده باد
قسم محب تو نور قسط عدوی تونار

می شد ومیگفت کیست همچو من اندر جهان
از عرب و از عجم دولتی وبختیار

فاطمه مولای من دختر خیر البشر
من بغلامی او یافته این اعتبار

برسر بازار وکوی بود دراین گفت وگوی
تاکه بگسترده شد ظلّه نصف النهار

چار هزار از یهود هشتصد وافزون برو
مؤمن و دین و رشدند عابد و پرهیزگار

روح قدس در رسید پیش رسول خدا
گفت هزاران سلام برتوز پروردگار

موجب و مستوجب خشم خدا گشته بود
چند هزار از یهود چندهزار از نصار

برکت مهمانی دختر تو فاطمه
داد زنار سموم این همه راز ینهار

ای که بعصمت توئی مطلع انوار قدس
از زلل ومعصیت دامن توبی غبار

ورد زبان ساخته نعمت تو ابن حسام
تا بودش در بدن مرغ روان را قرار

☆☆☆☆☆

اولادِ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ

(آل عمران:۳۴)

بعض کی اولاد کو بعض سے (فضیلت دی)

جیسا کہ تاریخ اسلام سے آگاہ ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی حضرت علی علیہ السلام سے اولاد تھی. جن میں دو بیٹے حسن اور حسین علیہما السلام اور دو بیٹیاں زینب اور ام کلثوم تھیں.

مؤرخین اور سیرت نگاروں میں سے کسی ایک کو بھی ان چار بچوں کے بارے میں کوئی شک و تردید نہیں ہے۔ امام حسن علیہ السلام تیسری ہجری میں ۱۵ رمضان المبارک اور امام حسین علیہ السلام چوتھی ہجری میں ماہ شعبان میں پیدا ہوئے.

سوانح عمری لکھنے والے شیعوں اور بعض علماء اہل سنت نے رسول خدا کی بیٹی کی ایک اور اولاد نرینہ جس کا نام محسن ہے، لکھی ہے۔ "نسب قریش" کے مصنف مصعب زبیری متوفی ۲۳۶ ہجری نے محسن کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن بلاذری متوفی ۲۷۹ ہجری لکھتے ہیں:

> فاطمہ کے بطن سے علیؑ کے بیٹے حسن، حسین، اور محسن علیہم السلام پیدا ہوئے. محسن بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ (۱)

نیز وہ لکھتے ہیں:

> جب محسن پیدا ہوئے تو رسالت مآبؐ نے جناب فاطمہ (س) سے پوچھا اس کا کیا نام رکھا ہے؟ انہوں نے کہا "حرب" نام رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ان کا نام محسن ہے۔ (۲)

---

(۱) انساب الاشراف ص ۴۰۲

(۲) ایضاً ص ۴۰۴

کتاب جمھرۃ انساب العرب کے مؤلف علی بن احمد بن سعید اندلسی (۳۸۴۔۴۵۶) نے لکھا ہے: محسن بچپن میں فوت ہو گئے۔(۱)

شیخ مفید نے جناب فاطمہ (س) کے بطن سے حضرت علی علیہ السلام کی اولاد کو یوں شمار کیا ہے:

> حسن، حسین، زینب کبری و زینب صغری جن کی کنیت ام کلثوم ہے۔(۲)

اسی باب کے آخر میں وہ اضافہ کرتے ہیں:

> شیعوں سے نقل ہوا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد فاطمہ زہرا(س) کا ایک بیٹا سقط ہوا۔ جب وہ ماں کے شکم میں تھا تو اس کا نام محسن رکھا۔ (۳)

طبری یوں لکھتے ہیں:

> کہتے ہیں کہ علیؑ کا فاطمہ (س) سے ایک اور بیٹا محسن بھی تھا جو بچپن میں فوت ہو گیا۔
>
> شیعہ روایات اور بعض سنی کتب میں موجود ہے کہ رسول اللہؐ کی رحلت کے بعد ان پر آشوب ایام میں فاطمہ زہرا(س) پر جو مصیبت گزری اس کی وجہ سے ان کا بیٹا سقط ہو گیا۔(۴)

جناب زہرا(س) کے ان چار بیٹوں اور بیٹیوں کی زندگی کے بارے میں مختلف زبان میں کئی کتابیں اور مقالے لکھے گئے ہیں۔ مصنف کے اس سلسلہ کتب میں قارئین امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے حالات زندگی تفصیلاً پڑھیں گے۔

☆☆☆☆☆

---

(۱)جمھرۃ انساب العرب ص۱۷

(۲)ارشاد شیخ مفید ج۱ص ۳۳۵

(۳)ایضاً ص ۳۵۶۔ کشف الغمہ ج۱ص ۴۴۰۔۴۴۱

(۴)الملل والنحل ج۱ص ۷۷

حضرت زینب سلام اللہ علیہا

قوی احتمال کی بناء پر حضرت زینب (س) کی ولادت ششم ہجری کو ہوئی ہے۔ اگر یہ احتمال درست ہو تو جب سے انہوں نے ہوش سنبھالا اور شعوری زندگی میں قدم رکھا، مصائب و آلام سے ان کا واسطہ پڑا۔ پانچ سال کی عمر میں رسولؐ خدا کی جدائی کا صدمہ پیش آیا اور اس کے فوراً بعد وہ افسوسناک اور غمناک واقعات جو گھر کے اندر اور باہر رونما ہوئے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد ماں کو بستر بیماری پر دیکھا۔ رسولؐ اللہ کی جدائی میں ان کے آنسوؤں کی لڑیوں کو دیکھا۔ ان کی آہ وفریاد کو سنا۔ لوگوں کی طرف سے ماں پر ظلم و ستم ہوتے ہوئے دیکھا اور ماں کو شکوہ کرتے ہوئے سنا۔ آخر کار دکھیاری ماں کی آنکھیں بند ہوئیں۔ اس صدمے سے بڑھ کر خوف وہراس کی کیفیت ان پر طاری تھی کہ ہر کام خاموشی سے کیا جارہا ہے، بچوں کو اونچی آواز سے ماں پر رونے کی اجازت نہیں تھی، مبادا ہمسائے ان کے رونے کی آواز سن لیں اور وہ دوسروں کو اس خبر سے آگاہ کر دیں اور وہ لوگ رسول زادی کے جنازے پر آجائیں اور یوں علی علیہ السلام فاطمہ زہرا(س) کی وصیت پر عمل نہ کرسکیں۔ خدا کی تقدیر، دونوں ماں بیٹی کی تربیت ایک طرح سے ہوئی۔ انہیں بھی یکے بعد دیگرے سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا تاکہ سخت اور مشکل ترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادگی پیدا ہو جائے. جب حضرت زینب(س) سن بلوغ کو پہنچیں تو عبد اللہ بن جعفر کے ساتھ ان کی شادی ہو گئی۔ عبداللہ حبشہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے حق میں حضور پاکؐ نے دعائے خیر فرمائی تھی۔(۱) تمام سیرت نگاروں نے ان کی شرافت و بزرگی، عزت نفس خصوصاً بہت زیادہ سخاوت کے اوصاف کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔

حضرت زینب کی حضرت عبداللہ سے اولاد ہوئی۔ مصعب زبیری نے ان کی تعداد تین بیٹے

---

(۱) الاصابہ ج ۳ ص ۳۸

اور ایک بیٹی بیان کی ہے۔ بیٹے جعفر، عون اور اکبر جن کی آگے نسل نہیں چلی اور علی کہ حضرت عبداللہ کی تمام نسل اسی بیٹے سے بڑھی اور لڑکی ام کلثوم تھیں جن سے معاویہ اپنے بیٹے یزید کی شادی کرنی چاہتا تھا۔ عبداللہ نے ام کلثوم کا معاملہ امام حسین علیہ السلام کے سپرد کردیا۔ انہوں نے ان کی شادی قاسم بن محمد بن جعفر بن ابی طالب سے کی۔(۱) طبری مرحوم نے اعلام الوری میں بھی عبداللہ کی یہی اولاد یعنی تین لڑکے اور لڑکی لکھی ہے۔(۲) لیکن مشہور یہ ہے کہ ان کے بیٹے علی، محمد، عون اور عباس تھے۔

جناب زینب عبداللہ کی زوجہ تھیں۔ ان کے گھر میں رہتی تھیں۔ ان کے بچے بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود اپنی ماں کی طرح اپنے باپ کی خدمت کو فراموش نہ فرماتیں۔ جب حضرت علی علیہ السلام نے طلحہ و زبیر کی لگائی ہوئی آگ، جنگ جمل، کو ٹھنڈا کرنے کے لئے عراق کا سفر اختیار کیا تو حضرت زینب بھی اپنے شوہر عبداللہ کے ہمراہ کوفہ تشریف لے گئیں اور وہیں قیام کیا۔ عراق میں جناب زینب نے عجیب اور دلخراش مناظر دیکھے۔ باپ کی ایسے گروہ کے ساتھ جنگ کو ملاحظہ کیا جو بصرہ میں اکٹھا ہوا تھا اور ان کی قیادت ایک ایسی شخصیت کر رہی تھی جو کل تک تو عثمان کو مدینہ کے یہودی (نَعثَل) سے تشبیہ دیتی اور اس کے قتل ہونے کی آرزو کرتی تھی۔ آج وہی خون عثمان کا انتقام لینے کے لیے علی علیہ السلام کے مقابلے پر آ گئی۔ جناب زینبؑ نے جنگ صفّین اور اس میں دنیا کے چالبازوں کو بھی دیکھا جو ظاہر میں علیؑ کے ساتھ تھے لیکن خفیہ طور پر معاویہ سے ملے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مقدس مآبوں اور قرآن کے قاریوں (خوارج) کی علیؑ کے ساتھ جنگ کا مشاہدہ کیا۔ آخر کار انیس رمضان المبارک کو مسجد کوفہ کے محراب میں علی علیہ السلام کا خون سے رنگین چہرہ دیکھا اور اس صدمہ کو برداشت کیا۔ اس کے بعد لوگوں کی امام حسنؑ سے بیعت کی چشم دید گواہ بنیں اور پھر انہی لوگوں کو بیعت توڑتے ہوئے امام حسنؑ پر حملہ کرتے اور ان کا خیمہ گراتے ہوئے بھی دیکھا۔ لوگوں کی بغاوت اور بھائی کی ران کو زخمی کرنے کو ملاحظہ کیا۔ اپنے بھائی حسنؑ کی مجبوری اور بے بسی دیکھی اور اسی بے بسی کے عالم میں بادلِ نخواستہ امام حسنؑ کا معاویہ سے صلح کا معاہدہ کرنا اور اس سے صلح کے بعد دوست نما دشمنوں کی باتوں سے طعن و تشنیع کے زخم برداشت کرنا بھی دیکھا(۳)۔

اس وقت تک حضرت زینبؑ اپنی عمر کے تیس سے زائد سال گزار چکی تھیں اور ماں کے بقول ''زمانے کے شکم میں کیا کیا نیرنگیاں چھپی ہوئی ہیں اور وہ کیا کیا تماشے (ایک کے بعد دوسرا)

---

(۱) نسب قریش ص ۸۲

(۲) اعلام الوری ص ۲۰۴

(۳) تحلیلی از تاریخ اسلام از مؤلف ھذا ج ۲

نکالتا ہے'' واقعات و حادثات یکے بعد دیگرے رونما ہوئے۔ ان غموں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لیے فولاد جیسی سختی اور پہاڑ جیسی ہمت درکار ہے اور زینب بردباری، تحمل اور برداشت کا نمونہ ہیں۔

آخر کار علی علیہ السلام کا گھرانہ کوفہ سے مدینہ واپس آجاتا ہے۔ کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ زینب نے اپنے بڑے بھائی کو بستر مرگ پر زہر کے درد سے کروٹیں بدلتے ہوئے دیکھا۔ دوسرے دن اس سے بھی بڑا دلخراش اور اندوہناک منظر دیکھا۔ وہ لوگ جو حضرت رسول خداؐ کا جناب فاطمہ (س) کی طرف دیکھ کر محبت سے مسکرا دینا بھی گوارہ نہیں کر سکتے تھے ان کے دلوں میں زہرا(س) سے دشمنی اور بغض اب بھی موجود ہے۔ ان کے دلوں سے زہرا (س) کے خلاف حسد و کینہ کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی ہے۔ لہذا انہوں نے ماں کا انتقام بیٹے سے لینے کی ٹھان لی۔ یہاں تک انہوں نے زہرا (س) کے لخت جگر کو اپنے جدامجد کے پہلو میں دفن نہ ہونے دیا۔

مشکلات و مصائب کے دس سال اور گزر گئے۔ ان سالوں میں حکومت شام کے کارندوں نے عراق اور حجاز کے تمام شہروں میں شیعیان علیؑ کا تعاقب کیا۔ انہیں گالیاں دیں۔ انہیں اذیتیں دی گئیں، انہیں مارا پیٹا گیا۔ انہیں زندانوں میں ڈالا اور بے دریغ قتل کیا گیا۔ یہاں تک کہ معاویہ کے مرنے کی خبر پہنچی۔ اہل عراق کے لیے دوسرے علاقوں کی نسبت یہ خبر باعث خوشی تھی۔ کوفہ میں جلسے ہونے لگے۔ مقررین کھڑے ہو کر اونچی آواز اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ لوگوں کو اپنی بات ذہن نشین کرانے کی بھرپور کوشش کرنے لگے کہ ''ہم یزید کو امیر المومنین نہیں بننے دیں گے۔ یہ حق خداوند کی طرف لوٹنا چاہیے۔ جب تک نواسہ رسول موجود ہیں ہمیں ابو سفیان کے پوتے کی کیا ضرورت ہے؟''

کوفہ سے مسلسل پے درپے مدینہ میں خطوط آرہے ہیں: یابن رسول اللہ جتنی جلدی ہو سکے ہمارے پاس آیئے۔ اگر نہیں آئیں گے تو خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے''۔

حسین علیہ السلام مکہ سے عراق روانہ ہوئے۔ ادھر جب زینب (س) کے شوہر عبداللہ نے امام حسینؑ کا یہ حال دیکھا تو وہ تگ ودو کرنے لگے۔ انہوں نے ایک طرف دیکھا کہ اس شہر میں ان کے چچازاد اور برادر نسبتی حسین علیہ السلام کو خطرہ لاحق ہے اور امان نہیں ہے۔ دوسری طرف وہ اس سے پریشان ہیں کہ کوفہ والے ان کے ساتھ ان کے باپ اور بھائی جیسا سلوک نہ کریں۔

لہذا عبداللہ نے شہر کے حاکم عمرو بن سعید کے پاس جا کر اس سے امام حسین علیہ السلام کے لئے امان نامہ حاصل کیا جس کی عبارت یہ ہے:

میں نے سنا ہے کہ آپ نے عراق جانے کا ارادہ کیا ہے۔ خدا کے لیے افتراق و انتشار سے بچیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ راستے میں مارے نہ

جائیں ۔ میں عبداللہ بن جعفر اور اپنے بھائی یحیٰ بن سعید کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں تا کہ وہ آپ کو بتائیں کہ آپ امان میں ہیں اور آپ کو میری مدد اور تعاون حاصل ہو گا۔ میری جانب سے آپ کے ساتھ اچھا اور نیک سلوک کیا جائے گا۔

عبداللہ اور حاکم مکہ کے بھائی نے اس امان نامے کو امام حسین علیہ السلام تک پہنچایا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے امان نامے کا جواب امام حسینؑ کی جانب سے کیا ہو گا:

جو شخص لوگوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی طرف بلائے، نیکی اور تقویٰ کو اپنا شعار بنائے، وہ ہرگز افتراق پھیلانے والا نہیں ہے۔ اس نے خدا اور رسولؐ کی ہرگز مخالفت نہیں کی۔ بہترین امان خدا کی امان ہے۔ جو اس دنیا میں اللہ سے نہ ڈرے وہ قیامت کے دن اللہ کی امان میں نہیں ہو گا۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میں دنیا میں اس سے خوف کھاؤں تا کہ آخرت میں اس کی امان اور پناہ مجھے حاصل ہو۔ (۱)

قافلہ مکہ سے باہر نکلتا ہے۔ زینبؑ بھی قافلے کے ہمراہ ہیں۔ جب عبداللہ نے دیکھا کہ امام علیہ السلام نے عراق جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے اور اس سفر سے ہرگز نہیں رکیں گے تو اپنے بیٹوں عون اور محمد کو ان کے ساتھ کر دیا۔

دمشق نے کئی مہینوں سے عراق کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ باالفاظ دیگر یوں کہیں کہ عراق کے موقع پرستوں نے (وہی موقع پرست جنہوں نے امام علیہ السلام کو کوفہ آنے کے لیے خطوط لکھے تھے) حکومت شام کو آنے والے طوفان سے باخبر کر دیا تھا۔ یزید نے تمام لازمی تدابیر اختیار کر لی تھیں۔ اس نے ایک ظالم، بے تقویٰ، بے رحم، بے اصل و نسب شخص کو کوفہ کا حاکم بنا کر بھیجا۔ عبید اللہ ابن زیاد نے امام حسینؑ کے نمائندے مسلم بن عقیل، ان کے میزبان ہانی بن عروہ کو شہید کر دیا اور لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔ اس کے مسلح سپاہیوں نے حجاز اور عراق کے راستوں کی ناکہ بندی کر دی۔ چنانچہ امام حسین علیہ السلام منزل شُراف سے تھوڑے سے فاصلے پر حاکم کوفہ کی طرف سے حر بن زیاد ریاحی کے لشکر کے روبرو ہوئے۔ حر نے نئے فرمان کے آنے تک کربلا کی سر زمین پر آپ کو روکے رکھا۔

محرم کے ان ابتدائی کٹھن، دشوار اور خوف و ہراس سے بھرپور ایام میں کم از کم کچھ لوگوں سے امیدیں وابستہ تھیں۔ اس کے بعد نو محرم کی عصر سے لے کر دوسرے دن شام غریباں

---

(۱) پس از پنجاہ سال ص ۷، ۱۴ طبع دوم

تک کیا گزری، اس سے آپ کم و بیش آگاہ ہیں۔۔ نیز اسی سلسلۂ کتب میں امام حسینؑ کی زندگی کے بارے میں آپ ان واقعات کی زیادہ تفصیل پڑھیں گے۔ کرب و اذیت کے اس ماحول میں زینب کی کیا ذمہ داری بنتی تھی اور انہوں نے کس طرح اپنی شخصیت کو پیش کیا اور اس ذمہ داری کو کس طرح نبھایا یہ ایسی چھپی بات نہیں جس سے آپ آگاہ نہ ہوں۔ لیکن ان کی خاص ذمہ داری کا آغاز سنہ ۶۱ ہجری محرم کی عصر عاشورہ کو ہوا۔

روز عاشورہ اختتام کو پہنچا۔ مال و دولت کی محبت، جاہ و منصب کے لالچ یا حسد و کینہ اور انتقام کی آگ نے جن بدمستوں کو اندھا کر دیا تھا وہ اپنے آپ میں آئے۔ انہوں نے کیا کیا؟ اتنا بڑا کام! اتنا برا کام! جس کی مثال پوری تاریخ عرب میں نہیں ملتی۔ مہمان کو قتل کرنا، اس قوم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی ذلت مقصود نہیں ہو سکتی اور وہ بھی اس بے رحمی اور ظلم کے ساتھ! اس سے انہیں کیا ملا؟ کچھ بھی نہیں۔ کیوں کچھ نہیں! اس مہمان کو قتل کر کے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا، وہ کیا تھا؟ شام کے مقابلے میں کوفہ کی ذلت و خواری، نہ صرف ایک بار بلکہ چند بار کی ذلت۔ اب کیا کریں اور کہاں جائیں؟ ان کے لئے سب راہیں مسدود ہو گئیں۔ سوائے ایک راہ کے یعنی ننگ و عار، ذلّت و خواری کہ یہ قافلہ مجبوراً اسے انتہا تک پہنچائے۔ اس راستے کا آغاز غاضریہ سے ہوا اور حاکم کوفہ کے محل تک، پھر وہاں سے شروع ہو کر دمشق کے سبز محل تک اختتام پذیر ہوا۔ عراقی قافلے کو (کوفہ میں) ایسے شخص کے سامنے پیشانی بذلت زمین پر ٹیکنا تھی جس کے باپ دادا کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اس کے بعد اسی طرح سر جھکائے ناک زمین پر رگڑتے ہوئے شام تک جانا ہے۔ وہاں پہنچ کر ہند کے بیٹے کے دربار میں کھڑے ہو کر یہ کہنا تھا:

> کل تیرے باپ کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالا تھا آج تیرے حضور دست بستہ کھڑے ہیں اور تیرے حلقہ بگوش ہیں۔ اب جو تو کہے گا وہ تیرا حکم ہو گا جو تو سوچے گا وہ تیرا لطف ہو گا۔"

یہ عراقی قافلے کی سوغات ہے۔

لیکن مدینہ کا بچا کچھا قافلہ بھی خالی ہاتھ نہ تھا۔ اس کے ہاتھ پُر تھے۔ ان کے ہاتھ عراق اور حجاز کی وسعتوں کے برابر، نہیں جزیرۃ العرب کے برابر بلکہ عالم اسلام کی وسعتوں کے برابر گراں بہا متاع سے بھرپور تھے۔ ان کے ہاتھ میں عزت و شرف، عظمت و بزرگی، افتخار، حریت، کرامت انسانی اور شہادت جیسی مال و متاع تھی۔ لیکن اس مال کا خریدار نہ کوفہ تھا نہ شام۔ وہاں مرد اور مردانگی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی اور شہادت کے خریدار تو مرد ہوتے ہیں اور بقول پیر میہنہ:

> چوب به عیاران چرب کنندبنا مردان چرب نکنند (اسرار التوحید، ص ۵۸)
>
> مردوں سے مقابلہ کیا جاتا ہے نہ کہ نامردوں سے

کوفہ اور شام کے محلوں میں رہنے والے ان کاخ نشینوں کے گرد جمع ہونے والے نامرد تھے جوان مرد نہ تھے۔

اس گرانقدر متاع کو عورتوں اور چھوٹے بچوں پر مشتمل قافلے نے اٹھایا ہوا تھا جن کے پاؤں میں زنجیریں تھیں اور ہاتھ پس گردن بندھے ہوئے تھے۔ یہ قافلہ ایک خاتون کی سالاری میں تھا۔ جسے بجا طور پر ''کربلا کی شیر دل خاتون'' کا لقب دیا گیا ہے۔(۱)

سالار قافلہ نے اپنی اس گراں بہا جنس کو ہر دو مقامات (کوفہ و شام) پر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس لئے نہیں کہ کوئی خریدار بن جائے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ اس جنس کے خریدار نہیں ہیں بلکہ اس لئے پیش کیا تاکہ پانچ سال بعد اس کی قیمت لگے اور بازار گرم ہو۔ پہلے شہر کوفہ میں، پھر مدینہ، پھر شام، خوزستان، خراسان میں اس کی مارکیٹ بنی۔ آخر کار خراسانیوں کے تابڑ توڑ حملوں نے ان نامردوں کو اپنے کیفر کردار تک پہنچایا۔ نامرد کبھی تختہ دار پر نہیں چڑھتے۔ یہ مردار پاؤں سے پامال کئے جاتے ہیں۔ یہ وہ دن تھا جب عباسی خلیفہ کے حکم پر امویوں کے نیم جان لاشوں پر فرش بچھایا گیا۔ اس پر دستر خوان چنا گیا اور خلیفہ وقت اس پر کھانا کھانے بیٹھا۔(۲) قافلہ اور سالار قافلہ بازار کوفہ میں داخل ہوئے۔ کوفہ کا حاکم یہ چاہتا تھا کہ اسی طرح قیدیوں کا تماشہ دکھا کر لوگوں کے سامنے علیؑ کی بیٹی اور خاندان ہاشم کو ذلیل و رسوا کرے اور اس طریقے سے ان پر اپنی قوت و طاقت کا رعب مزید جمائے۔ انہیں بتائے کہ تمہارے شہر کے سابق حاکم کی بہو بیٹیاں ہیں۔ آج میرے حکم سے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہاتھ پس گردن بندھے ہوئے پابہ زنجیر شہر کے گلی کوچوں میں پھرائی جا رہی ہیں اور انہیں تازیانے لگائے جا رہے ہیں۔

یہ ابن زیادہ کی آرزو تھی۔ لیکن خدا کا ارادہ کچھ اور تھا۔ شہر کے بوڑھے جوان سب گلیوں میں جمع ہو گئے تھے۔ مشہور ضرب المثل ہے: ''تیز بخار پسینہ بھی جلدی لاتا ہے۔'' جو لوگ جلد غصے میں آتے ہیں جلد پشیمان بھی ہوتے ہیں۔

دریائے فرات کے کنارے بسنے والے اس خصوصیت کے بہت زیادہ حد تک حامل تھے۔ ایک بات سن کر فوراً جذبات میں آ جاتے اور دشمن بن جاتے۔ دوسری بات سن کر ٹھنڈے ہو جاتے اور بھائیوں سے زیادہ مہربان ہو جاتے۔

حضرت زینب(س) کوفہ والوں کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ جن خواتین کی عمریں تیس سال اور اس سے زیادہ تھی، انہوں نے مسلمانوں کی نظروں میں زینبؑ کے مقام و منزلت کا مشاہدہ کیا تھا۔

---

(۱) درباره زینب (ع)

(۲) تحلیلی از تاریخ اسلام طبع دوم

انہوں نے دیکھا تھا کہ زینب(س) اپنے باپ کے نزدیک کس شان و عظمت کی مالک تھیں۔

زینب کبریٰ (س) اور دوسرے اسیروں کی رقت انگیز حالت میں بازار کوفہ میں آنے سے گزشتہ یادیں تازہ ہو گئیں۔ عورتوں نے آہ و فغاں کی اور مردوں کو بھی رلایا۔ عورتوں اور بچوں کے کہرام سے بچوں کی آہ و زاری کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ہر طرف سے آہ و بکا کی صدائیں آنے لگیں۔ یہاں پر اس جذباتی منظر کو عروج پر پہنچنا چاہیے تا کہ لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ دیکھیں کہ انہوں نے کیا کیا ہے؟

اسیروں میں سے کون اس ذمہ داری کو نبھا سکتا ہے۔ علیؑ کی بیٹی۔ علیؑ کی دو بیٹیاں تھیں۔ کون سی بیٹی؟ زینب (س) یا ام کلثومؑ۔ قدیم ترین روایت، جس میں یہ خطبہ نقل ہوا ہے اس نے ام کلثومؑ کا ذکر کیا ہے۔ مؤلف نے خود اپنی کتاب (۱) میں ان روایات کی رو سے امانت کا خیال رکھتے ہوئے ان کا نام ام کلثوم لکھا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اس کتاب میں بھی لکھا ہے کہ ام کلثوم اس وقت زندہ نہیں تھیں۔ یہ اشتباہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ جناب زینب (س) کی ایک کنیت ام کلثوم ہے۔ انہیں ام کلثوم کبریٰ اور ان کی بہن کو ام کلثوم صغری کہتے تھے۔

بہر حال بازار کوفہ میں اپنے الفاظ کے ذریعے جس نے کوفہ والوں کو ناقابل فراموش درس دیا وہ زینب کبریٰ(س) تھیں۔ انہوں نے حمد الٰہی کے بعد فرمایا:

يَا اَهْلَ الْكُوفَه يا اَهْلَ الْخَتْرِ وَالْخَذا، لاَ ،فَلاَ رَقَاتِ الْعَبْرةُ ، وَلاَ هَدَأَتِ الرَّنَّةُ ، اِنَّمَا مَثَلُكُمْ كَمَثَلِ الَّتى نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوةٍ اَنْكَاثا ، تَتَّخِذُونَ اَيْمَانكُمْ دَخَلاً بَيْنَكُمْ الا، وَهَلْ فِيكُمْ اِلا الصَّلَفُ وَالشَّنَفُ ، وَمَلقُ الاِمَاء وَغَمْزُ الاَعْداء وَهَلْ اَنْتُمْ اِلاَّ كَمَرْعىً عَلى دِمْنَةٍ ،اَوَ كَفِضَّةٍ عَلى مَلْحُودَةٍ .اَلا سَاء ما قَدَّمَتْ لَكُمْ اَنْفُسكُمْ اَن سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ وَ فِى الْعَذاب اَنتُم خَالِدُون، اَتَبْكُون؟ اى وَاللّٰهِ فَابْكُوا، وَ اِنَّكُمْ وَ اللّٰهِ أحرِياء بالبكاء فَابْكُوا كثيراً، وَ اضْحَكُوا قليلاً فَلَقَدْ فذتم بِعارِها وَ شِنارِها . وَ لَنْ تُرْحِضُوها يغَسْلٍ بَعْدَها اَبداً.

اے کوفہ والو! دغا باز اور دھوکے باز لوگو! اے پست و ذلیل لوگو! روؤ اور خوب روؤ۔ تمہاری آنکھیں روتی رہیں اور تمہارے سینے غم سے جلتے رہیں۔ تمہاری مثال ایسی عورت جیسی ہے جس نے سوت کاتنے کے بعد اسے ریزہ ریزہ کر دیا ہو۔ تمہارے وعدے جھوٹے اور تمہارے ایمان کے چراغ بے نور ہیں۔ تم بلند و بانگ دعوے کرنے والے لوگ ہو۔ حیلہ باز ہو اور خود نما، دوست کے قاتل اور دشمن نواز۔ تم گندے پانی کے سبزہ کی طرح ہو جس کا باطن گندہ، بدبودار اور ظاہر سرسبز و رنگین۔ تم بدبخت قبر کی چاندی سے ملمع شدہ پتھر کی طرح ہو۔ کیا برا کام تم نے کر دیا؟ اللہ کے غضب کو آواز دی۔ تم آتش دوزخ میں ہمیشہ جلو گے۔ کیا تم رو رہے ہو؟ اور زیادہ گریہ کرو! تم اسی لائق ہو کہ روتے رہو۔ تم خوشی منانے کے لائق نہیں رہے۔ تم نے ذلت کی ایسی راہ کا انتخاب کیا ہے کہ زمانہ گزرتا جائے گا تمہاری ذلت کم نہیں ہو گی۔ تم اس ذلت کو کیسے دھو سکتے ہو

وَاَنّى تُرْحِضُونَ قَتْلَ سَلِيل خَاتَمِ النُّبُوَّة ، وَمَعْدِنِ الرِّسَالَةِ وَسَيدِّ شُبَّان أهْلِ الْجَنَّته، و مَنَار مَحَجَّتِكُمْ ، وَمِدْرَة حُجَّتِكُمْ ، ومَفْرح نَازلَتِكُمْ فَتَعْساً وَنُكْسا

تم فرزند رسولؐ کے قتل کا کیا جواب دو گے؟ جوانان جنت کے سردار کا قتل، جو تم ذلیل لوگوں کے لیے چراغ ہدایت تھا، جو مشکلات میں تمہارا ساتھی، مصائب میں تمہارا ہمدرد و غم خوار تھا۔ اے غدار لوگو! ہلاکت و نابودی تمہارے نصیب میں ہو۔

---

(۱) پس از پنجاہ سال ص ۱۸۲ طبع دوم

لَقَدْ خابَ السَّعْیُ وَخَسِرتِ الصَّفْقَةُ وَبُؤتُمْ بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰه ۔ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْکُم الذِلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ لَقَدْ جِئتُمْ شَیْئاً اِدّاً. تَکادُ السَّمٰواتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبالُ هَدّاً. أَتَدْرُونَ اَیَّ کَبِدٍ لِرَسُولِ اللّٰهِ فَرَیْتُم وَاَیَّ کَرِیمَةٍ لَهُ اَبْرَزْتُمْ وَاَیَّ دَمٍ لَهُ سَفَکْتُم؟ لَقَدْ جِئتُمْ بِهٰا شَوْهٰاء خَرْقٰاء ، شَرُّهٰا طِلاعُ الاَرْضِ وَالسَّمٰاء اَفَعَجِبْتُم أَنْ قَطَرتِ السَّمٰاء دَماً وَلَعَذٰابُ الاٰخِرَةِ أَخْزَیٰ وَهُمْ لاٰ یُنْصَرُونَ.

ہمیشہ تم گھاٹے میں رہو گے۔ اس سودے میں تم نے نقصان اٹھایا ہے۔ تم خدا کی ناراضگی میں گرفتار ہو اور ذلت و رسوائی کا طوق تمہاری گردن میں پڑا ہے۔ تم نے اتنا بڑا ظلم کیا ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آسمان پھٹ نہ پڑے اور زمین دھنس نہ جائے پہاڑ ریزہ ریزہ نہ ہو جائیں۔ جانتے ہو تم نے کس طرح رسول خدا کے جگر کو جلایا ہے۔ اور اس کی حرمت کو پامال کیا ہے؟ تم نے کونسا خون بہایا ہے؟ اپنا منہ کس چیز سے کالا کیا ہے؟ تم نے سوچے سمجھے بغیر وہ برا کام انجام دیا ہے جس کے شر سے زمین و آسمان لبریز ہیں۔ حیران نہ ہوں کہ آسمان کیوں خون آلود ہے اور وہاں نقصان اٹھانے والوں کا کوئی یار و مددگار نہ ہو گا۔

فَلاٰ یَسْتَخِفَّنَّکُمُ الْمَهَل، فَاِنَّهُ لاٰ تَحْفِزهُ الْمُبٰادَرَةُ. وَلاٰ یُخٰافُ عَلَیْهِ فَوْتُ الثّار. کَلّاٰ اِنَّ رَبَّک لَنٰا وَلَهُمْ لَبالْمِرصٰاد.

اس مہلت سے تم خوش فہمی میں نہ رہو کیونکہ خدا فوراً ظالموں کو کیفر کردار تک نہیں پہنچاتا۔ آخر کار مظلوم کی فریاد رسی کرتا ہے۔ وہ ہمارا اور تمہارا نگران ہے اور وہ گناہ گاروں کو دوزخ تک گھسیٹ کر لے جاتا ہے

اس کے بعد جناب زینب (س) نے ان سے منہ پھیر لیا اور ان سب کو حیران اور انگشت بدنداں کر دیا۔ قبیلہ بنی جعفی کے ایک بوڑھے شخص نے جس کی ریش آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی، کہا:

کُهُولُهُمْ خَیْرُ الْکُهُولِ وَ نَسْلُهُمْ   اذا عُدَّ نسلٌ لاٰ یَبُورُ وَ لاٰ یُخْزیٰ (۱)

ان کے بیٹے بہترین بیٹے ہیں۔ ان کا خاندان سربلند خاندان ہے

قیدیوں کو ابن زیاد کے دربار میں لے جایا گیا۔ اس جلسے میں اپنی قدرت و طاقت کی زیادہ سے زیادہ دھاک بٹھانے کے تمام وسائل پہلے سے فراہم کیے جا چکے تھے۔ قدرت اور طاقت کا یہ مظاہرہ خاندان پیغمبرؐ کو دکھانے اور کوفہ کے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے تھا۔ ابن زیاد نے اپنے وہم و گمان میں کامیابی کے تمام زینے طے کر لیے تھے۔ حسین علیہ السلام کو قتل کر دیا۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔ عراق کے شیعوں کے منہ پر مٹی مل دی تھی۔ اس کے بعد کسی کی جرات ہے کہ وہ نام علیؑ زبان پر لائے!

ابن زیاد نے پوچھا: یہ عورت کون ہے؟

جواب دیا گیا: زینب بنت فاطمہ (س)

ابن زیاد: خدا کا شکر ہے۔ دیکھا تم نے، خدا نے تمہیں کس طرح ذلیل و خوار کیا اور تمہارے جھوٹ کو آشکار کر دیا؟

---

(۱) بلاغات النساء طبع نجف ص ۲۳۔ جمہرۃ العرب ج۲ ص ۱۲۴۔۱۲۶۔ اعلام النساء ج ۲ ص ۲۵۹

ابن زیاد کو اپنی طاقت اور حکومت پر ناز تھا۔ طاقت اور قدرت نمائی کے لیے اس سے بدتر کوئی درد نہیں ہے کہ اسے کچھ نہ سمجھا جائے اور لوگوں کے سامنے اس کی تذلیل و تحقیر کی جائے۔

علیؑ کی بیٹی نے اس طرح بولنا شروع کیا گویا کوئی واقعہ رونما ہی نہیں ہوا۔ جیسے نہ ان کا بھائی اور دیگر یار و انصار مارے گئے ہوں، نہ انہیں دوسری عورتوں اور بچوں کے ساتھ قیدی بنایا گیا ہو اور نہ انہیں اس خونخوار اور اس ذلیل آدمی کے سامنے لا کھڑا کیا گیا ہو۔ بلکہ یوں لگتا تھا جیسے یہ محفل ایک علمی مناظرے کے لیے سجائی گئی ہو:

خدا کی حمد و ثنا ہے کہ اس نے حضرت محمدؐ کے ذریعے ہمیں عزت بخشی۔
فاسق جھوٹ بولتے ہیں اور بدکار رسوا ہوتے ہیں اور وہ ہم نہیں ہیں ہمارے غیر ہیں۔

ابن زیاد کو حیرت ہوئی کہ جس گردن کو وہ جھکانا چاہتا تھا وہ جھکنے کی بجائے اور تن گئی ہے۔ سر جھکائے بے جان جسموں کے سروں کو ان کے چاہے بغیر اونچا کر دیا۔ مجبوراً ابن زیاد نے پینترا بدلا۔

ابن زیاد: دیکھا! تمہارے بھائی کے ساتھ خدا نے کیا سلوک کیا؟

زینبؑ: ہم نے خدا کی طرف سے اچھائی اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ میرے بھائی نے اپنے یار و انصار کے ساتھ اس راستے کا انتخاب کیا جو خدا چاہتا تھا۔ انہوں نے شہادت کو گلے لگایا اور انتہائی افتخار کے ساتھ انہوں نے یہ نعمت حاصل کی ہے البتہ تجھ ظالم و ستمگر نے جو کیا ہے اس کی سزا پائے گا۔

ابن زیاد بالکل لا جواب ہو گیا اس جواب سے وہ سر کوب ہو گیا۔ شکست خوردہ شخص کے پاس آخری ہتھیار کیا ہے؟ گالی گلوچ!

ابن زیاد: تیرے باغی اور سرکش بھائی کے قتل سے خدا نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔

زینبؑ: ابن زیاد! تو نے ہمارے سربراہ کو شہید کر دیا۔ میرے کنبہ کے تمام مردوں کو مار ڈالا۔ تو نے ہماری شاخوں کو کاٹ ڈالا اور ہماری جڑوں کو اکھاڑ دیا۔ تیرے درد کی دوا یہی ہے تو یہی سہی۔

ابن زیاد: (یہ عورت) بڑی مسجع گفتگو کرتی ہے۔ اس کا باپ بھی ایسی ہی مسجع باتیں کرتا تھا۔(۱)

☆☆☆☆☆

---

(۱) طبری ج ۷ ص ۳۱۲

کاروان کی آخری منزل

شام، تیرہویں ہجری میں خالد بن ولید کی سربراہی میں مجاہدین اسلام کے ہاتھوں فتح ہوا۔ کچھ ہی مدت بعد حضرت عمر کی خلافت میں امیر معاویہ اس علاقے کا گورنر بن گیا اور اپنی موت تک وہ اسی طرح شام پر حکومت کرتا رہا۔

شام کے لوگوں نے اسلامی دستور اور تعلیمات کو خالد، معاویہ اور ان جیسے افراد کی رفتار و کردار کے آئینے میں دیکھا۔ انہیں سیرت پیغمبرؐ اور مہاجرین و انصار کے طرز عمل کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ۶۱ ہجری میں شام میں چند افراد تھے جن کی عمریں ساٹھ سال سے اوپر تھیں۔ ان کی ترجیح یہی تھی کہ وہ ایک گوشے میں بیٹھ جائیں اور جو کچھ ہو رہا ہے اس سے آنکھیں بند کرلیں۔ تعجب کی بات ہے کہ جب ۱۳۲ سال کے بعد خاندان عباسی کا حکمران اس شہر میں آیا تو لوگوں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے تھے کہ حضرت محمدؐ کے رشتہ دار اور قریبی بنی امیہ کے علاوہ کوئی اور بھی ہیں۔ یہاں تک کہ تم برسر اقتدار آگئے۔(۱)

اکثر مقتل کی کتب میں یہ لکھا ہے کہ اسیروں کے شہر دمشق میں داخلے کے موقع پر لوگوں نے شہر کو سجایا ہوا تھا تو یہ بعید نہیں اور اگر یزید نے اپنے دربار میں یہ اشعار پڑھے ہوں: ''کاش! آج میرے جنگ بدر میں مارے جانے والے بزرگ موجود ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے کس طرح محمدؐ کی اولاد سے ان کا انتقام لیا ہے'' تو یہ بھی بعید نہیں ہے کیونکہ اس دن یزید کی مجلس میں اس کے ارد گرد ایسے افراد بیٹھے تھے جنھوں نے اسلام اور پیغمبرؐ کو حکومت تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا ہوا تھا، نہ کہ قربت خدا کا ذریعہ۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ دونوں محفلیں ایک طرح کی ہیں اور باتیں بھی ایک جیسی ہیں۔

---

(۱) الصفوات النادرہ ص ۳۷۱

کوفے میں ابن زیاد خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا کہ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے اور عراقیوں کے ہاتھوں سے ان کی قوت چھین لی ہے۔ شام میں یزید افتخار کر رہا ہے کہ جنگ بدر میں اس کے مقتول بزرگوں کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ اگر یہ معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا تو کامیاب تھا لیکن زینب (س) نے اسے اس کی کامیابی کا پھل کھانے نہ دیا۔ وہ جسے اپنے لیے شیریں سمجھ رہا تھا زینب (س) نے اس کا مزہ حد سے زیادہ کڑوا کر دیا اور اس کے لیے تلخ بنا دیا۔ جناب زینبؑ نے اپنی مختصر گفتگو میں اہل مجلس کو سمجھا دیا کہ ان پر حکومت کرنے والا کون ہے اور کس کے نام پر حکومت کر رہا ہے اور رسیوں میں جکڑے اس کے سامنے کھڑے قیدی کون ہیں۔ اس واقعے کے ایک سو چالیس سال بعد پیدا ہونے والے احمد بن طاہر بن ابی طاہر کی کتاب "بلاغات النساء" سے ان کے کلام کو میں نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد والے مآخذ میں اس کے الفاظ میں اختلافات پائے جاتے ہیں:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوٓأَىٰ أَنْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ وَ كَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِءُونَ (روم:۱۰)

پس برائی کرنے والوں کا انجام برا (دوزخ) ہو گا کیونکہ انہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا ہے اور ان کا مذاق اڑایا ہے۔

أَظَنَنْتَ يا يَزِيدُ أَنَّهُ حِينَ أَخَذَ عَلَيْنا بِأَطْرافِ الْأَرْضِ وَ أَكْنافِ السَّماءِ فَأَصْبَحْنا نُساقُ كَما يُساقُ الأُسارىٰ، أَنَّ بِنا هَواناً عَلَى اللّٰهِ وَ بِكَ عَلَيْهِ كَرامَةً. فَشَمَخْتَ بِأَنْفِكَ وَنَظَرْتَ فِي عِطْفَيْكَ جَذْلانَ فَرِحاً. حِينَ رَأَيْتَ الدُّنْيا مُسْتَوْسِقَةً لَكَ. وَالْأُمُورَ مُتَّسِقَةً عَلَيْكَ

وَقَد أُمْهِلْتَ وَنُفِّسْتَ وَقَوْلُ اللّٰهِ تَبارَكَ وَتَعالَى وَلا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّما نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ إِنَّما نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدادُوا إِثْماً. وَلَهُمْ عَذابٌ مُهِينٌ.(آل عمران : ۱۷۸) أَمِنَ الْعَدْلِ يَابْنَ الطُّلَقاءِ تَخْدِيرُكَ نِسائَكَ وَإِمائَكَ وَسَوْقُكَ بَناتِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ قَدْ هَتَكْتَ سُتُورَهُنَّ وَاَصْحَلْتَ صَوْتَهُنَّ مُكْتَئِباتٍ تَخْدِي بِهِنَّ الْأَباعِرُ وَيَحْدُو بِهِنَّ الْأَعادِي.

مِنْ بَلَدٍ إِلَى بَلَدٍ. لا يُراقَبْنَ وَلا يُؤْوَيْنَ. يَتَشَوَّفُهُنَّ

یزید! کیا تو سمجھتا ہے کہ جب زمین و آسمان ہم پر تنگ کر دیا گئے ہیں اور ہمیں قیدی بنا کر شہر بہ شہر پھرایا گیا ہے، کیا خدا کے نزدیک ہم رسوا ہیں اور تو صاحب عزت و شرف ہے اور تو نے جو کچھ انجام دیا ہے وہ تیری سرداری کی علامت ہے؟ تو اپنے آپ پر فخر و مباہات کر رہا ہے اور اپنے کیے پر خوش ہو رہا ہے کہ دنیا تیری تابع ہے اور تیرے سب کام سیدھے اور منظم ہیں۔

ایسا نہیں ہے! یہ خوشی تیرے لیے غم ہے۔ یہ مہلت تیرے لیے مصیبت ہے اور یہ قول خدا ہے: وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ہم ان کو مہلت دیتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے لیے بہتر ہے۔ میں ان کو اس لیے مہلت دیتا ہوں تا کہ وہ اپنے گناہوں کو اور بڑھالیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اے آزاد شدہ غلاموں کی اولاد! (۱) کیا یہ انصاف ہے کہ تیری عورتیں اور کنیزیں تو پردے میں ہوں لیکن رسول زادیوں کو دربدر پھرایا جائے۔ ان کی حرمت کو پامال کیا گیا۔ ان کا دم گھٹتا ہے۔ انہیں بے پالان اونٹوں پر سوار کیا جائے اور شتربان ان کے دشمن ہوں۔

ایک شہر سے دوسرے شہر ایک بازار سے دوسرے بازار

الْقَرِيبُ وَالْبَعِيدُ. لَيْسَ مَعَهُنَّ وَلِيٌّ مِنْ رِجالِهِنَّ. وَكَيْفَ يُسْتَبْطَأُ فِي بُغْضِنا مَنْ يَنْظُرُ اِلَيْنا بِالشَّنَفِ وَالشَّنَآنِ وَالْاِحَنِ وَالْاَضْغانِ. اَتَقُول (لَيْتَ اَشْياخِي بِبَدْرٍ شَهِدُوا) غَيْرَ مُتَأَثِّمٍ وَلا مُسْتَعْظِمٍ؟ وَاَنْتَ تَنْكُتُ ثَنايا اَبِي عَبْدِاللّٰهِ.

انہیں پھرایا جائے۔ ان کا نہ کوئی ہمدرد ہے نہ ان کا کوئی مدد گار۔ نہ ان کے لیے کہیں جائے پناہ ہے اور نہ کوئی غمخوار۔ دور و نزدیک کی نظریں ان پر لگی ہیں لیکن کوئی بھی ان کی حالت پر رحم کھانے والا نہیں۔ سب ہمیں حقارت سے دیکھتے اور بغض و کینہ کی چنگاریاں لئے ہمیں گھورتے ہیں۔ تو خوش نہ ہو، ہماری دشمنی کو دل سے نہ نکال۔ تو پیغمبرؐ کے جگر گوشہ کے دانتوں پر چھڑی مار رہا ہے اور تو اپنے بدر میں مارے جانے والوں کو یاد کر رہا ہے کہ کاش وہ ہوتے اور تجھے شاباش دیتے۔ جو کچھ تو نے کیا اسے چھوٹا سمجھ رہا ہے اور اپنے آپ کو بے گناہ خیال کر رہا ہے۔

وَلِمَ لاتَكُونُ كَذٰلِكَ؟ وَقَدْ نَكَأْتَ الْقُرْحَةَ وَاسْتَأْصَلْتَ الشَّأْفَةَ بِاِهْراقِكَ دِماءَ ذُرِّيَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ نُجومِ الْاَرْضِ مِنْ آلِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ. وَلَتَرِدَنَّ عَلَى اللّٰهِ وَشِيكاً مَوْرِدَهُمْ وَلَتَوَدَّنَّ اَنَّكَ عَمِيتَ وَ بَكِمْتَ وَاَنَّكَ لَمْ تَقُلْ: (فَاسْتَهَلُّوا وَاَهَلُّوا فَرِحًا) اَللّٰهُمَّ خُذْ بِحَقِّنا، وَانْتَقِمْ لَنا مِمَّنْ ظَلَمَنا، وَاللّٰه ما فَرَيْتَ اِلاَّ فِي جِلْدِكَ، وَلا حَزَزْتَ اِلاَّ فِي لَحْمِكَ وَسَتَرِدُ عَلٰى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ بِرَغْمِكَ، وَعِتْرَتِهِ وَلُحْمَتِهِ فِي حَظيرَةِ الْقُدْسِ، يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ شَمْلَهُمْ مَلْمُومِينَ مِنَ الشَّعَثِ، وَهُوَ قَوْلُ اللّٰهِ تَبارَكَ وَتَعالٰى:
وَلا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْواتاً بَلْ اَحْياءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ. (آل عمران: ١٦٩)

خوشیوں کے شادیانے کیوں نہ بجائے، اس لیے کہ تو نے ہمارے دلوں کو جلا کے رکھ دیا ہے۔ تو نے جوانان عبدالمطلب کا خون بہایا۔ تو نے زمین کے ستاروں اور رسول رب العالمینؐ کے بیٹوں کا خون بہایا۔ تجھے جلد بارگاہ الٰہی میں ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس وقت تیری شدید خواہش ہو گی کہ کاش میں اندھا اور گونگا ہوتا اور یہ نہ کہتا: "کتنا اچھا ہوتا کہ آج اگر جنگ بدر میں مارے جانے والے میرے بزرگ ہوتے تو مجھے شاباش دیتے اور خوش ہوتے۔" خدایا! ہمارے حق کو لے۔ جنہوں نے ہم پر ظلم و ستم کیا انہیں کیفر کردار تک پہنچا۔ اے یزید! خدا کی قسم تو نے اپنی کھال ادھیڑی اور اپنا گوشت کاٹا ہے۔ تو بہت جلد رسول اللہؐ کے سامنے ناخواہ پیش کیا جائے گا۔ جب ان کے رشتے دار اور ان کی اولاد بہشت میں محو آرام ہو گی۔ خدا کی رحمتوں میں سرشار ہو گی۔ انہیں کسی قسم کا غم اور پریشانی نہ ہو گی۔ یہ خداوند متعال کا فرمان ہے:
جو راہ خدا میں قتل کر دیئے گئے ہیں انہیں مردہ خیال نہ کرو وہ اپنے پروردگار کے ہاں زندہ ہیں اور وہ اپنا رزق پاتے ہیں (آل عمر ۱۶۹)

وَسَيَعْلَمُ مَنْ بَوَّاَكَ وَمَكَّنَكَ مِنْ رِقابِ الْمُؤْمِنينَ - إذا كانَ الْحَكَمُ اللّٰهُ، وَالْخَصْمُ

جس نے تمہیں اس کرسی پر بٹھایا ہے اور مسلمانوں کی گردنوں میں تیری اطاعت کا طوق ڈالا ہے۔ وہ جلد جان لے گا کہ گھاٹے میں کون رہا۔ کون ذلیل و خوار ہے

---

(۱) جس دن رسول اکرمؐ نے مکہ فتح کیا تو قریش کے بڑے لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا: آپ لوگوں کا کیا خیال ہے کہ میں آپ کے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ انہوں نے کہا کہ جو ایک چچازاد بھائی کے لیے مناسب ہے۔ آپؐ نے فرمایا: جایئے آپ لوگ آزاد ہیں۔ اس دن سے قریش کے لوگ ابناء الطلقاء کے نام سے مشہور ہو گئے۔

مَحَمَّدٌ صَلَّى اللّهُ عَلَيْهِ ، وَجَوارِحَکَ شاهِدَةٌ عَلَيْکَ ، فَبِئْسَ لِلظّالِمينَ بَدَلاً - أَيُّكُمْ شَرٌّمَكاناً وَاَضْعَفُ جُنْداً ، مَعَ اَنّى وَاللّهِ يا عَدُوَّاللّهِ وَابْنَ عَدُوِّه،أَسْتَصغِرِ قَدْرَکَ ، وَأَسْتَعظِمُ تَقرِيْعِكَ، غَيْرَ اَنَّ الْعُيونَ عَبرى وَالصُّدُورَ حُرّىٰ ، وَما يَجْزِى ذٰلِکَ .أو يُغْنِى عَنَا: وَقَدْ قُتِلَ الْحُسَيْنُ عَلَيْهِ السَّلامُ ، وَحِزبُ الشَّيْطانِ يُقَرِّبُنا اِلَىٰ حِزْبِ اسُّفَهاءِ، لِيُعْطُوهُمْ أَموالَ اللّهِ عَلَى انْتِهاکَ مَحارِمِ اللّهِ ، فَهٰذِه الابدِى تنطف من دِمائنا، الاَفْواهُ تَتَحلَّبُ مِنْ لُحُومنا ، وَتِلْکَ الْجُثَثُ الزَّواكِى، يَعْتامُها عَسْلانُ الْفَلَواتِ ، فَلَئِنِ اتَّخَذْتَنا مَغْنَمًا لَتَتَّخِذَنَّ مَغرَماً ، حِينَ لاتَجِدُ إلاّ ما قَدَّمَتْ يَداکَ.

تَستَصْرِخُ بابْن مَرْجانَةَ ، وَيَسْتَصْرِخُ بِکَ ، وَنَتعاوٰى وَآتْباعُکَ عِنْدَ الْمِيزانِ، وَ قَدْ وَجَدْتَ أفْضَلَ زادِ زَوَّدَکَ مُعاوِيَةُ فَتْلُکَ ذُرِّيَّةَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّهُ عَلَيْهِ ، فَوَاللّٰهِ مَا اتَّقيتُ غَيْرَ اللّٰهِ ، وَلا شَكْوایَ اِلاّ اِلَى اللّٰهِ ، فَكِدْ كَيْدَکَ، وَاسْعَ سَعْيَکَ، وَناصِبْ جُهْدَکَ ، فَوَ اللّٰهِ لا يُرْحَضُ عَنْکَ ، عارُما أَتيْتَ اِلَيْنا اَبَدا،

وَالْحَمْدُ اللّٰهِ الَّذِى خَتَمَ بِالسَّعادَةِ وَالْمَغْفِرة لِسادات شُبّانِ الْجِنانِ ، فَاَوْجَبَ لَهُمُ الْجَنَّةَ.اَسْاَلُ اللّٰهَ اَنْ يَرْفَعَ لَهُمُ الدَّرَجاتَ وَاَنْ يُوجِبَ لَهُمُ الْمِزيدُ مِنْ فَضْلِهِ فَاَنَّهُ وَلِىٌّ قَدِيرٌ

اور کون بے یار و مدد گار ہے۔ اس دن مقدمہ پیش کرنے والے جناب محمد مصطفیٰ ہوں گے۔ فیصلہ کرنے والا خدا ہو گا اور گواہی دینے والے تیرے ہاتھ پاؤں ہوں گے۔

اے دشمن خدا اور دشمن خدا کے بیٹے! میں تجھے ذلیل سمجھتی ہوں۔ تیری دھمکیوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ لیکن کیا کروں میری آنکھیں برس رہی ہیں اور میرا سینہ غم سے پھٹا جا رہا ہے اور حسینؑ کی شہادت کا غم جو ہمارے سینوں میں موجزن ہے، اس کا کوئی مداوا نہیں۔ شیطان کے لشکر (۱) نے ہمیں بیوقوفوں (۲) کے مجمع میں بھیجا ہے تا کہ وہ انہیں خدا کی ہتک حرمت کے بدلے میں مال خدا بطور انعام عطا کرے۔ یہ ظلم و بربریت والے ہاتھ ہمارے خون سے آلودہ ہیں۔ یہ ہمارا گوشت ہے جو یہ دانتوں سے چبا رہے ہیں۔ یہ شہداء کے پاکیزہ جسم ہیں جنہیں جنگل کے بھیڑیئے نوچ رہے ہیں۔ اگر تم ہمیں مال غنیمت سمجھتے ہو تو ہم جرمانہ لیں گے، اس دن جب تمہارے برے اعمال کے سوا تمہارے پاس کچھ نہ ہو گا۔

تو مرجانہ کے بیٹے کو پکارے گا! اور وہ تجھ سے مدد چاہے گا۔ تو میزان کے کنارے اپنے یاروں کے ساتھ کھڑے ہو کر کتوں کی طرح بھونکے گا کہ سب سے بہتر زاد راہ جو معاویہ نے تیرے لیے تیار کیا وہ پیغمبر کے بیٹے کا قتل ہے، جو وہ تیری گردن میں ڈال گیا ہے۔ خدا کی قسم! خدا کے سوا مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے اور اس کے سوا کسی کے سامنے شکوہ نہیں کرتی۔ تیرے پاس جو مکر و حیلہ ہے اسے بروئے کار لے آ، اپنی تمام تر کوششوں کو آزما لے۔ خدا کی قسم! تیرے ماتھے سے یہ بد نما داغ نہ مٹ سکے گا۔

حمد و ستائش ہے اس پروردگار کی جس نے جوانان جنت کے سردار کا انجام خیر و سعادت اور مغفرت قرار دیا اور بہشت کو ان کے لیے واجب کر دیا۔ میری دعا ہے خداوند متعال ان کی قدر و منزلت میں اضافہ فرمائے اور اپنا بے حد فضل انہیں عطا فرمائے کہ وہی طاقتور مدد گار ہے۔(۳)

---

(۱) عبید اللہ بن زیاد اور اس کا لشکر مراد ہے۔
(۲) یزید اور اس کے لوگ مراد ہیں
(۳) بلاغات النساء ص ۲۱ - ۲۳ - جمہرۃ خطب العرب ج ۲ ص ۱۲۶ - ۱۲۹ - اعلام النساء ج ۲ ص ۹۵ - ۹۷

جو کچھ عراق میں ہوا آہستہ آہستہ دمشق کے لوگ اس کی حقیقت سے آگاہ ہو گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ امام حسین علیہ السلام کو یزید کے حکم سے کوفے کے سپاہیوں نے شہید کیا ہے۔ یہ کسی باغی کا قصہ نہ تھا۔ بلکہ رسول خداؐ کا نواسہ تھا اور جن عورتوں اور بچوں کو وہ قیدی بنا کر دمشق لے آئے ہیں یہ رسول اللہؐ کے گھر والے ہیں۔ یہ ان کا کنبہ ہے جن کی خلافت اور جانشینی کے نام پر یزید ان پر اور دیگر مسلمانوں پر حکومت کر رہا ہے۔ اس مجلس کی تمام روئیداد، اس میں چند افراد کی طرف سے یزید پر اعتراضات اور تنقید اور مسجد دمشق میں امام علی بن الحسین (علیہما السلام) کی تقریر، متاخر مآخذ اور متون میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ تمام واقعات اور بیانات اجمالی طور پر ایک حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہ خاندان رسالت سے جو سلوک کیا گیا اس پر لوگ ناخوش تھے۔ انہی واقعات کے بعد یزید نے اپنی عافیت اس میں دیکھی کہ قیدیوں کو مزید اپنے پاس نہ رکھے۔ پہلے پہل وہ ان سے اظہار ہمدردی اور کوشش کرنے لگا کہ جو کچھ کربلا میں ہوا ہے، اس کی تمام تر ذمہ داری ابن زیاد کی گردن پر ڈال دے۔ بہر حال قافلے نے واپس جانے کی اجازت چاہی اور مدینہ کی طرف چل پڑا۔ لیکن کب؟ کس مہینے اور کون سے سال؟ یہ بات صحیح طور پر واضح نہیں ہے۔

آیا یہ کاروان دمشق سے سیدھا مدینہ گیا؟ یا اپنا راستہ طولانی کر کے کربلا پہنچا تا کہ شہداء کے مزارات کی زیارت کر لے؟ کیا یزید نے اس کی موافقت کی؟ اور اگر یہ قافلہ کربلا تک واپس آیا ہو تو کیا یہ درست ہے کہ وہاں پر زیارت کے لیے آئے ہوئے صحابی حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے اس کی ملاقات ہوئی؟ کیا وہاں پر مجلس عزاداری اور ماتم داری برپا ہوئی؟ اور اگر ہوئی تو چند میلوں کے فاصلے پر موجود حاکم کوفہ نے کس طرح تحمل کیا کہ اس طرح کی مجلس اور عزاداری وہاں پر برپا ہو؟ بالفرض اگر یہ تمام واقعات وہاں رونما ہوئے ہوں تو مجلس کون سی تاریخ کو ہوئی؟ واقعہ کربلا کے چالیس دن بعد؟

مسلماً ایسی بات حقیقت کے منافی ہے۔ کیونکہ ایک عام مسافر کے کربلا سے کوفہ اور وہاں سے شام اور پھر کربلا پہنچنے کے لیے اس دور کے وسائل سفر کے ساتھ چالیس دن سے زیادہ کا عرصہ درکار ہے۔ چہ جائیکہ سفر قافلے کی صورت میں ہو اور یہ کہ ابن زیاد کی طرف سے قیدیوں کے بارے میں فرمان لینے کے لیے قاصد دمشق جائے اور وہاں سے جواب آئے اور پھر قافلہ دمشق کی طرف روانہ ہو۔ اگر ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھا جائے تو دو تین ماہ کا عرصہ درکار ہے اور یہ فرض بھی درست نہیں ہے کہ اسیروں کا قافلہ ۶۲ ہجری میں چہلم پر کربلا پہنچا ہو۔ کیونکہ اسیروں کا دمشق میں زیادہ مدت تک رہنا یزید کے حق میں بہتر نہ تھا (جیسا کہ پہلے بھی ہم نے لکھا ہے)۔ بہر حال ان واقعات میں ابہام موجود ہے اور درجہ اوّل کی روایات میں تحریف اور گڑ بڑ ہونے کی وجہ سے بطور نتیجہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح کربلا کی شیر دل خاتون

کی باقی زندگی کے حالات بھی واضح طور پر موجود نہیں ہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ شام سے واپسی کے بعد جناب زینب (س) زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہیں۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ وہ سنہ ۶۲ ہجری میں اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ کہاں پر؟ مدینہ ؟ دمشق؟ یا قاہرہ؟ سیرت نگاروں میں سے ہر ایک نے اپنے نظریے کی صداقت کے لیے دلیل یا دلائل پیش کئے ہیں۔

قاہرہ کے شہر میں سیدہ زینب (س) کے نام پر جو مزار قائم ہے وہاں دن رات خصوصاً جمعہ کی رات اور دن کو بہت زیادہ زائر آتے ہیں۔ اس طرح کی ایک اور زیارت گاہ" راس الحسینؑ" کے نام سے بنائی گئی ہے۔ گویا چوتھی صدی ہجری میں جب قاہرہ فاطمیوں کے قبضے میں آیا تو انہوں نے ان دو زیارت گاہوں کو بنا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

بہت سے مؤرخین اور ناقدین حدیث، دمشق کے مزار کی اصلیت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ مصنف نے اپنے سفر نامہ میں، جو چند ماہ پہلے یغما (۱) رسالے میں چھپ چکا ہے، قاہرہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ زیارت گاہیں ان گھروں کی مصداق ہیں جہاں اللہ کا نام بڑائی اور بزرگی کے ساتھ لیا جاتا ہے اور اہل بیتؑ سے محبت کرنے والے خلوص نیت کے ساتھ جن کے نام پر مزار بنائے گئے ہیں ان سے اپنی عقیدت وارادت کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے رسولؐ اور ان کے خاندان سے تجدید عہد کرتے ہیں۔

ام کلثوم

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کی جناب فاطمہ زہرا(س) سے دوسری بیٹی ام کلثوم صغریٰ ہیں۔ اس بارے میں مؤرخین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی حضرت فاطمہ زہرا(س) سے دو بیٹیاں تھیں۔ طبری جب حضرت علی کی اولاد شمار کرتا ہے تو لکھتا ہے: زینب کبری اور ام کلثوم۔(۱) جناب فاطمہ (س) کے علاوہ دوسری بیویوں سے حضرت امیر کی اولاد بیان کرتا ہے تو لکھتا ہے: زینب صغری اور ام کلثوم صغری۔ (۲) شیخ مفید نے حضرت امیرالمومنین (ع) کے لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد چھبیس بیان کی ہے۔ حسن، حسین، زینب کبری، اور زینب صغری، جن کی کنیت ام کلثوم ہے، ان کی والدہ فاطمہ زہرا ہیں۔(۳)

اختلاف صرف یہ ہے کہ ام کلثوم حضرت علیؑ کی دوسری بیٹی کا نام ہے یا اس کی کنیت ہے۔ بیشتر مؤرخین نے ان کا نام ام کلثوم لکھا ہے۔

ام کلثوم آٹھویں ہجری کے بعد پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی پہلے عون ابن جعفر سے ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد انہوں نے عون کے بھائی محمد بن ابی طالب سے نکاح کر لیا۔ زیادہ مؤرخین نے یہی لکھا ہے کہ محمد (۴) کے قتل کے بعد ام کلثوم نے کسی اور سے نکاح نہیں کیا۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جن کا نام زید رکھا گیا۔

جناب ام کلثوم نے کب وفات پائی؟ معلوم نہیں ہے۔ کتاب بلاغات النساء کے مصنف احمد

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۳۴۷

(۲) ایضا ص ۳۴۷۲ ۔ ۳۴۷۳

(۳) ارشاد ص ۳۵۵ ج ۱

(۴) دونوں طرح لکھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں: مقاتل الطالبین ص ۲۱۔ قاموس الرجال ج ۸ ص ۹۶۔

بن ابی طاہر طیفوری متوفی ۲۸۰ ہجری نے امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی ہے اور آنحضرت نے اپنے آباء سے نقل کی ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ ام کلثوم نے بازار کوفہ میں لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر ایسا فصیح وبلیغ خطبہ پڑھا گویا علی ابن ابی طالب آ گئے ہوں اور خطبہ دے رہے ہوں۔(۱) عمر رضا کحالہ نے اعلام النساء(۲) میں احمد بن ابی طاہر سے منقول یہ خطبہ لکھا ہے۔

لیکن اس روایت کو اس شکل میں قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے مؤرخین اور سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ام کلثوم اور ان کے بیٹے زید ایک ہی دن مدینے میں فوت ہوئے۔ زید کی موت کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک رات بنی جہم کے افراد کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ زید لڑائی میں صلح کرانے کے لیے داخل ہوئے لیکن رات کی تاریکی میں انہیں ضربت لگی اور وہ فوت ہو گئے۔

اور عبداللہ بن عامر سعید نے اس کے بارے میں کہا ہے:

اِنَّ عَدِيّاً لَيْلَةَ البَقِيعِ يُفَرِّجُوا عَن رَجُلٍ صَرِيعِ
مُقَابِلٍ، فِي الحَسَبِ الرَّفِيعِ اَدْرَكَهُ شُؤْمُ بَنِي مُطِيعِ

زید اور ان کی ماں اس طرح اکٹھے فوت ہوئے کہ لوگ نہ سمجھ سکے کہ کون پہلے مرا ہے۔ اسی وجہ سے دونوں میں سے کسی نے بھی دوسرے کی وراثت نہ پائی۔(۲)

ابن سعد نے لکھا ہے: زید اور اس کی ماں ام کلثوم دونوں ایک ہی دن فوت ہوئے اور عبداللہ بن عمر نے ان دونوں کی نماز جنازہ پڑھائی۔ دوسری روایت جو اس نے بنی ہاشم کے مولا (آزاد کردہ غلام) عمار بن ابی عمار سے نقل کی ہے۔(۳) اس میں ہے کہ سعید بن عاص جو اس وقت مدینہ کا حاکم تھا اس نے ان دونوں کی نماز جنازہ پڑھائی۔(۴)

سعید بن عاص نے سنہ ۴۱ ہجری سے لے کر سنہ ۵۶ ہجری تک مدینہ پر حکمرانی کی۔(۵) اگر مندرجہ بالا روایت کو درست تسلیم کریں تو ان کی وفات کوفے سے مدینہ واپسی پر سنہ ۴۲ ہجری سے

---

(۱) بلاغات النساء (۲) اعلام النساء ج ۴ ص ۲۵۹

(۲) نسب قریش ص ۲۵۲ ۔ ۲۵۳ ۔ ملاحظہ فرمائیں جمہرۃ انساب العرب ص ۳۸ و ۱۵۸

(۳) جو روایت شیخ طوسی نے ''خلاف'' ج ۱ ص ۲۶۶ میں عمار یاسر سے اس بارے میں بیان کی ہے ، اس میں ابو عمار کو ابن سعد کی طرح غلط لکھ دیا ہے ۔ جبکہ شیخ کی سند میں عمار بن عمار یاسر لکھا ہے ۔

(۴) طبقات ج ۸ ص ۳۴۰

(۵) معجم الانساب ج ۱ ص ۱۳۵

لے کر سنہ ۵۶ ہجری کے درمیان ہوئی ہے۔چونکہ ایک اور روایت میں آیا ہے حسن اور حسین (علیہما سلام) بھی جنازے کے ساتھ تھے۔ پس اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی وفات، حضرت امام حسن علیہ السلام کی شہادت، جو سنہ ۵۰ ہجری میں ہوئی، کے بعد نہیں ہوئی۔ پس ان کی وفات سنہ ۴۲ سے سنہ ۵۰ ہجری کے درمیان ہوئی ہے۔

فہرست مصادر و مآخذ

۱. الاخبار الموفقیّات: زبیربن بکار .ڈاکٹر سامی مکی العانی. مطبعة العانی. بغداد. ۱۹۷۲

۲. الارشاد فی مَعرفةِ حُجَجِ الله عَلَی العِباد: محمد بن نعمان المعروف شیخ مفید. به تصحیح حاج سیدهاشم رسولی محلاتی. مطبعه علمیه اسلامیه. تهران.

۳. الاستیعاب فی معرفةِ الاصحاب: ابن عبد البرّ یوسف بن عبد الله .حیدر آباد (هند). ۱۳۳۶ ھ ق.

۴. الاصابه فی تمییز الصحابه: ابن حجر عسقلانی ، مطبعته السعادة، قاهره، ۱۳۲۳ ھ ق.

۵. ألأصول ُمِنَ الْكافی: محمد بن یعقوب الکلینی، دار الکتب الا سلامیه، تهران، ۱۳۷۴ ھ ق

۶. ألأعْلام: خیر الدین زَرکلی، طبع دوم.

۷. أعلام النِّساء فی عالَمَیِ العَربِ وَ الا سْلام: عمر رضا کحّاله، مطبعة الهاشمیه، دمشق ۱۳۷۹ ھ ق.

۸. إعلامُ الْوَرَی باعلامِ الْهُدی: فضل بن حسن طبرسی، مقدمه سید محمد مهدی خرسان، دارالکتب الاسلامیه، ۱۹۷۰

۹. ألأغانی: ابو الفرج اصفهانی، دارالکتب المصر یه، قاهره.

۱۰. أقرَبُ الْموارِد فی فُصحِ الْعَربیِّه وَالشَّوارِد: سعید الخوری.

۱۱. أمالی: محمد بن حسن طوسی، منشورات المکتبه الاهیله، طبع افست قم، منشورات داوری.

۱۲. اَنساب الاشراف: احمد بن یحی المعروف بلاذری، محمد حمید الله دارالمعارف ۱۹۵۹.

۱۳. انقلاب بزرگ. ترجمه جلد اول الفتنة الکبری. سید جعفری شهیدی. موسسه مطبوعاتی علی اکبرعلمی، تهران ۱۳۳۶ ھ ش۔

۱۴. بلاغاتُ النِّساء: ابو الفضل احمد بن ابی طاهر، طبع افست، مکتبه بصیرتی، قم و طبع بیروت.

۱۵. بلوغُ الأرب فی معرفةِ ألاحوالِ الْعرب: سید محمود شکری آلوسی، مطبعة رحمانیه،

قاهره ۱۳۴۳ھ ق.

۱۶. پس از پنجاه سال: سید جعفر شهیدی، دفتر نشر فرهنگ اسلامی، تهران ۱۳۵۹ھ ش.

۱۷. تاریخُ الأدبِ العربی: دکتر شوکی ضیف، دارالمعارف قاهره.

۱۸. تاریخُ التَّمدُّنِ الا سلامی: جرجی زیدان، مطبعة الهلال، قاهره ۱۹۰۲.

۱۹. تاریخُ الرُّسُلِ وَالْملوک: محمد بن جریر طبری، طبع بریل

۲۰. تاریخُ الْیَعقوبی: احمد ابی یعقوب کاتب، مطبعته الغری، نجف ۱۳۵۸ھ ق.

۲۱. اَلْتِّبیان: محمد بن حسن طوسی، مصحح احمد حبیب عاملی، نجف.

۲۲. تحلیلی از تاریخ اسلام: سید جعفر شهیدی، نهضت زنان مسلمان، تهران.

۲۳. جَمْهَرةُ خُطَبِ الْعَرب: احمد ذکی صفوت مصطفی البالی الحلبی، قاهره ۱۳۵۳ھ ش.

۲۴. حبیبُ السِّیر فی اخبار افراد البشر: غیاث الدین خوند میر تصحیح دکتردبیر سیاقی، کتابفروشی خیام، تهران ۱۳۳۳ھ ش.

۲۵. حَدیْقَةُ الحقیقه وَ شریعةُ الطَّریقه: مجدود بن آدم سنائی، مدرس رضوی، دانشگاه تهران.

۲۶. حِلْیَةُ الأولیاءِ وَ طبقاتُ الاصفیاء: ابو نعیم اصفهانی، مکتبة الخانجی، قاهره ۱۳۵۲ھ ش.

۲۷. دیوان ابن حسام خوسفی: طبع سنگی، تهران.

۲۸. دیوان ابن یمین فریو مدی: حسین علی باستانی راد، کتابخانه سنائی، تهران.

۲۹. دیوان اثیر اخسیکتی: رکن الدین همایون فرخ، طبع زهره ۱۳۳۷ھ ش.

۳۰. دیوان اسماعیل حمیری: (سید...) شاکر هادی شاکر، مکتبه الحیاة، بیروت.

۳۱. دیوان خواجوی کرمانی: احمد سهیلی خوانساری، کتابفروشی بارانی.

۳۲. دیوان دِعْبِل: عبد الصاحب عمران الدجیلی، دار لکتب اللبنانی، بیروت ۱۹۷۲.

۳۳. دیوان قوامی رازی: شرف الشعراء .بدرالدین، میر جلال محدث، ۱۳۷۴ھ ق.

۳۴. دیوان مُتنبّی: عبدالرحمن البرقوقی، مکتبه التجاریة، قاهره.

۳۵. دیوان مِهیار دیلمی: دارالکتب المصریه، ۱۳۴۴ھ.

۳۶. دیوان ناصر خسرو: سید نصر الله تقوی، و نیز طبع مینوی دکتر محقق.

۳۷. رَوْضَةُ الو اعظین: محمد قتّال، سید محمد مهدی خرسان، منشورات الّرضی.

۳۸. سیرة النّبی: ابو محمد الملک بن هشام، محمد محی الدین عبدالحمید، مطبعه حجازی، قاهره ۱۳۵۶ھ ق.

۳۹. سُنَن: احمد بن شعیب نسائی، دارالفکر، بیروت ۱۳۴۸ھ ش.

۴۰. سَفینةُ البحار: حاج شیخ عباس قمی، انتشارات سنائی.

۴۱. شرح نَهْجُ البلاغه: ابن ابی الحدید، تصحیح محمد ابو الفضل ابراهیم، دار احیاء الکتب العربیه ۱۳۸۵ھ ق.

۴۲. اَلْشعر والشُّعراء: ابن قتیبه، تصحیح احمد محمد شاکر.

۴۳. الصحیح: محمد بن اسماعیل بخاری، محمد علی صبیح و اولاده، قاهره.

۴۴. اَلصَّوَاعِقُ الْمُحْرِقه: ابن حجر هیتمی، مصحح عبدالوهاب عبداللطیف، مکتبه القاهره

۱۳۸۵ ھ ق
۴۵. اَلطَّبقاتُ الکبیر: محمد بن سعد کاتب واقدمی، زاخاؤ، لیدن ۱۳۳۲ ھ ق
۴۶. عِلَلُ الشّرائع: صدوق، محمد بن علی، مکتبه الحیدریه، نجف ۱۳۸۵ ھ ق
۴۷. اَلعِقدُ الفَرید: احمد بن محمد بن عبدربّه، محمد سعید العریان.
۴۸. عُیونُ الأخبار: مکتبه التجاریة، قاهره ۱۳۷۲ ھ ق.
۴۹. اَلغدیر: الشیخ عبد الحسین احمد امینی، دارالکتب العربی، قاهره.
۵۰. فتوحُ البلدان: احمد بن یحی بلاذری، صلاح الدین منجّد، مکتبة النهضه، قاهره.
۵۱. قاموسُ الرجال: حاج شیخ محمد تقی شوشتری، مرکز نشر کتاب، تهران.
۵۲. الکامل فی التاریخ: ابن ثیر عزالدین علی بن ابی الکرم، دار صادربیروت ۱۳۸۵ ھ ق.
۵۳. کَشفُ الغّمه: علی بن عیسی اربلی،مصحح حاج سید هاشم رسولی، تبریز.
۵۴. کَنْزُ الْعُمّال فِی سنَنِ الأ قوال والافعال: علاء الدین علی، حیدآباد (هند) ۱۳۱۲ ھ ق
۵۵. لِسانُ الْعَرب: ابن منظور محمد بن مکرم، دار صادر، بیروت ۱۳۷۴ ھ ق.
۵۶. مَجْمَعُ الأ مثال: میدانی، احمد بن محمد تهران، ۱۲۹۰ ھ ق.
۵۷. مَجْمَعُ الْبیان فی تَفسیرِ الْقرآن: فضل بن حسن طبرسی، صیدا، لبنان ۱۳۳۳ ھ ق.
۵۸. اَلْمُسنَد: احمد بن حنبل، احمد محمد شاکر، دار المعارف.
۵۹. اَلْمعارف: ابن قتیبه، ثروت عکاشه دار الکتب ۱۹۶۰.
۶۰. معجم الاد باء: یاقوت بن عبد اللّٰه‌حموی، مکتبة القراء ة والصحافة الادبیه، دکتر احمد فریدرفاعی،مصر قاهره.
۶۱. معجم انساب العرب: ابن حزم اندلسی، تحقیق عبد السلام هارون.
۶۲. اَلْمَغازی: محمدبن عمر بن واقد: آکسفورڈ ۱۹۶۶.
۶۳. مَقاتِلُ الطّالبین: ابو الفرج اصفهانی، سید احمد صقر، دار المعرفة بیروت لبنان.
۶۴. مَقْتَلُ الْحسین: موفق بن احمد خوارزمی، مکتبة المفید، قم ۱۳۶۷ ھ ق.
۶۵. اَلمِللُ و النِّحَل: محمد بن عبدالکریم شهر ستانی احمد فهمی، مکتبة الحسین قاهره ۱۳۶۸ ھ ق.
۶۶. مناقب آل ابی طالب: محمد بن علی شهر آشوب، قم انتشارات علامه
۶۷. منتهی الآمال: حاج شیخ عباس قمی، علمیه اسلامیة تهران ۱۳۲۱ ھ ق.
۶۸. نسب قریش: مصعب بن عبد اللّٰه بن مصعب زبیری، دارالمعارف، سلسله ذخائر العرب شماره ۱۱.
۶۹. نَهْجُ البلاغه: مصحح عبدالعزیز سیِّدالاهل مکتبة الاندلس، بیروت ۱۳۷۴ھ.
۷۰. وَفیاتُ الأعیان وَ أنْباء أبناء اِلزَّ مان: احمد بن محمد بن خلّکان، محمد محی الدین عبد الحمید،مکتبة النهضة المصر یه قاهره ۱۳۶۷ ھ ق.
۷۱. الهاشِمیّات: کمیت بن زیاد اسدی، تصحیح محمد محمود رافعی، شرکة التمدن الصّنا عیه قاهره.
۷۲. اَلْهفواتُ النّادِرَه: عرس النعمه محمد بن هلال الصّابی، دکتر صالح اشتر، ۱۳۸۲ ھ ق.

حسب ذیل کتابیں بھی مؤلف کے زیر نظر رہی ہیں

۱. احوال حضرت فاطمه (ع) (نا سخ التواریخ : لسان الملک سپهر محمد تقی، کتابفروشی اسلامیه، تهران ۱۳۵۴ ھ ق.

۲. بحارالانوار: جلد اوّل احوال فاطمه زهرا(ع) : اسلامیه تهران ۱۳۹۵ ھ ق

۳. زندگانی حضرت فاطمه (ع): (ترجمۂ بیت الاحزان) سید محمود موسوی زرندی اسلامیه، تهران ۱۳۳۶ ھ ق

۴. زندگانی صدیقه کبریٰ (ع): دستغیب، انتشارات کاوه.

۵. زندگی نامه خدیجه کبری و فاطمه زهرا(ع) : ترجمه دکتر علی شیخ الاسلامی.

۶. فاطمه (س): نصیر الدین امیر صادقی، حاج محمد علی علمی، تهران ۱۳۴۷ ھ ش

۷. فاطمةُ الزَّهراء أمُّ أبيها: فاضل الحسيني الميلاني، دارالتعارف للمطبوعات، بيروت ۱۳۹۸ ھ ق

۸. فاطمةُ الزَّهراء مِنَ الْمَهْدِالِى اللَّحْد: سيد محمد كاظم قلويني، دارصادر بيروت ۱۳۹۷ ھ ق

۹. فاطمةُ الزَّهراء وَ الفاطِميون: عباس محمود عقاد، دار الكتب العربي، بيروت ۱۹۶۷.

۱۰. فاطمه دختر محمد(ص): سید جعفر شهیدی، کتابفروشی حافظ. سرچشمه. ۱۳۳۰ ھ ش

۱۱. فاطمۂ زهراء: حاج سید هاشم رسولی محلاتی. علمیه اسلامیه. ۱۳۵۷ ھ ش

۱۲. فاطمۂ زهراء: ترجمه علی اکبر صادقی. امیر کبیر. ۱۳۶۰ ھ ق.

۱۳. فاطمۂ زهرا: بانوی نمونۂ اسلام، ابراهیم امینی، دار التبلیغ قم.

۱۴. فاطمه فاطمه است: ڈاکٹر علی شریعتی. حسینیه ارشاد، تهران.

☆☆☆☆☆

فہرست مضامین

پیش لفظ

ص ۱۔ ۴

موضوع کتاب۔ سُنّتِ رسولؐ کے محافظ۔ تبدیلی و تجدید کے طالب۔ سنت شکنی کا انجام۔ تاریخی اسناد و مدارک کا جائزہ۔

ص ۵۔ ۱۲

صحرائے عرب، صحرانشین اور اُس کی زندگی۔ بقائے زندگی کی جنگ۔ صحرانشینوں کی لڑائیاں۔ بیٹی کی پیدائش اور صحرانشین۔ ظہور اسلام اور صحرانشین کی زندگی میں تبدیلی۔ بیٹیوں کے بارے میں حضور پاکؐ کے ارشادات۔

ص ۱۳۔ ۲۲

حضرت خدیجہ: ان کا نسب۔ ان کی زندگی۔ ان کے والد۔ اُن کا خاندان۔ حضرت محمدؐ کے ساتھ ان کی شادی۔ ان کے فرزند۔ حضرت فاطمہ (س) کی ولادت باسعادت۔ دختر پیغمبرؐ کی تاریخ ولادت سے متعلق اسناد کا تجزیہ و تحلیل۔

ص ۲۳۔ ۳۱

حضرت فاطمہ (س) کا نام اور القاب۔ حضرت فاطمہ کی تعلیم و تربیت۔ بچپن کی عبادت و ریاضت۔ حضرت خدیجہ اور ابو طالب کی وفات۔ پیغمبر خدا کی نظر میں حضرت فاطمہ (س) کا مقام و احترام۔

ص ۳۲۔ ۵۰

حضرت فاطمہ (س) سے شادی کے خواستگار۔ بعض مستشرقین کی تحریروں کا جائزہ۔ اسلام اور اسلامی شخصیات کے بارے میں مستشرقین کی کُتب کے قارئین کے لئے تذکرہ۔ حضرت علیؑ کی حضرت فاطمہؑ سے خواستگاری۔ رسول خداؐ کی بیٹی کا مہر۔ حضرت فاطمہؑ کا جہیز۔ خطبہء نکاح۔ دعوت ولیمہ۔ حضرت فاطمہؑ کی رخصتی۔ ابن شہر آشوب کی تحریر کا تجزیہ۔

ص ۵۱۔ ۵۸

فاطمہ (س) شوہر کے گھر میں۔ اسماء بنتِ عُمیس کی شادی میں شرکت پر تبصرہ۔ علی (ع) و فاطمہ (س) کا حارثہ بن نعمان کے گھر منتقل ہونا۔ یہودی عبداللہ بن اُبی اور پیغمبرؐ خدا۔ علیؑ و فاطمہ (س) کا ایثار۔

ص ۶۲۔ ۶۹

ولادت امام حسن (ع)۔ جنگ اُحد اور اُس کے نقصانات امام حسینؑ کی ولادت۔ حضرت فاطمہ (س) کا زُھد و ریاضت۔ علی (ع) کے گھر پیغمبرؐ اور فاطمۃ الزھرا (س) کی

ملاقات۔سلمان فارسی اور دختر پیغمبرؐ کی چادر۔ گردن بند کا فروخت کر دینا۔ملازم کی بجائے حمدِ خدا۔ پیغمبر خداؐ کا حضرت زھرا(س) کی تعریف کرنا۔
ص ۷۰ ۔ ۷۴
کیا میاں بیوی میں کبھی رنجش پیدا ہوئی؟ابو جہل کی بیٹی جویریہ کا قصہ۔ مسور بن مخرمہ اور اس کی روایت کا جائزہ۔
ص ۷۵ ۔ ۷۶
حضرت زھرا(س) کی عبادت تسبیح اور دعا کا ذکر۔
ص ۷۷ ۔ ۷۹
جنگ خندق ۔ صُلح حدیبیہ ۔فدک۔قریش کی جانب سے صلح نامہ حدیبیہ کی خلاف ورزی۔ ابو سفیان کا دختر پیغمبرؐ سے سفارش کے لئے کہنا۔
ص ۸۰ ۔ ۸۱
فتح مکہ۔سنۃ الوفود۔حجۃ الوداع ۔ احکام حج کی تعلیم ۔ واقعہ غدیر۔ پیغمبرؐ خدا کا حضرت زھراء (س) کو اپنی وفات سے متعلق خبر دینا اور یہ کہ وہ ان سے جلد آ ملیں گی۔ رسول خداؐ کا مریض ہونا اور مسجد میں جا کر وعظ و نصیحت کرنا۔رسول خداؐ بستر بیماری پر۔
ص ۸۲ ۔ ۸۵
حجۃ الوداع ۔ پیغمبر اکرم (ص) کی وصیت۔ پیغمبر اکرم (ص) کا مریض ہونا۔
ص ۸۶ ۔ ۸۷
محبوب خداؐ، خدا سے جا ملے ۔پیغمبر اکرمؐ کی وفات پر حضرت عمر کا اعتراض اور حضرت ابو بکر کا جواب ۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں اجتماع۔
ص ۸۸ ۔ ۹۲
پیغمبرؐ کے گھر کا محاصرہ۔ اھل سقیفہ کا بیعت پر اصرار
ص ۹۳ ۔ ۹۸
حکومت کا فدک پر قبضہ۔ فدک، مروان کے حوالے۔ فدک اور عمر بن عبدالعزیز۔ مامون کا فدک کو فرزندان فاطمہ کے حوالے کر دینا۔
ص ۹۹ ۔ ۱۱۰
مسجد مرکز عدل وانصاف۔زھرا(س) کا مجمع عام میں شکایت کرنا۔سند خطبہ حضرت زھرا(س)۔ انداز خطبہ کا تجزیہ اور معترضین کا جواب۔ خطبہ کا ترجمہ۔
ص ۱۱۱ ۔ ۱۱۸
حضرت ابو بکر کا بنت رسولؐ کو جواب۔بنت رسولؐ کا خلیفہ سے احتجاج کرنا۔بنت رسولؐ کی علیؑ سے گفتگو ۔ ایک جائزہ۔
ص ۱۱۹ ۔ ۱۲۳
بنت رسولؐ بستر بیماری پر۔ کیا حضرت فاطمہ (س) پیغمبر اکرمؐ کی وفات سے قبل بیمار تھیں ؟ قریش کی خود خواہی ۔
ص ۱۲۴ ۔ ۱۲۸
انصار کی خواتین بنت رسولؐ کے گھر میں۔حضرت زھرا (س) کی عبرت آمیز باتیں۔ مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنا۔

ص ۱۲۹ ـ ۱۳۱
حضرت زھرا(س) کی زندگی کے آخری ایام۔ اسماء بنت عمیس کو حضرت زھرا(س) کی وصیت۔
ص ۱۳۲ ـ ۱۳۵
حضرت زھرا(س) کی تدفین۔ قبر زھرا(س) پر علیؑ کا درد دل بیان کرنا۔
ص ۱۳۶ ـ ۱۳۸
حضرت زھرا(س) کی قبر کہاں ہے؟ان کی قبر کیوں پوشیدہ رکھی گئی؟
ص ۱۳۹ ـ ۱۵۶
عبرت برائے تاریخ۔ قحطانی اور عدنانی عرب۔ قبل از اسلام ان کی باہمی دشمنیاں۔ ظہور اسلام کے بعد عدنانی اور قحطانی عربوں کی صورت حال۔ قریش کا حکومت اسلامی پر قبضہ۔ بنی امیہ اور اسلامی قوانین واحکامات کی پامالی۔ بدعتوں کا راج اور مسلمانوں کی پشیمانی۔ دینداروں کا مجتمع ہونا۔ زھرا(س) رمز مظلومیت۔
ص ۱۵۷ ـ ۱۸۰
شیعہ شعرائے عرب کے اشعار سے انتخاب۔ ابوالمستہل، کمیت بن زیاد اسدی سید اسماعیل حمیری۔ منصور نمری۔ دعبل۔ سلامۃ الموصلی۔ صنوبری۔ ناشئ صغیر۔ ابن حماد۔ مہیار دیلمی۔ ابن العودی۔ علاء الدین حلی۔
ص ۱۸۱ ـ ۲۰۰
فارسی شاعری میں حضرت فاطمہ (س) کا ذکر۔ ناصر خسرو۔ سنائی۔ قوامی رازی۔ اثیر اخسیکتی۔ خواجوی کرمانی۔ ابن یمین۔ ابن حسام۔
ص ۲۰۱ ـ ۲۱۳
اولادِ حضرت فاطمہ (سلام اللہ علیہا)۔ حضرت زینبؑ (ولادت، ازدواج، اولاد)۔ حضرت علیؑ کے ہمراہ عراق میں۔ مدینہ واپسی۔ بھائی کے ہمراہ کربلا میں۔ بازار کوفہ میں خطبہ۔ ابن زیاد کے دربار میں۔
ص ۲۱۴ ـ ۲۲۲
کاروان کی آخری منزل۔ یزید کے دربار میں۔ حضرت زینب (س) کی وفات۔ ام کلثوم۔
ص ۲۲۳ ـ ۲۲۶
فہرست مآخذ۔

☆☆☆☆

☆ کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ "مکتب تشیع" کیا ہے؟

☆ کیا آپ اسلامی تاریخ کے تناظر میں "تشیع" کا کردار جاننا چاہتے ہیں؟

☆ کیا آپ ائمہ اہل بیت علیہم الصلوٰۃ والسلام کی خوں رنگ جدوجہد کی تاریخ پڑھنا چاہتے ہیں؟

☆ کیا آپ وارثان خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی اور روح پرور تعلیمات پڑھنا چاہتے ہیں؟

آیئے ہماری مطبوعات کا مطالعہ کیجئے۔